بسم اللہ الرحمن الرحیم

تخلیق آدم

اور

نظریۂ ارتقا

قرآنی حقائق و معارف اور جدید سائنسی انکشافات کا ایک جائزہ

مولانا محمد شہاب الدّین ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام

۱-کے-۳، ناظم آباد مینشن ○ ناظم آباد ۱، کراچی

تخلیقِ آدم اور نظریۂ ارتقا

قرآنی حقائق و معارف اور جدید سائنسی اکتشافات کا ایک جائزہ

از

مولانا محمد شہاب الدین ندوی

ناشر

فضیل ربی ندوی

مجلسِ نشریاتِ اسلام ۱/کے-۳- ناظم آباد مینشن نزد بوفے خانہ، ناظم آباد ۵ کراچی نمبر ۷۴۶۰۰

نام کتاب ——— تخلیقِ آدم اور نظریۂ ارتقا
مصنف ——— مولانا محمد شہاب الدّین ندوی
تعداد ——— ایک ہزار
کتابت ——— محمد بشیر الدین بنگلوری
مطبوعہ ——— شکیل پرنٹنگ پریس، کراچی

طابع وناشر
فضلِ ربّی ندوی

مجلسِ نشریاتِ اسلام
۱۔ کے۔ ۳ ناظم آباد ۱ ، کراچی ۷۴۶۰۰

(بہ تعاون واشتراک : فرقانیہ اکیڈمی بنگلور انڈیا)

انتساب

اُن طالبانِ حق کے نام جو قرآنِ مجید کی حکمت و دانائی، اور اس کی اعجازی ہدایت و رہنمائی کا سچا جذبہ اور تڑپ رکھتے ہیں۔ موجودہ دور میں قرآنِ مجید ہی وہ واحد صحیفۂ ربّانی ہے جو زندگی کے ہر میدان میں انسان کا صحیح رہنما بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، اور اس کو ابدی سعادتوں سے مالا مال کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ محض نظریات و مفروضات اور تخیّلات کا ایک تانا ہے، جس میں سچ اور جھوٹ، حق و باطل اور اغراض و خواہشات کی آمیزش کر کے نقوشِ راہ کو دُھندلا کرنے اور نشاناتِ حق کو مٹانے کی کوشش ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ آج عالمی لٹریچر میں قرآنِ عظیم ہی وہ واحد صحیفہ ہے جو بے عیب و بے آمیز ہونے کے باعث زندگی کے ہر میدان میں انسان کی صحیح صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ جس طرح قانون و شریعت کے میدان میں انسان کی سچّی رہنمائی کر سکتا ہے، اسی طرح وہ عقائد و کلام اور فکر و فلسفے کے باب میں بھی پیش آمدہ تمام جدید ترین مسائل میں اُس کی پُوری پُوری اور تشفی بخش رہبری کر سکتا اور نوعِ انسانی کو مینارۂ نُور دکھا سکتا ہے۔ اور یہ اس کتابِ عظیم کا وہ حیران کن پہلو ہے جس کے ملاحظہ کے بعد اُس کے من جانب اللہ ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

هٰذَا كِتَابُنَا يَنطِقُ عَلَيْكُم بِالْحَقِّ : یہ ہماری کتاب ہے جو تم کو (ہر مسئلے میں) صحیح بات بتا رہی ہے۔ (جاثیہ : ۲۹)

قصۂ آدم اور ایک خدائی پیشین گوئی

سورۂ ص میں جہاں پر حضرت آدم علیہ السّلام کا قصّہ بیان کیا گیا ہے وہیں بطور ایک ربّانی پیشین گوئی یہ بھی مرقوم ہے کہ اس قصّہ کی صداقت ایک تنبیہہ کے طور پر نوعِ انسانی کے سامنے ضرور ظاہر ہو کر رہے گی :

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ : یہ تو سارے جہاں کے لئے ایک درس ہے ۔ اور تم اس کی خبر (صداقت) کچھ عرصے بعد ضرور جان لو گے ۔ (ص : ۸۷ - ۸۸)

تعارف

موجودہ دور میں نظریۂ ارتقا Theory of Evolution نے خُدا کی جگہ لے لی ہے، جو تمامتر ایک مادہ پرستانہ نظریہ ہے۔ اور یہ نظریہ آج جدید تعلیم یافتہ افراد کے ذہنوں پر چھایا ہُوا ہے۔ کیونکہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے نصابِ تعلیم کے مطابق یہ نظریہ ایک حقیقت کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ حالانکہ سائنسی اعتبار سے یہ نہ صرف ایک غیر ثابت شدہ نظریہ ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک مفروضے سے زیادہ کبھی نہیں رہی ہے۔ مگر جو مادہ پرست سائنسداں خُدا اور مذہب کو نہیں مانتے وہ اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہُوئے ہیں۔ حالانکہ خود سائنس دانوں کی ایک مُعتدبہ تعداد اس کو غلط اور باطل سمجھتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ موجودہ دور کا سب سے بڑا مغالطہ اور فریب ہے کہ ایک ایسی چیز کو جو ثابت شدہ نہیں ہے محض پروپگنڈے کے زور پر نہ صرف زندہ رکھا جا رہا ہے بلکہ اسے طلبہ کے ذہنوں پر زبردستی مسلّط کر کے انہیں خُدا سے بیزار اور برگشتہ بھی کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس سحرِ سامری اور اُس کے مکر و فریب سے موجودہ دور کو بچانا اور خُدائی ہدایت و رہنمائی کو صحیح دلائل کی روشنی میں عالمِ انسانی پر آشکارا کرنا ضروری ہو گیا ہے، تاکہ دُنیائے انسانیت کو اس باطل نظریہ اور اُس کی زہرناکی سے نجات مل سکے۔ موجودہ دور میں جتنے بھی مادہ پرستانہ نظریے اور گمراہ کُن فلسفے موجود ہیں اُن میں نظریۂ ارتقا کا نمبر سب سے پہلا ہے۔ بلکہ یہ نظریہ حقیقتاً تمام ملحدانہ نظریات کی ماں ہے جس کی کوکھ سے بے شمار الحادی فلسفوں نے جنم لیا ہے۔ لہٰذا علمی و عقلی دلائل کی روشنی میں اس کا رد و ابطال موجودہ دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اور اس کتاب میں یہی خدمت علمی و عقلی اور دینی و شرعی دونوں حیثیتوں سے انجام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

مؤلف

نظریۂ ارتقا کی عالمگیری

واقعہ یہ ہے کہ آج نظریۂ ارتقا اور اُس سے متعلق مسائل نے ایک عالمگیر شکل اختیار کر لی ہے۔ اور یہ مسائل اس وقت پوری نوعِ انسانی کے ذہنوں پر چھائے ہُوئے ہیں۔ ہر طرف سوال و جواب کا بازار گرم ہے۔ دعووں اور جوابی دعووں کی بھرمار ہے۔ نزاعی بحثوں کا ایک انبارِ عظیم وجود میں آچکا ہے۔ نصابی کتابیں ان مسائل سے بھری ہُوئی ہیں جو نئی نسلوں کے ذہنوں پر اثرانداز ہو رہی ہیں۔ اور اس نظریہ کی چھاپ اس وقت دُنیا کے ہر علم و فن پر نمایاں نظر آرہی ہے۔ لہٰذا یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ اس مسئلے نے علمی حلقوں کے سامنے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے۔ اور اس اعتبار سے پوری نوعِ انسانی اس وقت حیران و سرگرداں ایک دوراہے پر کھڑی نظر آرہی ہے۔ لہٰذا اس مسئلے میں مذہب کی طرف سے رہنمائی نہ ملنے کی صُورت میں الحاد و لادینیت کو مزید تقویت ملے گی اور دین و مذہب کو ہمیشہ کے لئے ناکام قرار دے دیا جائے گا۔ (کتاب ہذا سے ایک اقتباس)

مُصنّف ایک نظر میں

مولانا محمد شہاب الدین ندوی کا شمار اس وقت برِصغیر کے معروف مصنفین میں ہوتا ہے۔ موصوف اسلامیات کے ایک بلند پایہ محقق کے روپ میں ظاہر ہو کر علمی دنیا سے زبردست خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ جدید علمی و کلامی مسائل پر لکھنے کا موصوف کو خاصا شغف اور سلیقہ ہے۔ سب سے پہلے ہفت روزہ "صدق جدید" لکھنؤ میں خلائی عہد اور اُس کے پیدا کردہ فکری مسائل پر ایک نئے انداز میں لکھنا اور قرآنی حقائق کو منظرِ عام پر لانا شروع کیا تو اُس کے مدیرِ شہیر مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم نے موصوف کو مستقبل کا "شہابِ ثاقب" قرار دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے بلند پایہ تحقیقات کے باعث آج واقعی اس لقب کے مستحق نظر آتے ہیں۔ موصوف نے جدید علوم و فنون کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی حقانیت اور برتری کو ثابت کرنے کی راہ میں جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اُنہیں مستقبل کا مؤرخ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

موصوف ۱۲ر نومبر ۱۹۳۱ء میں شہر بنگلور کے مضافات میں بمقام چک بالاپور پیدا ہوئے اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ شروع ہی سے قرآن اور جدید علوم و مسائل محبوب موضوع رہا۔ بعدِ فراغت اس موضوع پر تحقیقی مطالعے میں لگ گئے اور ۱۹۷۰ء میں بنگلور میں فرقانیہ اکیڈمی کے نام سے ایک تحقیقی ادارے کی بنیاد ڈالی۔ پھر ہندستان و پاکستان کے صفِ اول کے رسائل میں جدید مسائل و موضوعات پر لکھنا شروع کیا اور "تعمیرِ فکر" کے نام سے خود اپنا ایک ماہنامہ بھی جاری کیا جو ڈھائی سال تک علم کی ضیاپاشیاں کرنے کے بعد ملت کی ناقدری کا شکار ہو گیا۔ موصوف نے اکیڈمی کے ماتحت ایک شاندار لائبریری بھی قائم کی ہے جس میں خود ہی شدید جد و جہد کے بعد سعودی عرب، پاکستان اور ہندستان سے بیس ہزار سے زائد علمی کتابیں جمع کی ہیں۔

موصوف بہت سی گرانقدر کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں: (۱) اسلام اور عصرِ حاضر (۲) اسلام کی نشأۃ ثانیہ قرآن کی نظر میں (۳) چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں (۴) شریعتِ اسلامیہ کی جنگ: نفقۂ مطلّقہ کی روشنی میں (۵) اسلامی شریعت: علم اور عقل کی میزان میں (۶) قرآن مجید اور دُنیائے حیات (۷) اسلام اور جدید سائنس (۸) تخلیقِ آدم اور نظریۂ ارتقا۔ وغیرہ وغیرہ۔

واقعہ یہ ہے کہ جن مسائل و موضوعات پر مولانا محمد شہاب الدین ندوی نے قلم اُٹھایا ہے وہ میدان عرصے سے خالی پڑا ہُوا تھا بلکہ بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی "علمی دنیا میں ایک سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ مگر آپ کے مضامین نے اس سناٹے کو توڑ دیا ہے۔" اسی طرح مولانا شہاب الدین ندوی نے فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ کو قائم کرنے، ایک وسیع و شاندار لائبریری کی بنیاد ڈالنے اور علمی میدان میں بلند پایہ تصنیفات کو معرضِ وجود میں لانے کی راہ میں جو انتھک محنت اور جد و جہد کی ہے اس کی داد حضرتِ موصوف نے اس طرح دی کہ "یورپ میں جو کام ایک اکیڈمی کرتی ہے وہ ہمارے یہاں ایک آدمی کرتا ہے۔" اس طرح موصوف حقیقتاً اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں، جو خود کوزہ و کوزہ گر کا بھی مصداق ہیں۔ پیشِ نظر کتاب اُن کے وسعتِ مطالعہ کی شاہد ہے۔

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدّمہ

کیا ہماری دُنیا کی تخلیق ۴۰۰۴ سال قبلِ مسیح عمل میں آئی تھی؟ یورپ میں یہ نظریہ اٹھارویں صدی تک مسلّم اور ناقابلِ تردید رہا۔ پھر محققین نے اس خیال کو مشکوک قرار دے کر نئی تحقیقات شروع کیں اور بتایا کہ زمین کی عمر بہت زیادہ ہے اور اس کی موجودہ سطح کی تراش خراش کو بنانے میں طبیعی قوتوں کو کافی عرصہ لگا ہے۔ (ماخوذ از "دی ارتھ" ص ۱۳، مطبوعہ لندن، ۱۹۸۴ء)

ہماری زمین چار ہزار سال قبلِ مسیح پیدا کی گئی تھی۔ یہ نظریہ بائبل کے تصورات پر مبنی ہے، جس کے مطابق چھ دنوں میں زمین و آسمان اور تمام لوازمِ حیات پیدا کئے گئے اور چھٹے دن اللہ نے آدم کو پیدا کیا۔ یہودی اور عیسائی فضلاء کی اس سلسلے میں بنیادی غلطی یہ تھی کہ اُنہوں نے ان چھ "دنوں" کو چھ "مدارج" Periods قرار دینے کے بجائے ہمارے دن رات کے مطابق ۲۴ گھنٹے والا ایک دن قرار دے دیا۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق خدا کا ایک دن ایک ہزار سال (حج: ۴۷) بلکہ پچاس ہزار سال (معارج: ۴) کے برابر بھی ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے چھ دنوں سے مراد ہماری موجودہ دُنیا کا ایک "ہفتہ" نہیں بلکہ ایک طویل مدت مراد ہے، جس کا صحیح علم خلاّقِ عالم ہی کو ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام اور اہلِ کتاب کے نظریات میں بہت بڑا اور بنیادی فرق ہے۔ مگر اس کے باوجود اہلِ کتاب کا یہ دعویٰ بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ اسلامی نظریات یہودیت اور عیسائیت سے ماخوذ ہیں، جبکہ حال یہ ہے کہ یہ مُحرّف شدہ صحیفے جدید سائنسی نظریات و اکتشافات کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں۔

اس کے برعکس اسلامی نظریات و تصورات اور اکتشافاتِ جدیدہ کے درمیان کوئی تعارض و تصادم نظر نہیں آتا۔

غرض یورپ کی نشأۃ ثانیہ renaissance کے آغاز کے بعد جب سائنس اور عیسائی مذہب میں تصادم شروع ہوا تو اس کے نتیجے میں مغربی فضلاء نے مذہب کی ہر چیز کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اور اٹھارویں صدی میں ایسی تحریکیں رُونما ہونے لگیں جن کی رُو سے ہماری کائنات کی تخلیق چھے دنوں میں وقوع پذیر ہونے اور تخلیقِ آدم کو چار ہزار سال قبلِ مسیح قرار دئے جانے کو کُھلم کُھلا چیلنج کیا جانے لگا۔ بلکہ بائبل کی کتاب پیدائش پر مبنی واقعات کو افسانہ اور خُرافات myth قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ سب سے پہلے بفن buffon (۱۷۰۷ - ۱۷۸۸ء) نے "تخلیقِ انواع" کے سوال کو اُٹھاتے ہُوئے "آدم" کی تخلیق کو خُدا کے مانند ہونے کے دعوے کو چیلنج کیا۔ (جیسا کہ کتاب پیدائش : ۱/۲۶ میں مذکور ہے)۔ پھر علمِ طبقات الارض Geology کے اکتشافات کے ذریعہ زمین کی تاریخ سے متعلق ایسے حقائق منکشف ہونے لگے جو بائبل کے بیان کردہ کیلنڈر سے زیادہ وسیع تاریخ کے حامل اور نزولِ آدم سے متعلق واقعات کے نقائص کو ظاہر کرنے والے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کانٹ (۱۷۲۴ - ۱۸۰۸ء) نے نظم و ضبط پر مبنی فطری دینیات کی بنیادوں کی رُو سے استدلال کی جڑ بنیاد کو کھوکھلا کر دیا۔ پھر ڈارون (۱۸۰۹ - ۱۸۸۲ء) نے اس سلسلے کی رہی سہی کسر بھی پوری کرتے ہُوئے آدم کے نسلِ انسانی کے باپ ہونے کے تصوّر پر "نظریۂ ارتقا" کے ذریعہ کاری ضرب لگائی۔ اس طرح "بائبل کی تاویلاتِ تخلیق و آفرینش کی سائنٹفک تفہیمات پر مبنی نہیں بلکہ یہ سب کچھ محض یہودی عقائد کا خلاصہ ہے جو خُدا، انسان اور کائنات کے باہمی روابط پر مبنی ہے۔" (ماخوذ از میکملن ڈکشنری آف دی ہسٹری آف سائنس، صہ ۶، مطبوعہ لندن، ۱۹۸۵ء)۔

اس طرح جدید سائنسی اکتشافات نے (جن میں مادہ پرستانہ افکار و نظریات کی بھی خاصی آمیزش ہے) مذہب کی جڑ بنیاد کو کھوکھلا کر دینے کا بیڑا اُٹھاتے ہُوئے مذہب کی ہر چیز کو مشکوک قرار دینے اور اس پر تنقید کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ مگر اس موقع پر ایک بات نوٹ کرنے کے

قابل یہ ہے کہ اہلِ مغرب جب مذہب پر تنقید کرتے ہیں یا اُسے آؤٹ آف ڈیٹ قرار دیتے ہیں تو ان کے پیش نظر محض عیسائی مذہب ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ انہیں صرف اسی ایک مذہب سے واسطہ پڑا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس اسلام میں ہر چیز صاف وُستھری اور حقائق و واقعات پر مبنی نظر آتی ہے۔ اور اس اعتبار سے اسلامی عقائد و نظریات جدید ترین تحقیقات و اکتشافات سے ٹکراتے نہیں بلکہ ان کے مطابق ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ مگر افسوس کہ مغربی فضلاء نے اسلام اور اسلامی حقائق کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ نہیں کیا۔ ورنہ انہیں مذہب پر تنقید کرتے وقت اسلام کو اس سے مستثنیٰ کرنا پڑتا۔ بہرحال اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان علماء اور اہلِ قلم جدید علمی نظریات و اکتشافات کا مطالعہ کر کے ان کی روشنی میں اسلامی عقائد و نظریات کی برتری ثابت کریں اور موجودہ گم کردہ راہ انسانوں کو خدائی ہدایت و رہنمائی سے آشنا کریں۔ یہ موجودہ دَور کی سب سے بڑی علمی ضرورت ہے۔ کیونکہ آج رُوئے زمین پر اہلِ اسلام ہی نوعِ انسانی کی ہدایت و رہبری کے ذمہ دار ہیں اور انہیں کے کندھوں پر یہ بوجھ ڈالا گیا ہے۔

موجودہ مادہ پرستانہ نظریات میں سب سے زیادہ گمراہ کن نظریہ "نظریۂ ارتقا" یعنی evolution ہے۔ یہ نظریہ اگرچہ دورِ قدیم ہی سے کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا رہا ہے، مگر موجودہ دور سے قبل اس کو عالمگیر شکل میں اپنایا نہیں گیا۔ جب کہ آج یہ نظریہ مذہب کی ضد میں پوری طرح عروج پر نظر آرہا ہے۔ جو جدید تعلیم یافتہ طبقے کے اذہان پر چھایا ہوا ہے۔ اس نظریہ کو صحیح تسلیم کرنے کا مطلب ہے خالقِ کائنات اور اُس کی خلاّقیت و رُبوبیت کا انکار۔ کیونکہ "ارتقا" کا مطلب ہے دُنیا کی "چیزیں" بغیر خدائی مداخلت کے خود بخود "ترقی" کر رہی ہیں اور ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت تک آپ سے آپ پہنچ رہی ہیں۔ حتیٰ کہ خود "مادّہ" یا matter (یعنی وہ مواد جس سے دُنیا بھر کی تمام چیزیں مرکب ہیں) بھی کسی ہستی کا پیدا کردہ نہیں بلکہ خود بخود وجود میں آیا ہے اور "ترقی" کرتے کرتے پہلے "مادّۂ حیات" بنا۔ پھر اُس سے ایک "جرثومۂ حیات" کا وجود از خود عمل میں آیا۔ پھر یہی جرثومۂ حیات "سادہ شکل" سے ترقی کرتے کرتے "پیچیدہ انواع" کی شکل میں خود بخود آگے بڑھنے لگا، یہاں تک کہ پہلے نباتات اور پھر

حیوانات کی بے شمار انواع species وجود میں آنے لگیں۔ پھر یہی جرثومۂ حیات بغیر کسی خالق و کارساز کی کرشمہ سازیوں کے ترقی کرتے کرتے خودبخود "انسان" کی شکل میں نمودار ہوگیا۔ چنانچہ ان نظریات کی رُو سے ابتدائی مادۂ حیات کو انسانی شکل اختیار کرنے میں کروڑوں سال لگ گئے، جیسا کہ علمِ طبقات الارض Geology اور علمِ اثریات Archaeology وغیرہ کی تحقیقات و اکتشافات سے ظاہر ہوتا ہے۔ (موجودہ نظریات کی رُو سے زمین کی عمر تقریباً ساڑھے چار ارب سال ہے اور رُوئے زمین پر "حیات" کا آغاز کئی کروڑ سال پہلے عمل میں آیا تھا)۔ اور خود علم الانسان Anthropology کی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کئی لاکھ سال سے (بوزنہ سے لے کر تحت الانسان تک) مختلف شکلوں میں پایا گیا ہے۔ لہٰذا "انسانی دور" کو بائبل کے نظریہ کے مطابق تقریباً چھ ہزار سال قبل (چار ہزار سال قبلِ مسیح) ماننا صحیح کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ ہے وہ مسئلہ جس نے بائبل کے ماننے والوں کو متزلزل کر دیا ہے۔ بالفاظِ دیگر جدید علمی نظریات نے عیسائیت کی جڑ بنیاد ہی کو اکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ اور اب سائنٹفک حقائق کے سامنے عیسائی عقائد و نظریات کسی مجذوب کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ بلکہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تصریح کے مطابق عیسائیت کے مذہبی صحیفوں نے "ڈاروینیت" کی لہر کے سامنے پوری طرح ہتھیار ڈال دئے ہیں:

The fourth wave occured in Victorian England, following the publication in 1859 of Darwin's Origin of Species. This book was taken as a challenge to the authority of Scripture because there was a clear inconsistency between the Genesis account of creation and the biological account of man's lower forms of life. The battle raged with bitterness for several decades, but died away as the theory of evolution gained more general acceptance. (15/530, 1983)

ترجمہ: (عقلیت پسندی کی) چوتھی لہر ۱۸۵۹ء میں ڈاروِن کی کتاب "اصل انواع" کی اشاعت کے بعد انگلینڈ میں عہدِ وکٹوریہ میں ظاہر ہوئی۔ اس کتاب کو مذہبی صحیفوں کی بالادستی کے لئے ایک چیلنج قرار دیا گیا۔ کیونکہ تخلیق کے سلسلے میں کتاب "پیدائش" کی توجیہ اور حیاتیاتی توجیہ (کہ انسان بتدریج نچلی انواع سے ترقی کر کے ظہور پذیر ہوا ہے) میں کھلا ہوا تناقض موجود ہے۔ یہ

جنگ تلخیوں سے بھرپور کئی دہوں تک چلتی رہی۔ مگر نظریۂ ارتقا کی ام مقبولیت میں اضافے کے باعث دم توڑ گئی۔

واقعہ یہ ہے کہ عیسائی مذہب نہ صرف یہ کہ ناقص تعلیمات کا مجموعہ ہے بلکہ اس میں عصری ہتھیاروں سے نبرد آزمائی کرنے اور خود کو جدید فکر و فلسفے کی چاند ماری سے بچانے کا کوئی سامان ہی موجود نہیں ہے۔ کیونکہ عیسائی مذہب ایک وقتی اور عارضی مذہب تھا نہ کہ ابدی و دائمی۔ اسی بنا پر وہ نقائص سے بھرپور ہے۔ اس کے برعکس اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو آج اس قسم کے تمام سائنسی اور فلسفیانہ حملوں سے نہ صرف خود کو بچانے کی استطاعت رکھتا ہے بلکہ موجودہ منحرف اور بے بنیاد (مادہ پرستانہ) نظریات پر حملہ آور ہو کر ان کا استیصال بھی کر سکتا ہے۔ اور اس اعتبار سے آج رُوئے زمین پر صرف اسلام ہی ایک سچّا اور برحق مذہب نظر آتا ہے جو منجانب اللہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ خُدا کی جانب سے نہ ہوتا تو پھر اس میں جدید ترین نظریات و اکتشافات سے مقابلہ کرنے کی سکت ہی نہ ہوتی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کائنات میں ایک ایسی لازوال ہستی کا وجود ضرور ہے جس کے نظریات ابدی اور دائمی ہوتے ہیں اور وہ کبھی زوال کا شکار نہیں ہوتے۔ اور اس سے یہ بھی بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ دینِ اسلام اُسی ہستی کی جانب سے بھیجا ہُوا ہے جس نے اس کائنات کی تخلیق کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اسلام اور کائنات میں کسی بھی قسم کا تعارض و تضاد موجود نہیں ہے (جس طرح کہ عیسائیت اور کائنات میں نظر آتا ہے) تو پھر اس بات کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہو سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی ہستی کی طرف سے جاری کردہ ہیں۔

غرض نظریۂ ارتقا آج دین و مذہب کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے۔ کیونکہ آج خُدا کو ماننا جس طرح اہلِ مذہب کا طرۂ امتیاز ہے، اسی طرح " نظریۂ ارتقا " کو ماننا جدید تعلیم یافتہ طبقے کی "جدیدیت" کی ایک علامت ہے۔ واضح رہے کہ یہ نظریہ تمام اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں حیاتیات کی ایک بنیادی بحث کی حیثیت سے داخل ہے اور اس کو بطور ایک مُسلّمہ طلبہ کے ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ چنانچہ آج غیر مُسلموں کا تو ذکر ہی کیا خود مُسلمان طلبہ کے اذہان بھی اس مسموم نظریہ کے اثرات سے محفوظ نہیں

ہیں۔ لہٰذا آج ہمیں سب سے پہلے خود اپنے نونہالوں کی فکر کرنی چاہئے اور اُن کے ذہنوں کو اس "بے خدا نظریہ" کے زہر سے بچانا ضروری ہے۔

واضح رہے کہ کائنات کا "تدریجی ظہور" اور "زندگی کا ارتقا" دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مگر مادہ پرست خُدا کے انکار کے لئے کہتے ہیں کہ "حیات" بغیر کسی خالق کے خود بخود وجود میں آئی ہے اور حیات کا "پھیلاؤ" بھی بغیر کسی کی کرشمہ سازیوں کے محض "ارتقائی" طور پر خود بخود ہو رہا ہے۔ حالانکہ یہ ایسے دعوے ہیں جو خود سائنٹفک نقطۂ نظر سے بھی بے دلیل اور بے سند ہیں۔ اس قسم کے دعووں کو کسی لیبورٹری یا تجربہ گاہ میں ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ واقعہ کے اعتبار سے انسان باوجود اپنی ہمہ جہتی ترقیوں کے اب تک "حیات" کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہو سکا ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارے علماء سائنسی علوم کا مطالعہ گہرائی کے ساتھ کر کے خود سائنسی نقطۂ نظر سے ان مادہ پرستانہ دعووں کی نامعقولیت پوری طرح ثابت کر دیں۔ یہ عصرِ جدید کا ایک تجدیدی کارنامہ ہوگا اور دین و مذہب کی بہت بڑی خدمت بھی۔ اسی کا نام "علمِ کلام" ہے اور یہ موجودہ دور کی ایک اہم ترین علمی ضرورت ہے۔

واضح رہے کہ سائنسی اکتشافات اور مادہ پرستانہ نظریات (یا مادہ پرستوں کی خواہشات) دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ کیونکہ مادہ پرست سائنسی حقائق میں اپنی "خواہشات" بھی گڈمڈ کر کے پیش کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان دونوں کو الگ الگ کرنا ہے۔ اس لحاظ سے جو چیزیں خالص سائنسی ہیں وہ "علمِ انسانی" کا قیمتی سرمایہ ہیں اور وہ اسلامی نقطۂ نظر سے بھی قابلِ حجت ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہمیں جنگ صرف مادہ پرستانہ نظریات سے لڑنی ہے اور نظریۂ ارتقا بھی انہی میں سے ایک ہے۔

ایک علمِ کلام وہ تھا جس کو ہمارے مُتقدّمین نے قرونِ وُسطیٰ میں یونانی فلسفے کے مقابلے کے لئے ایجاد کیا تھا۔ جب کہ موجودہ علمِ کلام وہ ہے جو جدید علوم و نظریات اور خاص کر مادی افکار و فلسفوں کے مقابلے کے لئے مطلوب ہے۔ اور اس حیثیت سے آج عالمِ اسلام ایک "جدید علمِ کلام" کی تدوین کا منتظر ہے اور آج اس کی بے انتہاء ضرورت و اہمیت ہے۔ اگر ہمارے اربابِ فکر و نظر نے

موجودہ حالات کی سنگینی کو محسوس نہ کیا اور ان کے تدارک کے لئے کوئی قدم نہیں اُٹھایا تو پھر آنے والا وقت ہمیں کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ فکرِ مغرب کی راہ سے الحاد و لادینیت کی جو لہریں اُٹھ رہی ہیں اُن کا مقابلہ علمی بنیادوں پر کر کے اُن کے زہریلے اثرات سے نوعِ انسانی کو عموماً اور عالمِ اسلام کو خصوصاً، بچانا نہایت ضروری ہو گیا ہے۔ اگر ہم نے اس معاملے میں غفلت کی تو پھر ہم خدا کے نزدیک جوابدہ ہوں گے۔ کیونکہ آج تمام اقوامِ عالم میں صرف مُسلمان ہی ایک دائمی دین و شریعت کے حامل ہونے کی بنا پر وہی ساری دُنیا کے نجات دہندہ ہیں۔ لہٰذا اگر وہ اس فرضِ منصبی کی ادائیگی میں ناکام ہو جائیں تو پھر عالمِ انسانی کس کی راہ دیکھے گا؟

واضح رہے کہ جدید علمِ کلام کا دائرہ اب صرف عقائد تک محدود نہیں رہا بلکہ وہ عبادات واخلاق اور تمام معاملاتِ زندگی تک وسیع ہو گیا ہے۔ اور اس لحاظ سے اب کسی مذہب کے صحیح یا غلط ہونے کا مدار اُس کے پُورے فلسفۂ حیات پر ہے، مجرّد عقائد پر نہیں۔ لہٰذا عصرِ جدید میں اسلام کو ایک کامل، برحق اور ابدی دین ثابت کرنے کے لئے زندگی کے ہر میدان میں اور ہر نقطۂ نظر سے اس کو کھرا ثابت کرنا ضروری ہے، جو سارے مسائلِ حیات کی گرہ کشائی کرسکتا ہو۔ اور اس نقطۂ نظر سے اب اُس کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج مادی فلسفوں اور مادی افکار و نظریات کے مقابلے کے لئے جب تک اسلام کو ایک مکمل فلسفے کے رُوپ میں پیش نہیں کیا جاتا (جس کے ذریعہ باطل فلسفوں کا توڑ اور اسلام کی برتری ظاہر ہو سکے)، فکر و نظر کی دُنیا میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی اور اسلام کا بول بالا نہیں ہو سکتا۔ بالفاظِ دیگر ذہنی و فکری اعتبار سے کوئی انقلاب برپا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی نظامِ حیات کو ایک نئے فلسفے یا نئے کلام کے رُوپ میں پیش کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ تلوار کا مقابلہ تلوار ہی کرسکتی ہے۔ اور اس اعتبار سے ایک فلسفہ کا مقابلہ دوسرا برتر فلسفہ ہی کرسکتا ہے۔ کیونکہ موجودہ دور عقلیت پسندی rationalism کا دور ہے اور آج لوگوں کو وہی چیزیں مطمئن کرسکتی ہیں جو عقلی و استدلالی اعتبار سے مُسکت اور تسلی بخش ہوں، محض وعظ و نصیحت سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آج زمانے کی قدریں values بدل چکی ہیں۔

اس لحاظ سے آج مذہب کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ مادی فلسفے اور مادی افکار و نظریات ہیں۔ اور ان نظریات میں سب سے بڑا اور بنیادی نظریہ وہ ہے جو "نظریۂ ارتقا" کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ نظریہ کوئی سائنسی حقیقت یا قانونِ فطرت law of nature نہیں، بلکہ محض ایک قیاس و مفروضہ ہے، جس کو سائنس اور کلیسا کی تاریخی کشمکش کے نتیجے میں برپا ہونے والی مذہب دشمنی کے نتیجے میں جنم دیا گیا اور پروان چڑھایا گیا۔ نیز اس کی عالمگیر پیمانے پر نشر و اشاعت میں یہودیوں اور اشتراکیوں کا بھی بہت بڑا حصّہ نظر آتا ہے، جنہوں نے اپنے قومی اور ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے اس کو اپنایا اور اس کی خوب تائید کی۔ چنانچہ مختلف حیثیتوں سے اس کی اتنی تشہیر کی گئی اور اس کو اس قدر بڑھاوا دیا گیا کہ وہ باوجود ایک مادہ پرستانہ ظن و قیاس (مفروضہ) ہونے کے، آج ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر کے اکثر "علمی" حلقوں میں نہ صرف ایک "مُسلّمہ" بن چکا ہے بلکہ ایک اچھے خاصے "عقیدے" کی شکل بھی اختیار کر چکا ہے۔ گویا کہ مذہب کے مقابلے میں ایک دوسرا متوازی عقیدہ بن گیا ہے۔ اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا اب اسکولوں اور کالجوں کی تمام نصابی کتابوں میں، جو حیاتیات Biology سے متعلق ہیں، ایک مستقل باب ارتقا evolution کے نام سے ہوتا ہے، جس میں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ تمام پیچیدہ انواعِ حیات کا ظہور کم پیچیدہ یعنی سادہ انواع سے (بغیر خدائی مداخلت کے) خود بخود ترقی کے ذریعہ ہُوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کو صحیح تسلیم کر لینے کا مطلب ایک خالق اور برتر ہستی کے وجود کا انکار ہے، جس کو خُدا کہتے ہیں۔ اور انکارِ خُدا کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان ہر قسم کی مذہبی اور سماجی پابندیوں سے آزاد ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ کسی کی خلّاقیت و رُبوبیت کا شاہکار نہیں ہے، بلکہ محض ارتقائی طور پر بغیر کسی منصوبہ بندی یا خُدائی مُداخلت کے خود بخود وجود میں آگیا ہے، تو اب وہ آخر کس بُنیاد پر شرعی و اخلاقی قیود قبول کرے؟ اور کیوں اپنی آزادی کو قربان کر کے اپنے پیروں میں "غلامی" کی زنجیریں ڈال لے؟ اپنے کام و دہن کی لذّت اور مرغوباتِ حیات کو تیاگ دے کر زُہد و قناعت کی زندگی کیوں بسر کرے؟ مختصر یہ کہ ایک "ارتقائی حیوان" یا ایک "بڑھیا جانور" ــــ جس کا کوئی خالق و مالک نہیں ہے ــــ مَلکوت اور مَلکوتیت سے کیوں اور کس لئے واسطہ رکھے؟

ظاہر ہے کہ یہ سب اس خود ساختہ نظریہ کے منطقی نتائج ہیں! اور اسی بنا پر دورِ جدید میں الحاد و لادینیت کی تبلیغ اور اُس کی عالمگیر نشر و اشاعت میں اس نظریہ کا بہت بڑا دخل ہے، جیسا کہ ماہرین و مفکرین کی رائے ہے۔ بلکہ درحقیقت آج یہ نظریہ عالمِ انسانی کے لئے ایک خوفناک چیلنج کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اِگنورنس The Encyclopaedia of Ignorance کے ایک مقالہ نگار ٹاملن E.W.F.Tomlin نے نظریۂ ارتقا کی تردید میں مفصل بحث کرتے ہُوئے مُعالجۂ دماغی کے ایک ماہر کارل اسٹیرن کے حوالے سے لکھا ہے کہ آج نوعِ انسانی کے لئے جن تین بڑی دھمکیوں یا تہدیدات کا سامنا ہے اُن میں سے ایک نظریۂ ارتقا بھی ہے۔ اور بقیہ دو ہیں مارکسزم اور فرائڈ ازم۔

The psychiatrist, Karl Stern places it (evolution) second of the three great threats to human complacency of which the first was represented by Marxist reductionism and the third by Freudism. (P.228, Oxford, 1978.)

یہ ہے اس مسئلے کی سنگینی اور وہ خطرناک صورتِ حال، جس سے آج پورا عالمِ انسانی دوچار ہے۔ گویا کہ یہ نظریہ آج دین و مذہب کی راہ میں ایک زبردست رُکاوٹ بنا ہُوا ہے۔ اور جب تک یہ رکاوٹ دُور نہ ہوگی، آج کا "عقلیت پسند" انسان مذہب کی حقانیت کو قبول نہیں کر سکتا۔ اور اس باب میں جدید تعلیم یافتہ مُسلمانوں کی اکثریت بھی شامل ہے۔ چنانچہ ایسے تعلیم یافتہ لوگ اگرچہ اپنے گھریلو مذہبی ماحول یا معاشرتی اثرات اور دباؤ کی بنا پر بظاہر کتنے ہی "مسلمان" کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں، مگر وہ مذہبی نظام کی عظمت و برتری کے ذہنی اعتبار سے قائل نہیں ہو سکتے، اِلاّ ماشاءاللہ۔ لہٰذا اس فتنے کے استیصال یا ذہنِ انسانی کی دُھلائی کے لئے ضروری ہے کہ یہ اور اس قسم کے دیگر مادہ پرستانہ نظریات کو استدلالی میدان میں شکست دی جائے، اور ان کے کمزور موقف اور بودے پن کا حال علمی و سائنسی دلائل کی روشنی میں آشکارا کیا جائے۔ ان کے خلاف محض فتویٰ دے دینا کافی نہیں ہوگا۔ اور اس باب میں انبیائے کرام کا صحیح مشن یہ ہے کہ وہ ہر دور کی عقلیت و منطقیت کے توڑ کے لئے خداوندِ کریم

کی جانب سے واضح دلائل اور روشن بیّنات لے کر آتے ہیں، جن کے ذریعہ نوعِ انسانی کے اختلافاتِ باہمی کا فیصلہ کرنا اور صحیح راہِ حق دکھانا مقصود ہوتا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ : سب لوگ (ابتدا میں) ایک ہی دین پر تھے، پھر اللہ نے نبیوں کو خوشخبری دینے والے اور متنبّہ کرنے والے بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ سچی کتاب اُتاری، تاکہ وہ لوگوں کے اختلافات کے درمیان فیصلہ کر سکے۔ (بقرہ : ۲۱۳)

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ : یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی کھلی نشانیاں دے کر بھیجا ہے اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان اُتار دی ہے، تاکہ لوگ عدل کے ساتھ قائم رہ سکیں۔ (حدید : ۲۵)

اس لحاظ سے رسولوں اور آسمانی کتابوں کا سب سے بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر دور کی ذہنیت و عقلیت کے توڑ اور اُس کے فکری و اعتقادی اختلافات کو رفع کرنے کے لئے خُدا کی جانب سے قولِ فیصل لے کر آتے ہیں، جو "بیّنات" یعنی خُدائی دلائل و شواہد سے بھرپور رہتا ہے۔ اب چونکہ کوئی نیا رسول یا نئی کتاب آنے والی نہیں ہے، اس لئے خُدائے برتر نے اپنی آخری کتاب یعنی قرآنِ مجید کو ہر قسم کے "بینات" یا روشن دلائل سے پوری طرح مزیّن کر دیا ہے، جو قیامت تک ہر دور کی عقلیت و استدلالیت کا بھرپور مقابلہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا اب علمائے اسلام کا کام یہ ہے کہ وہ ہر دور کی عقلیت و منطقیت کے توڑ کے لئے قرآن اور عصری علوم کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں اور خُدائی دلائل و نشانات کو منظرِ عام پر لائیں۔ اس اعتبار سے ہر دور میں خُدائی رہنمائی کے نئے نئے اور اعجازی پہلو ظاہر ہوتے رہیں گے اور ساتھ ہی ساتھ یہ ثبوت و شہادت بھی سامنے آتی رہے گی کہ ہاں یہ یقیناً کلامِ الٰہی ہے۔ اس طرح ہر دور میں دوہرے فوائد حاصل ہوتے رہیں گے۔

نظریۂ ارتقا ایک وسیع موضوع ہے اور اس کے متعدد پہلو ہیں۔ اس لئے کوئی ایک شخص اس کے تمام مسائل و مباحث پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ حقیقت میں یہ پوری ایک ٹیم کے کرنے کا کام ہے۔ انگریزی

زبان میں اس موضوع پر بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مگر اُردو دُنیا میں عموماً ایک سناٹا سا چھایا ہُوا ہے۔ گویا کہ ہماری مِلّت کو اس مسئلے کی سنگینی کا کوئی احساس ہی نہیں ہے، جو آج حق و باطل کے درمیان ایک حدِ فاصل بنا ہُوا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اس موقع پر یہ کہہ دیا جائے کہ اُردو والوں کو یا تو اس کی ضرورت ہی نہیں ہے، یا یہ کہ اُردو دُنیا کو ان "باطل مسائل" سے روشناس نہ کرانا ہی بہتر ہے۔ تو یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُردو دُنیا اس مسئلے سے بالکل ناواقف بھی نہیں ہے۔ بلکہ اگر واقف ہے تو "مخالفانہ" نقطۂ نظر سے کم اور "موافقانہ" نقطۂ نظر سے زیادہ۔ اور اس باب میں بعض علماء تک تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں، جن کا علمی دُنیا پر کافی اثر ہے۔ جبکہ صحیح اسلامی نقطۂ نظر سے اس نظریہ کے خلاف اب تک کوئی مبسوط بحث نہیں کی گئی ہے اور اس کے توڑ کے لئے کوئی اسلامی فلسفہ پیش نہیں کیا گیا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر عام پڑھے لکھے لوگ اس باطل نظریہ کے سحر سے مسحور ہو کر، اسلامی تعلیمات کو شک و شُبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور تخلیقِ آدمؑ اور شخصیتِ آدمؑ کی صحت و صداقت سے انکار کر دیتے ہیں۔ گویا کہ یہ ایک غیر حقیقی اور غیر واقعاتی قصّہ ہے۔ اس اعتبار سے اب حال یہ ہے کہ خود ہماری نئی اور نوخیز نسلوں کو الحاد و لادینیت کے ان تھپیڑوں سے بچانا ضروری ہو گیا ہے۔

یہ ہے وہ سنگین صورتِ حال، جس کی بنا پر راقم سطور سالہا سال سے اس مسئلے پر مختلف حیثیتوں سے غور کرتا رہا۔ پھر اس مسئلے کی نوعیت و اہمیت سے آگاہ ہونے کے بعد، قرآنیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے، کھلے دل و دماغ کے ساتھ جب قرآنِ حکیم کا مطالعہ کیا تو یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو گئی کہ قرآنِ حکیم اور نظریۂ ارتقا ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان دونوں میں تطبیق و ہمنوائی کسی بھی طرح نہیں ہو سکتی۔ اور جن علماء اور "مفکّرین" نے ان دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے وہ غلطی پر ہیں۔ چنانچہ مسلسل مطالعہ اور غور و فکر کے بعد بندے نے اس سلسلے کے دلائل قلمبند کرنے شروع کر دیئے، تو ان دلائل نے کئی کتابوں کی شکل اختیار کر لی۔ اور پیش نظر کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے، جس میں زیادہ تر شرعی دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ اور ان کی رُو سے حضرت آدم علیہ السلام کا ابوالبشر ہونا مُسکت

طور پر ثابت ہوتا ہے۔

اس کتاب میں میری کوشش یہ ہے کہ سب سے پہلے مُسلم طبقے کا ذہن صاف کیا جائے اور ہماری نئی نسلوں کو الحاد و لادینیت کے اثرات سے بچایا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج نوعِ انسانی کی عمومی اصلاح سے پہلے خود اہلِ اسلام کی اصلاح ضروری ہے کہ اُنہیں بتایا جائے کہ جس مقدس کتاب پر اُن کا ایمان ہے وہ اس نظریہ کی تائید یا تردید میں کیا کہتی ہے؟ اس لئے میں نے اس میں زیادہ تر شرعی دلائل بیان کئے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ کچھ علمی وسائنسی دلائل و شواہد بھی ضرور بیان کر دیئے ہیں۔ اور شروع کے دو ابواب میں مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر اس نظریہ کا ایک بھرپور تعارف اور اس پر تبصرہ بھی کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ آج کے استدلالی دور میں محض شرعی دلائل سے کام نہیں چل سکتا۔ اور اس اعتبار سے یہ کتاب علمی و شرعی دونوں قسم کے دلائل و براہین سے مزین ہے۔ اور ان دونوں کو ایک نئے اسلوب میں اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ گویا وہ ایک دوسرے کے مُؤیّد و مُصدّق ہیں، نہ کہ باہم مُتصادم و مُتحارب۔ گویا کہ فطرت و شریعت دونوں کا نغمہ و ساز ایک ہی ہے اور ان دونوں میں سرے سے کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔ اور اختلاف و تصادم جو کچھ بھی ہے یا جو کچھ بھی نظر آتا ہے وہ محض مادہ پرستانہ ذہن اور نقطۂ نظر کا فرق ہے، ورنہ حقیقتاً ان دونوں میں سرے سے کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔

اس طرح بندے نے ایک نئے کلامی نقطۂ نظر سے نظامِ فطرت اور نظامِ شریعت کا جائزہ لے کر ایک نیا فلسفۂ شریعت مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، جو اپنی نوعیت کی غالباً اولین کوشش ہے۔ اور اس لحاظ سے اس موضوع پر قرآن اور حدیث کی روشنی میں ایک وسیع نقطۂ نظر سے جائزہ لینے اور صحیح اسلامی نظریہ نیز ٹھیٹ اسلامی فکر پیش کرنے والی غالباً یہ پہلی کتاب ہے۔ مگر میں نہیں جانتا کہ بندہ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہے۔ اور نہ مجھے اس سلسلے میں کسی قسم کی خوش فہمی ہے کہ میں نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے اور متعلقہ ساری معلومات پیش کر دی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک فردِ واحد اس وسیع موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے راقمِ سطور نے جو کچھ بھی کیا ہے، اُس کو ایک اچھی شروعات کا نام بہرحال ضرور دیا جا سکتا ہے، جو متعدد اور گوناگوں پہلوؤں کی

اہمیت ظاہر کرنے اور ایک وسیع نقطۂ نظر کا خاکہ پیش کرنے والی ہے۔ اور اس وسیع نقطۂ نظر سے شاید دُنیائے اسلام میں اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ جہاں تک اس سلسلے کے شرعی مسائل کا تعلق ہے وہ اس میں بالکل وضاحت کے ساتھ پیش کردئے گئے ہیں، جو قطعی ومحکم دلائل پر مبنی ہیں۔ ہاں البتہ اس میں علمی وسائنسی نقطۂ نظر سے مزید اضافہ ہوسکتا ہے۔ اور اس لحاظ سے بندہ کو اپنی کم مائگی کا احساس و اعتراف ضرور ہے۔

بہر حال اس غلط اور بے بنیاد نظریہ کی بنا پر جو مخلوقِ خُدا گمراہ ہو رہی ہے، اس کے شر سے نوعِ انسانی کو بچانا موجودہ دَور کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ کیونکہ آج دین و اخلاق کی ترقی اور ان کے نفوذ کی راہ میں یہ نظریہ ایک سدِ راہ اور بہت بڑی رکاوٹ بنا ہُوا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی اَقدار کی پامالی میں اس نظریہ کا زبردست ہاتھ ہے۔ لہٰذا انسانی و اخلاقی اَقدار کی بحالی موجودہ دور کا ایک عظیم ترین تجدیدی کارنامہ ہوگا۔ اور یہ کارنامہ آج صرف حاملینِ قرآن ہی صحیح طور پر انجام دے سکتے ہیں، جو ایک ابدی و سرمدی پیام کے حامل ہیں۔

نظریۂ ارتقا کی تائید میں آج سب سے بڑی دلیل جو پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ زمین کی کُھدائی کے باعث جو قدیم دور کی ہڈیاں وغیرہ ملی ہیں، جن کو "اُحفوری آثار" یا fossil remains کہا جاتا ہے، اُن کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ لاکھوں سال پُرانی ہیں، اور ان میں سے بعض موجودہ انسان سے کمتر قسم کی انواع سے بھی متعلق ہیں، یعنی اُن انواع species سے متعلق جو انسان نما تھیں اور ان کا درجہ انسانوں اور بُوزنہ ape خاندان کے بندروں یا بن مانسوں کے درمیان تھا۔ اور اس اعتبار سے گویا کہ موجودہ انسان نچلے حیوانات سے درجہ بدرجہ ترقی کرکے بغیر کسی خُدائی مداخلت کے خود بخود ایک "بڑھیا جانور" higher animal کے رُوپ میں جلوہ افروز ہُوا ہے۔ اور ان متعدد انواع میں "آدم" کا کوئی مقام نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر بُوزنہ خاندان سے لے کر موجودہ انسان تک جتنی بھی انواع گزر چکی ہیں، ان میں سے کسی کو بھی آدم کے نام سے موسوم کرنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا بائبل اور اسی طرح دیگر صحیفوں میں دُنیا کے اولین انسان کو جو آدم کہا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہوسکتا۔

اور بائبل کے اس بیان کو اس حیثیت سے بھی چیلنج کیا گیا ہے کہ اُس میں دورِ آدم چار ہزار سال قبلِ مسیح قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ اثری تحقیقات کی رُو سے انسان کا وجود رُوئے زمین پر لاکھوں سال سے ثابت ہوتا ہے۔

اس طرح بعض مُسلم دانشوروں نے جب دیکھا کہ آدم کی حقیقت کو اب ماننا "مشکل" ہو گیا ہے تو انہوں نے جھٹ سے کہہ دیا کہ قرآن میں قصۂ آدم محض ایک تمثیلی پیرائے میں بیان ہُوا ہے، لہٰذا اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ حالانکہ جدید ترین اثری تحقیقات اب تک کسی قطعی و یقینی نتیجے تک نہیں پہنچ سکی ہیں اور نہ اس سلسلے میں کوئی واضح ثبوت ہی حاصل ہو سکا ہے۔ بلکہ ان کی حیثیت چند قیاسات و مفروضات سے زیادہ نہیں ہے۔ چنانچہ شروع کے دو ابواب میں جدید ترین اکتشافات کی روشنی میں ان مسائل و موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کی تردید اور اسلامی عقائد و تصوّرات کی بھرپور تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سلسلے میں بعض ایسے حیرت انگیز اسلامی حقائق و معارف سامنے آتے ہیں جو نوعِ انسانی کے لئے سنگہائے میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس طرح شروع کے دو ابواب (یعنی حصۂ اول) میں ـــــ جو تمہیدی نوعیت کے ہیں ـــــ مادہ پرستانہ نظریات کی تردید کے بعد تیسرے باب میں (حصّۂ دوم سے) تخلیقِ آدم کی اصل بحث شروع ہوتی ہے۔ اور اس سلسلے میں سب سے پہلے اُن مُسلمان عُلماء اور مفکّرین کے افکار کا ایک جائزہ لیا گیا ہے جنہوں نے اس نظریہ (یا اُس کے پروپگنڈے) سے متاثر ہو کر قرآن میں بے جا تاویل کرنے کی جرأت کی ہے۔ اور چوتھے باب میں ان غلط تاویلات کا قرآنی اُصولوں کی روشنی میں ایک بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ پھر پانچویں اور چھٹے باب میں قرآن اور حدیث کے اُن قطعی اور مُسکت بیانات کو پیش کیا گیا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے اولین بشر ہونے کی دلالت اس طرح کرتے ہیں کہ ان میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔

واقعہ یہ ہے کہ تخلیقِ آدم یا "تخلیقِ خصوصی" کا اثبات، بجائے خود نظریۂ ارتقا کی تردید ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی وجہ سے بعض علماء جو نظریۂ ارتقا کے پروپگنڈے

سے متاثر تھے، اُنہوں نے جب اس نظریہ کو قرآن سے ثابت کرنا چاہا تو قصۂ آدم کو ایک تمثیل قرار دے دیا۔ اور ان لوگوں کی انتہائی سادگی یہ ہے کہ ان کی نظر میں اسلامی نقطۂ نظر سے اس نظریہ کو صحیح مان لینے کی صورت میں خُدا کے خالق ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک کھُلا ہُوا تضاد ہے۔ اور اس سلسلے میں بعض علماء کا یہ عجیب و غریب فرمان ہے کہ اس نظریہ کی تردید میں اسلام اور قرآن کو نہ گھسیٹا جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آئندہ چل کر سائنسی نقطۂ نظر سے یہ نظریہ صحیح ثابت ہو اور قرآن متہم ہو جائے۔ مگر ایسا کہنے والے دوسری ہی سانس میں قرآن سے اس کے تائیدی پہلو نکالنے لگ جاتے ہیں۔ گویا اس کا مطلب یہ ہُوا کہ قرآن سے اس نظریہ کی تائید تو کی جا سکتی ہے ـــــ چاہے وہ کسی بھی طرح کھینچ تان کر ہی کیوں نہ ہو ـــــ مگر اُس کی تردید نہیں کی جا سکتی۔ (ملاحظہ ہو تیسرا باب)۔

یہ نہایت ہی عجیب بات ہے کہ قرآنِ حکیم جو حق و باطل میں فرق و امتیاز کرنے اور پُورے عالمِ انسانی کو متنبہ کرنے کی غرض سے نازل ہُوا ہے (فرقان: ۱) وہ اب یا تو ایک باطل فلسفے کی حمایت کرے یا خاموش رہ جائے! ظاہر ہے کہ قرآنِ حکیم نظامِ کائنات سے متعلق ہر قسم کے باطل فلسفوں کی تردید کے لیئے نازل ہُوا ہے، نہ کہ اُن کی تائید و تصدیق کے لئے۔ اسی بنا پر اُس کو "فُرقان" کہا گیا ہے۔

اس طرح اب پانی سر سے اُونچا ہو گیا ہے۔ لہٰذا اب دو ہی راستے باقی رہ جاتے ہیں: یا تو اسلامی اُصولوں کو صحیح مانا جائے اور اُس کے تمام عقائد و ایمانیات کی تصدیق کی جائے، یا پھر صاف صاف ان کا انکار کر کے جو بھی نظریہ چاہے اختیار کیا جائے۔ ان دونوں کا اجتماع عقلی و شرعی حیثیت سے بیک وقت ممکن نہیں ہو سکتا۔ انسان کو بہر حال اس کی آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی عقل و فکر سے کام لے کر جس نظریہ اور جس عقیدے کو وہ صحیح سمجھتا ہوا اختیار کرے۔ مگر اُس کو متضاد رویہ یا دو رنگی پالیسی اختیار نہیں کرنی چاہیئے۔

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَّإِمَّا كَفُورًا: ہم نے اُس کو (اصل) راستہ دکھا دیا ہے، تو اب چاہے وہ (ہمارا راستہ اختیار کر کے) شکر گزار بنے یا (یا اس کا انکار کر کے)

ناشکرا - (دھر : ۳)

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں قرآنی آیات اور اس کے مُجملات کی توضیح کے لئے حدیثِ رسول کو بطورِ شرح و تفسیر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے مؤیّد و مصدق ہیں اور ان میں ذرہ برابر بھی تناقض و تضاد نہیں ہے۔ موجودہ دَور میں انکارِ حدیث کا جو فتنہ پرورش پا رہا ہے، اُس کے توڑ کے لئے ضروری ہے کہ تمام حدیثوں کو قرآن کی شرح و تفسیر کے طور پر پیش کیا جائے اور اس پر نئے سرے سے کام کیا جائے۔ اگر قرآنِ حکیم کے مضامین میں گہری نظر ڈالی جائے تو دکھائی دے گا کہ ہر صحیح حدیث کی کوئی نہ کوئی اصل قرآن ہی میں ضرور موجود ہو گی۔ چنانچہ نظریۂ ارتقا کی تردید میں قرآن میں جو بنیادی نصوص موجود ہیں، اُن کی بھرپور شرح و تفسیر مختلف حدیثوں میں ملتی ہے، جس کے ملاحظہ سے نہ صرف قرآنِ حکیم بلکہ حدیثِ رسول کا اعجاز اور اُس کی صداقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے۔ صرف چشمِ بینا کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ چودہ سو سال پہلے اس طرح کی پیش بندیاں کر دینا کسی انسان کے بس کا روگ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں بذریعہ وحی ایک ہی مصدر اور ایک ہی سرچشمے سے صادر ہوئی ہیں۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ - إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ : وہ اپنی خواہش سے (کچھ بھی) نہیں کہتا۔ بلکہ یہ تو وحی ہے جو اُس پر آتی ہے۔ (نجم : ۳-۴)

اِس لحاظ سے آج حدیثِ رسول کی عظمت بھی بخوبی ظاہر ہو رہی ہے۔ تاکہ خُدائی حُجت ہر طرح سے پُوری ہو جائے۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ : تاکہ جو ہلاک ہو وہ دلیل کے بعد ہلاک ہو۔ اور جو زندہ رہے وہ دلیل سے زندہ رہے۔ (انفال : ۴۴)

قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا
تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے دلیلیں آچکی ہیں۔ تو اب جس نے بصیرت سے کام لیا وہ تو فائدے میں رہا اور جو اندھا بنا رہا تو اُس نے نقصان اُٹھایا۔ (انعام : ۱۰۴)

یہ عقلی و شرعی دلائل زندگی کے کسی خاص پہلو یا خاص نقطۂ نظر سے متعلق نہیں، بلکہ تمام مسائلِ حیات کا احاطہ کرنے والے اور وسیع نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ بالفاظِ دیگر قرآن حکیم کسی بھی مسئلے میں معقول رویہ اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے اور انکار کرنے والوں کے سامنے عقلی و علمی دلائل پیش کرتا ہے، تاکہ خدا کی طرف سے اتمامِ حجت پوری ہو جائے۔ اور اس اعتبار سے اسلام ایک علمی و عقلی مذہب ہے، جو اپنی کوئی بھی بات محض جبر و تحکم سے نہیں منواتا۔

اس لحاظ سے مادی فلسفوں اور مادی افکار و نظریات کی تردید میں قرآن حکیم میں جا بجا علمی و عقلی دلائل مذکور ہیں، جن کے ذریعہ نظریۂ ارتقا کی بھی تردید ہو جاتی ہے۔ مگر یہ دلائل فلسفیانہ اسلوب میں یا یونانی طرزِ استدلال میں مذکور نہیں ہیں۔ بلکہ اُس کے بیان کردہ مقدمات میں غور و خوض کے بعد یہ دلائل مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں غور و خوض کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اب یہ علمائے اُمت کا کام ہے کہ وہ اس کلام کے ابدی نصوص میں تفکر و تدبر اور عصرِ جدید کی عقلیت و استدلالیت کے خلاف ربانی دلائل و بصائر کا استنباط کر کے اُس پر اتمامِ حجت کریں۔ اور یہ فریضہ ہر دور میں علمائے اسلام پر ایک فرضِ کفایہ کی حیثیت سے عائد رہے گا۔

بہر حال اس سلسلے کی پہلی کتاب اس وقت پیشِ خدمت ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو اس سلسلے کی دوسری کتاب بھی بہت جلد "قرآنِ حکیم اور نظریۂ ارتقا" کے نام سے پیش کی جائے گی، جو زیادہ تر علمی و سائنسی دلائل و شواہد پر مشتمل ہوگی۔ اور اس لحاظ سے یہ ایک عمومی نوعیت کی کتاب ہوگی۔ اہلِ علم سے گزارش ہے کہ وہ اس سلسلے میں راقمِ سطور کو اپنے قیمتی مشوروں سے ضرور سرفراز فرمائیں۔ اور جو حضرات اس مسئلے کے کسی خاص پہلو سے باخبر ہوں، ان سے مؤدبانہ التماس ہے کہ وہ بندہ کو ایک علمی امانت کے طور پر اس سے آگاہ کر کے جزائے خیر کے مستحق بنیں۔

قرآن اور حدیث میں حضرت آدم علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں جو کچھ مذکور ہے، اگر اس کو جمع کر دیا جائے تو اس سے نہ صرف "سیرتِ آدم" کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں بلکہ اس سلسلے میں بہت سے حیرت انگیز اسباق و بصائر بھی منظرِ عام پر آ جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدم کی

شخصیت ایک تاریخی اور واقعاتی شخصیت ہے، نہ کہ کوئی افسانہ یا دیو مالا۔ چنانچہ اس سلسلے کی دوسری کتاب کی تکمیل کے بعد اگر زندگی باقی رہی تو انشاء اللہ راقم سطور سیرتِ آدم اور اُس کے اسباق و بصائر کا سلسلہ بھی کئی حصوں میں مکمل کرے گا، جس کا خاکہ مرتب کر لیا گیا ہے اور اس کے بعض مباحث لکھے جا چکے ہیں۔ انشاء اللہ یہ سلسلہ قرآنِ حکیم اور جدید سائنس کے حقائق و معارف کی روشنی میں مکمل کیا جائے گا، تاکہ عصرِ جدید میں قرآنِ حکیم کی معجزانہ رہنمائی کا پہلو پوری طرح ظاہر ہو جائے۔ السّعی مِنّیِ والاِتمام مِنَ اللہ۔

اِس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ انگریزی کتب کی جو عبارتیں اس کتاب میں بطورِ اقتباس پیش کی گئی ہیں اُن کا اُردو میں لفظی ترجمہ کرنے کے بجائے عموماً ان کا مفہوم و مدعا بیان کرتے ہوئے اصل عبارتیں جوں کی توں دے دینا مناسب سمجھا گیا۔ کیونکہ لفظی ترجمہ کرنا ذرا مشکل بھی ہے اور پھر اس سے مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہو سکتا۔ اُمید ہے کہ قارئین اس چیز کو پیش نظر رکھیں گے۔

مجھے خوشی ہے کہ اکیڈمی کے رفیقِ کار عزیزی عبداللہ زُبیر نے، جو سائنس کے گریجویٹ ہیں، انگریزی کتب اور خصوصاً انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے بعض حوالوں کی تلاش و تحقیق میں میری مدد کی۔ نیز کتاب کے آخر میں جو انڈکس ہے وہ انہی کا تیار کردہ ہے۔

خادمِ قرآن

محمد شہاب الدّین ندوی

جمعہ ۲۰/۶/۱۴۰۷ھ

۲۰/۲/۱۹۸۷ء

حصّۂ اول

پہلا باب

نظریۂ ارتقا حقیقت ہے یا افسانہ

ربوبیت کا ایک سربستہ راز

عصرِ جدید کے وہ مادہ پرستانہ نظریات جو دین و مذہب کے لئے ایک چیلنج سمجھے جاتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہم نظریۂ ارتقا (Theory of Evolution) ہے، جو ایک علمی حقیقت (fact) سے زیادہ محض ایک مفروضہ (hypothesis) ہے۔ اور اس کو ایک علمی حقیقت ثابت کرنے کی تمام کوششیں اب تک ناکام ہو چکی ہیں اور برابر ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ دورِ جدید کا سب سے زیادہ اہم اور معرکۃ الآراء مسئلہ ہے جس پر علمی اعتبار سے اتنا کام ہو چکا ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے مسئلے پر ہُوا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے کو بنیاد بنا کر کھیتوں اور باغیچوں میں تجربات کئے جا رہے ہیں اور لیبورٹریوں میں مسلسل جانچ پڑتال کی جا رہی ہے۔ چمپانزی بندروں کو برابر ٹریننگ دی جا رہی ہے تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ سدھائے جانے پر وہ بھی انسان بن سکتے ہیں۔ اسی طرح دُنیا بھر کے مختلف حیاتیاتی نمونوں کو اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ اور اس مقصد کے لئے کرۂ ارض کا گوشہ گوشہ چھانا جا رہا ہے، سمندروں کو کھنگالا جا رہا ہے اور زمین کے اندر گڑے ہُوئے اُحفوری آثار و باقیات (fossil remains) تک کو کھود کھود کر نکالا جا رہا ہے۔ اس طرح نہایت درجہ ہوشیاری اور کمال احتیاط کے ساتھ ایک ایک چیز کا نہایت باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیا

جا رہا ہے۔ پھر ان مشاہدات و تحقیقات کے نتائج سے علمی رسائل کے صفحات سیاہ کئے جا رہے ہیں۔ اور اس طرح بِلا مبالغہ اب تک ہزاروں مقالات و مضامین اور سیکڑوں کتابیں اس موضوع پر لکھی اور شائع کی جا چکی ہیں۔ اس طرح دلیل و استدلال کا بازار خوب گرم ہو گیا ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ مسئلہ اب تک حل نہیں ہو سکا ہے۔ بلکہ "ارتقا" کی گرہیں بجائے کھلنے کے اور زیادہ پیچیدہ نظر آنے لگی ہیں اور یہ قُدرت و ربوبیت کا ایک ایسا سربستہ راز بنا ہُوا ہے جو کسی طرح کُھلتا دکھائی نہیں دیتا۔

ارتقا ثابت نہیں ہے

اس لحاظ سے نظریۂ ارتقا ثابت نہیں ہے۔ اور اس کے ثبوت کے بارے میں اب تک ایسی کوئی حقیقت دریافت نہیں ہو سکی ہے جس کو "قانونِ فطرت" کا نام دیا جا سکے۔ اور اس سلسلے میں اب تک جتنے بھی دعوے کئے گئے ہیں وہ سب بِلا دلیل اور بِلا ثبوت ہیں، جن کی حیثیت قیاسات و مفروضات سے زیادہ نہیں ہے۔ اسی بنا پر اب خود دنیائے سائنس میں یہ خیال زور پکڑتا جا رہا ہے کہ نظریۂ ارتقا محض ایک قیاس و مفروضہ ہے جو سائنسی نقطۂ نظر سے ثابت نہیں ہے۔

یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ آج اکثر سائنس دانوں کا مذہب یا اُن کا مقبول ترین عقیدہ "لاادریت" (agnosticism) ہے۔ یعنی وہ مذہب اور دہریت کے بین بین اس بات کے قائل ہیں کہ ہم خُدا یا مافوق الطبیعی چیزوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے یا یہ کہ انسانی عقل وحیِ الٰہیات اور اصلِ کائنات کا پتہ لگانے میں ناکافی ہے۔ جب کہ ان کے بِالمقابل دو گروہ اور ہیں جن میں سے ایک مُلحد و مادہ پرست اور دوسرا خُدا پرست ہے۔ اور نظریۂ ارتقا کے قائلین زیادہ تر مادہ پرست ہی ہیں۔ جبکہ خدا پرست سائنس دان اس نظریہ کو غلط اور بے بنیاد مفروضہ بلکہ ایک افسانہ قرار دیتے ہُوئے علمی اعتبار سے اس کا رد کرتے ہیں اور ایسے سائنس دانوں کی تعداد خاصی ہے۔ اس طرح خدا پرستی اور الحاد کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ مگر آج چونکہ علمی دنیا پر مادیت و دہریت کا غلبہ ہے اس لئے علمی و ثقافتی مرکزوں پر اسی طبقے کا بول بالا ہے۔

ارتقا ایک افسانہ

بہرحال نظریۂ ارتقا کی تردید میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کو اکھٹا کرنے کے لئے تو ایک دفتر درکار ہے، مگر اس موقع پر چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔ (اس موضوع پر ایک مفصل کتاب زیرِ تصنیف ہے)۔ چنانچہ آکسفورڈ سے ابھی ایک نئی اور قابلِ قدر کتاب "قاموسِ جہالت"۔۔۔ (The Encyclopaedia of Ignorance) کے نام سے شائع ہوئی ہے، جس میں ساٹھ مستند ماہرینِ سائنس کے مختلف موضوعات پر فکر انگیز مقالات موجود ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون کا عنوان ہی "نظریۂ ارتقا کے مغالطے" (The Fallacies of Evolution Theory) ہے۔ اور اس مضمون کا حاصل یہ ہے کہ انسان نام نہاد ارتقائی قوانین کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ اور ان کو "حقائق" کا نام دینا ایک مغالطہ ہے۔ چنانچہ صاحبِ مضمون ٹاملن (Tomlin) اپنے مضمون کے آخر میں تحریر کرتا ہے:

موجودہ ارتقائی فکر میں سخت پیچیدگی کی وجہ، جو کہ بہت سے مغالطے پیدا کرنے کا باعث ہے، یہ ہے کہ حیاتیاتی حقیقت کی تشریح و توجیہہ از کار رفتہ طبیعی نظریہ کی روشنی میں کی جاتی ہے۔

> The present impasse in evolutionary thinking, productive of so many fallacies, is due chiefly to the interpretation of biological fact in terms of outofdate physical theory.[1]

ایک اور ماہرِ حیاتیات چارڈن (Chardin) اپنی کتاب The phenomenon of Man میں تحریر کرتا ہے:

اس کہانی (نظریۂ ارتقا) کی تفصیلات ہمیں کبھی حاصل نہیں ہو سکتیں، خواہ اس باب میں تاریخی نوعیت کی تحقیقات کتنی ہی کیوں نہ کی جائیں، جب تک کہ مستقبل کی سائنس مَعمل میں اس عمل کو دہرانے کے قابل نہ بن جائے۔ ہم شاید اس سلسلے میں کوئی ادنیٰ مادی دلیل

۱؎ انسائیکلوپیڈیا آف اِگنورنس، ص ۲۳۴، آکسفورڈ، ۱۹۷۸ء

بھی نہ پا سکیں کہ ایک خوردبینی جرثومہ ایک سالمے سے کس طرح وجود میں آیا؟ ایک عضوی شے ایک غیر عضوی شے سے کس طرح نمودار ہوئی؟ اور ایک جاندار ماقبل جاندار سے کیوں کر ظہور پذیر ہوا؟

No amount of historical research will ever reveal the details of this story. Unless the science of tomorrow is able to reconstruct the process in the laboratory, we shall probably never find any material vestage of this emergence of the microscopic from the molecular, of the organic from the chemical, of the living from the preliving.[2]

فرانس کا ایک مشہور محقق دونوائے (LECOMTE DU NOUY) اپنی معرکۃ الآرا کتاب Human Destiny میں نظریۂ بخت واتفاق اور ازخود حیات کے نظریہ کو ایک محیرّ العقول حسابی عمل کے ذریعہ باطل قرار دیتے ہوئے صاف کہتا ہے کہ کسی معجزے کا وجود تسلیم کئے بغیر حیاتیاتی مسائل کی توجیہہ ناممکن ہے۔ کیونکہ اس حسابی عمل کے نتیجے میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اتفاقیہ طور پر مختلف عناصر کا ایک خاص ترتیب کے ساتھ اکھٹا ہو کر محض ایک سالمے (molecule) کو تشکیل دینے کے لئے زمین کی موجودہ پوری عمر بھی ناکافی ہے۔ وہ کہتا ہے:

تاہم اگر بالفرض (اس تجربے کے تحت) یہ بات (کسی سالمے کا ظہور) واقع ہو بھی جائے اور ہم امکانات کے قیاس و تخمینے میں بھروسہ کر بھی لیں تو یہ بات ایک معجزے کو تسلیم کرنے کے برابر ہوگی اور نتیجہ ایک واحد سالمہ یا زیادہ سے زیادہ دو یا تین سالمے ہو سکتے ہیں (مگر اس کے آگے زندگی کے بقیہ مسائل کی کوئی توجیہہ نہیں ہو سکتی)۔ اس موقع پر سوال زندگی کا نہیں (وہ تو بہت دور کی چیز ہے) بلکہ سوال محض کسی ایک مادے کا ہے جو زندہ اشیا کو تشکیل دیتا ہے۔ (ظاہر ہے کہ) اس موقع پر ایک سالمے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ (زندگی کو تشکیل دینے کے لئے) سینکڑوں ملین ویسے ہی سالمے ضروری ہیں۔

۲؎ بحوالہ "مصرع الدارونیۃ" (ڈاروینیت کی شکست)، از محمد علی یوسف، ص ۳۶، مطبوعہ جدہ، ۱۴۰۳ھ۔

However, if this happened and we maintained our confidence in the calculus of probabilities it would be equivalent to admitting a miracle, and the result would be : ONE SINGLE MOLECULE, or at most two or three.

Life itself is not even in question but merely one of the substances which constitute living beings. Now one molecule is of no use. Hundreds of millions of identical ones are necessary.[3]

نیز وہ اس سلسلے میں نہایت درجہ قطعیت کے ساتھ مزید تحریر کرتا ہے کہ ہماری موجودہ معلومات کی بنیاد پر غیر ذی حیات دُنیا کی توجیہہ کے لئے جو منہاجِ تحقیق مفید ہے اُس کے مطابق ذی حیات اجسام کی توجیہہ ممکن نہیں ہے۔ بلکہ خود اُن سالموں کی توجیہہ بھی ممکن نہیں ہے جن کے ذریعہ حیات کی تعمیر ہوتی ہے:

In the second place, it has been shown that, on the basis of our present knowledge, namely, by using the same methods which have been proved so useful for the intepretation of our inanimate world, it was impossible to explain, or to account for, not only the birth of life but even the appearance of the substances which seems to be required to build life, namely, highly dissymmetrical molecules.[4]

ایک اور مشہور محقق ڈاکٹر اسیمو (Dr. Issac Asimov) زندگی کے بنیادی مادے ڈی، این، اے (D.N.A. : حیوانی و نباتاتی خلیوں میں موجود ایک خاص کیمیاوی مادہ جس میں اُس نوع کی وراثتی خصوصیات موجود رہتی ہیں) کی پُراسرار ترکیب اور اُس کے پُراسرار عمل پر بحث کرتے

3. Darwin to Einstein, Primary Sources on Science and Belief, P.268, Essex, U.K., 1980.

4. Ibid., P.270.

ہوئے تحریر کرتا ہے کہ یہ پوری دنیائے سائنس کو حیران و ششدر کر دینے والا ایک معمہ ہے۔ بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر صاف صاف کہتا ہے کہ اصلِ زندگی اور مذہبی عقائد کا رشتہ بہت مضبوط ہے۔ اسی بنا پر سائنس داں زندگی اور اُس کے اسرار کی توجیہہ و تشریح بالکل گھٹے گھٹے اور معذرت خواہانہ انداز میں کرتے ہیں :

بغیر ڈی این اے کے زندہ جسیمے دوبارہ وجود میں نہیں آسکتے اور زندگی جیسا کہ ہم جانتے ہیں، شروع نہیں ہوسکتی۔ زندہ مادہ کے تمام مرکبات یعنی انزائم اور دوسرے اجزا، جن کی تیاری میں انزائم کے ذریعہ کیمیاوی تغیر پیدا کیا جاتا ہے، اپنے آخری تجزیہ میں ڈی این اے پر انحصار رکھتے ہیں۔ لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ ڈی این اے کس طرح بنا اور زندگی کیسے وجود میں آئی ؟ یہ وہ سوال ہے جس کے پوچھے جانے پر سائنس ہمیشہ ہچکچاتی ہے۔ کیونکہ اصلِ زندگی کا رشتہ مذہبی عقائد کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ بندھا ہُوا ہے جتنا کہ اصلِ ارض یا اصلِ کائنات کا رشتہ۔ لہٰذا (ان مسائل پر) اب تک جھجک آمیز اور معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا جاتا ہے۔

Without DNA, living organisms could not reproduce, and life as we know it could not have started. All the substances of living matter - enzymes and all the others, whose production is catalysed by enzymes - depend in the last analysis on DNA. How, then, did DNA, and life, start? This is a question that science has always hesitated to ask, because the origin of life has been bound up with religious beliefs even more strongly than has the origin of the earth and the universe. It is still dealt with only hesitantly and apologetically.[5]

یہی محقق مزید تحریر کرتا ہے کہ فرنچ سائنس داں پاسچر (Pasteur) کے تجربات کے باعث ازخود حیات کا نظریہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا ہے :

---

5. Asimov's Guide to Science, Vol.2, The Biological Sciences, PP.172-173, Pelican Books, Middlesex, England, 1978.

Pasteur's demonstration apparently laid the theory of spontaneous generation to rest permanently.[6]

حاصلِ کلام یہ کہ سائنس اور سائنس داں زندگی، اصلِ زندگی اور اُن کے اسرار سے بالکل ناواقف ہیں۔ بالفاظِ دیگر وہ حیات کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ لہٰذا محض قیاس آرائیوں کی بنیاد پر ایک عمارت کھڑی کرنا اور اس کی صحت پر اصرار کرنا صحیح کیسے ہوسکتا ہے ؟ ظاہر ہے کہ جب انسان زندگی کی اصل حقیقت ہی سے واقف نہیں ہے تو پھر اس کی "تبدیلیوں" پر بحث کس طرح کرسکتا ہے ؟ بلکہ اس صورت میں تو اندھیرے میں ہاتھی کو ٹٹول کر اس کا حُلیہ معلوم کرنے والی کہاوت صادق آتی ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ انواعِ حیات میں جس قسم کی تبدیلیوں کا دعویٰ ـــ انتخابِ طبیعی وغیرہ کی بنیاد پر ـــ کیا جاتا ہے، کیا کسی سائنس داں نے ان تبدیلیوں کا نظامِ فطرت میں براہِ راست مطالعہ کیا ہے ؟ یا پھر کسی لیبورٹری میں اس پر تجربہ کرکے کوئی علمی ثبوت فراہم کرلیا ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ ڈارون اور اُس کے پیروؤں نے ارتقائی نقطۂ نظر سے انواعِ حیات کی جو بھی تشریح و توجیہہ کی ہے وہ انواعِ حیات میں پائی جانے والی بعض مُشابہات کی بنا پر چند قیاسات ہیں کہ یہ "قریبی انواع" ایک دوسرے کی "ترقی یافتہ" شکل ہونے کی بنا پر ضرور ایک دوسرے کے بطن سے جنم لی ہوں گی۔ باقی اس سلسلے میں کوئی سائنسی قاعدہ یا قانونِ فطرت یا کوئی تجرباتی و مشاہداتی سند بالکل مفقود ہے۔ اور اس حقیقت کو خود ماہرینِ سائنس بھی مانتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ دو قریبی انواع (species) کے درمیان بھی کسی قسم کی حدِ فاصل قائم کرنا ناممکن ہے، جس طرح کہ ارتقائی تبدیلیوں کا براہِ راست مشاہدہ ناممکن و محال ہے۔ چنانچہ خود جدید ڈاروینیت (New Darwinism) کے ایک کٹر حامی مینارڈ اسمتھ (J. Mynard Smith) ارتقا کے بنیادی عناصر (جین کی تبدیلی، انتخاب اور نقلِ وطن) پر بحث کرتے ہوئے آخر میں یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ارتقائی تبدیلیوں کی براہِ راست جانچ پڑتال ناممکن ہے۔[۷] چنانچہ وہ اپنے مضمون کا آغاز ہی اس حقیقت افروز

6. Ibid., P.174.

جملے سے کرتا ہے کہ ایسی بے شمار چیزیں ہیں جن کے ارتقا کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔

There are a lot of things we do not know about evolution.[8]

نیز وہ کہتا ہے کہ نظریۂ ارتقا بالکل ناقص و ناکافی نظریہ ہے۔

Evolution theory is inadequate.[9]

واقعہ یہ ہے کہ "زندگی" اور اُس کا "پھیلاؤ" ربوبیت کے رازہائے سربستہ میں سے ہیں، جن کی کُنہ و حقیقت تک انسان کبھی نہیں پہنچ سکتا اور ان کی گرہوں کو کسی بھی طرح کھول نہیں سکتا۔ خالقِ کائنات کے یہ پُراسرار تخلیقی راز ہیں جو انسان پر کسی صورت میں مُنکشف نہیں ہو سکتے۔

غرض ارتقا کے بارے میں اب تک ایسی کوئی چیز دریافت نہیں ہو سکی ہے جس کو "قانونِ فطرت" کا نام دیا جا سکے۔ اور اس سلسلے میں اب تک جتنے بھی دعوے کئے گئے ہیں وہ سب بِلا دلیل اور بِلا ثبوت ہیں، جن کی حیثیت قیاسات و مفروضات سے زیادہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ حقائق و واقعات کا مقابلہ محض مغالطوں سے نہیں کیا جا سکتا اور علمی دُنیا اس کو تادیر درست نہیں سمجھ سکتی۔

نظریہ نہیں عقیدہ

اب سوال یہ ہے کہ جب یہ نظریہ علمی اعتبار سے ثابت نہیں ہے تو پھر دُنیائے سائنس کو اس پر اصرار کیوں ہے؟ تو اس کا جواب دو چار الفاظ یا جملوں میں دینا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک لمبی کہانی ہے جس کی بنا پر اہلِ علم دین و مذہب کے مخالف بن گئے اور ان کے پاس مذہب کا "سختی" کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی دوسرا "کارگر" ہتھیار موجود نہیں تھا۔ اور یہ دُنیائے علم کی بہت بڑی بدقسمتی تھی جب کہ اہلِ علم نے مذہبی دائرۂ اثر سے نکل کر آزادانہ طور پر مظاہرِ کائنات اور اُن کے نظاموں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ نظریۂ ارتقا کو عالمگیر طور پر

---

۸ و ۹ دیکھئے انسائیکلوپیڈیا آف اِگنورنس میں موصوف کا مقالہ "نظریۂ ارتقا کی حد بندیاں" The Limitations of Evolution Theory، ص ۲۳۶، مطبوعہ آکسفورڈ، ۱۹۷۸ء

پھیلانے اور اس کو ایک مقبولِ عام نظریہ بنانے کی راہ میں جہاں پر کئی اسباب وعوامل کار فرما نظر آتے ہیں، اُن میں سب سے پہلا اور بُنیادی سبب یہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں کلیسا (Church) کی نادانی کی بدولت جب مذہب اور سائنس کی تاریخی کش مکش عمل میں آئی تو سائنس داں اور اہلِ علم مذہب سے سخت متنفر اور بیزار ہو گئے اور انھوں نے مظاہرِ کائنات کی تشریح وتوجیہہ کے لئے مذہبی اُصولوں کا سہارا لینا چھوڑ دیا۔ اور وہ ایک خالق اور برتر ہستی کے وجود کا اعتراف کئے بغیر ہر چیز کی مادی علت تلاش کرنے لگ گئے۔

انھی رجحانات ومیلانات کے پیشِ نظر ڈاروِن نے بھی انواعِ حیات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ایک منظم فلسفے کی شکل میں اپنی کتاب "اصلِ انواع" (the origin of species) میں کیا، جو پہلی بار ۱۸۵۹ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ ڈاروِن اگرچہ بنیادی طور پر مادہ پرست نہیں بلکہ خدا پرست تھا۔ مگر اُس کی کتاب نے علمی حلقوں میں ایک تہلکہ مچا دیا اور اس کی وجہ سے الحاد ومادیت کو کافی تقویت حاصل ہوئی۔ مادہ پرستوں کو تو گویا کہ ایک متاعِ گمشدہ مل گئی اور وہ اس سے پوری طرح چمٹ گئے۔

غرض اٹھارویں اور انیسویں صدی سے چونکہ اس قسم کی مادہ پرستانہ تحریکیں برابر چل رہی تھیں، اس لئے نظریۂ ارتقا کو ایک مضبوط سہارا سمجھ کر مذہب کے خلاف کُھلم کُھلا علمِ بغاوت بلند کر دیا گیا۔ مگر اس نظریہ کو پھیلانے اور اُس کو عالمگیر طور پر مقبولِ عام بنانے کی راہ میں دوسرا بڑا محرک مادہ پرستوں سے زیادہ اشتراکیوں اور یہودیوں کی خُفیہ تنظیموں یعنی صیہونیت (Zionism) اور ماسونیت (Freemasonary) کا وہ رجحان ہے جو اُن کے قومی اغراض ومقاصد کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ اشتراکیوں کے بارے میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ مذہب دشمنی کی راہ میں ہر قسم کے ذرائع ووسائل استعمال کرتے ہیں۔ اور اُن کے نظام کی بُنیاد ہی مادی فلسفے اور مادی نظریات ہیں۔ اسی طرح یہودی جُنونی اپنی "مطلوبہ" عالمگیر حکومت قائم کرنے کی راہ میں (جس کا خواب وہ ایک عرصے سے دیکھ رہے ہیں) اقوامِ عالم کے دین واخلاق کو پوری طرح بگاڑ کر انھیں نرا حیوان بنا دینا چاہتے ہیں، تاکہ اقوامِ عالم پر اُن کی گرفت مضبوط ہو جائے، جیسا کہ تفصیل آگے آرہی ہے۔ چونکہ یہ نظریہ مذہب کے انکار اور

بے خدائیت کے اثبات کی راہ میں ایک بنیادی عامل اور زبردست محرک کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس کو محض پروپگنڈے کے زور پر شہرت دی جا رہی ہے۔

اس لحاظ سے یہ نظریہ محض ایک قیاس یا مفروضہ ہونے کے باوجود اب محض ایک نظریہ نہیں رہا بلکہ وہ ایک مضبوط "عقیدہ" کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اور اس طرح یہ نظریہ آج مذہبی عقیدے کے خلاف ایک دوسرا عقیدہ بن گیا ہے۔ یعنی خدا پرستی کے مقابلے میں ایک دوسرا متوازی عقیدہ، جس پر غلط انداز میں سائنس کا لیبل چڑھا دیا گیا ہے، تاکہ وہ بادی النظر میں عوام کو لبھا سکے، حالانکہ سائنس کی اصل روح اور اس کے مزاج کے اعتبار سے دنیائے سائنس میں کسی بھی قسم کے عقیدے یا "اندھی عقیدت" کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔ مگر یہ دنیائے علم کی بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ آج سائنسی فکر بھی خالص نہیں رہا بلکہ اس پر مادیت کی چھاپ لگ چکی ہے۔ صحیح سائنسی طرزِ فکر یہ ہے کہ ایک خالص تحقیقی جذبے کے تحت کسی مفروضے کا کھوج لگایا جائے اور اس کے نتیجے میں جو حقیقت و صداقت ہو رہی ہو اُس کا کھلے دل سے اعتراف کر لیا جائے۔

کلیسائی تحکّم کی جگہ مادی تحکّم

غرض اس لحاظ سے اس سلسلے کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ "اہلِ علم" جو اہلِ مذہب کو "متعصب" اور "غیر علمی" نظریات کا حامل بلکہ تاریک خیالات رکھنے والے وغیرہ قرار دیتے دیتے نہیں تھکتے، خود ہی متعصب اور غیر علمی نظریات کے حامل بلکہ سخت جھگڑالو دکھائی دیتے ہیں جو محض ایک مفروضے کو خواہ مخواہ حقیقت ثابت کرنے کی خاطر اپنی ساری توانائیاں صرف کرتے نظر آتے ہیں۔ اور جو لوگ معقول دلائل کی بنا پر ان کے نظریات سے اختلاف رکھتے ہیں یا انہیں ماننے سے انکار کر دیتے ہیں تو ان کے خلاف بلاوجہ ایک محاذ قائم کر کے طوفان برپا کر دیتے ہیں۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ افکار و نظریات کے باب میں جس طرح قرونِ وسطیٰ میں کلیسائی جبر و تحکّم کارفرما تھا بالکل اسی طرح آج علمی دنیا میں مادہ پرستانہ جبر و تحکّم نظر آ رہا ہے۔ گویا کہ مادی آمریت نے کلیسائی آمریت کی جگہ لے لی ہے۔ اور اس طرح آج سارے علمی حلقوں پر مادہ پرستوں کا

غلبہ واستیلا نظر آرہا ہے، جس کی وجہ سے علمی روح مُردہ ہوتی جارہی ہے اور آزاد علمی بحث کا گلا گھونٹا جارہا ہے۔ تاکہ عوام آنکھیں بند کرکے مادہ پرستوں کے "عقائد" پر "ایمان" لائیں۔ اور اس سلسلے میں وہ "سائنس" کو بطور ایک ہتھیار استعمال کررہے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں پروفیسر Duane T. Gish تحریر کرتے ہیں:

سائنسی طبقے اور تعلیمی حلقوں کی اکثریت دوسروں پر اپنے خصوصی نظریات مسلّط کرنے کے لئے سائنس کے لبادے کو (بطور ایک ہتھیار) استعمال کرتے ہیں۔ (اور اس اعتبار سے) قرونِ وسطیٰ کی کلیسائی آمریت کی جگہ عقلیت پسند مادہ پرستانہ آمریت نے لے لی ہے۔ اس طرح (حرّیتِ فکر کے سلسلے میں) دستوری ضمانتوں کی خلاف ورزی کی جارہی ہے اور آزاد سائنسی تحقیق کا گلا اس ادّعائیت پسندانہ کابوس کے تحت گھونٹا جارہا ہے۔

The majority of the scientific community and educational circles are using the clock of "science" to force the teaching of their view of life upon all. The authoritarianism of the Medieval church has been replaced by the authoritarianism of rationalistic materialism. Constitutional guarantees are violated and free scientific inquiry is stifled under this blanket of dogmatism.[10]

اس طرح یہ نظریہ ایک عقیدے کی شکل اختیار کرکے محض تحکّم اور ادّعائیت کے زور پر زندہ ہے، اور اس کو محض اس لئے زندہ رکھا جارہا ہے کہ اس کو ترک کرنے کے بعد "نظریۂ تخلیق" کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ مگر چونکہ مادہ پرست خُدا کا وجود تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، (خواہ استدلالی حیثیت سے اُس کا وجود کتنا ہی بدیہی کیوں نہ ہو) لہٰذا وہ اس غیر ثابت شدہ مفروضے کو حقیقت ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بقول ڈاکٹر دیور (Dewer) جو لوگ اس نظریہ پر ایمان نہیں رکھتے انہیں ایسے علمی اداروں میں جہاں پر مادہ پرستوں کا غلبہ ہو، کسی علمی منصب کے لائق نہیں سمجھا جاتا۔ اور ایسے لوگوں کے مقالات ومضامین کو اخبارات ورسائل بھی

---

۱۰ ملاحظہ ہو کتاب "مَصرع الدّاروینیة" (ڈاروینیت کی شکست) از محمد علی یوسف، ص ۶۵ مطبوعہ دارالشروق جدہ، ۱۹۸۳ء، بحوالہ دی امریکن بیالوجی ٹیچر۔

ردّ کر دیتے ہیں۔ اور اشاعتی ادارے بھی ایسے لوگوں کی کتابیں شائع کرنے سے انکار کر دیتے ہیں[۱۱]۔

اس طرح تاریخ آج اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔ اور آج اہلِ علم مذہب پرستوں کے خلاف ظلم و ستم اور ناحق کوشی کی وہی روش اپنائے ہوئے ہیں جس کے بوجھ تلے کسی دور میں وہ خود دبے ہوئے کراہ رہے تھے۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ۔

ارتقا اور صیہونیت

غرض اس "مقدس مُہم" کو سر کرنے میں سائنٹسٹوں سے زیادہ الحاد پرور لوگ اور ان کی تنظیمیں سرگرم عمل دکھائی دیتی ہیں۔ اور اس مُہم میں اشتراکیت پسندوں نیز یہودیوں اور اُن کی خُفیہ تنظیموں (صیہونیت اور ماسونیت) کا بھی بہت بڑا ہاتھ نظر آتا ہے، جو اپنے قومی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے مذہب اور اُس کے اقدار کو جڑ بنیاد سے اُکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ یہودیوں کے خُفیہ عزائم اور اُن کے معاہدات (Protocols) سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی ایک عالمی حکومت کے قیام کے لئے ــــ جس کا خواب وہ زمانۂ دراز سے دیکھ رہے ہیں ــــ مختلف طریقوں سے تمام دینی و اخلاقی قدروں کو ختم کر کے ان کی جگہ لادینی افکار و نظریات (مادی فلسفوں اور ازموں کی شکل میں) رائج کرنا اور اقوامِ عالم کے مجموعی کردار کو بگاڑنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ نظریۂ اشتراکیت کا بانی کارل مارکس، آزاد جنسی عمل کا علمبردار فرائڈ (Freud) اور اجتماعیات کا مادّی فلسفہ پیش کرنے والا ڈرکایم (Durkheim) یہ تینوں یہودی تھے، جنھوں نے تین مختلف میدانوں میں کام کیا ہے[۱۲]۔

ڈارون اگرچہ یہودی نہیں تھا مگر اس کا نظریہ یہودیوں کی مقصد برآری کے لئے نہایت درجہ اہم تھا اس لئے انھوں نے اس کو فوراً اپنا لیا اور پھر عالمگیر طور پر اس کا پروپگنڈہ شروع کر دیا۔ ڈارون کا نظریہ یہودیوں کے صیہونی مقاصد کی تکمیل کے لئے کس قدر اہم تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے "پروٹوکولس" میں ڈارونزم اور مارکسزم کو باقاعدہ شامل کر کے ان نظریات

---

[۱۱] مصرع الدارونية، ص ٦٢

[۱۲] تفصیل کے لئے دیکھئے محمد قطب کی کتاب "التطوّر والثبات في حياة البشرية"

کی تبلیغ واشاعت کو اپنے ذمہ فرض قرار دے لیا ہے۔ چنانچہ اُن کے پروٹوکولس کا مجموعہ :

The Protocols of the learned elders of Zion

(عالِم اور بزرگ صیہونیوں کے معاہدات) کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا عربی ترجمہ احمد غفور عطار نے "بروتوکولات صہیون[۱۳]" کے نام سے کیا ہے، جس کے تیسرے پروٹوکول میں اس طرح مذکور ہے:

قویم[۱۴] عجز کے اُس درجہ تک پہنچ گئے ہیں کہ تفکیر نے اُنہیں ہماری علمی رایوں کے دائرہ سے باہر کر دیا ہے۔ لہٰذا وہ اس حقیقتِ حال تک پہنچنے سے عاجز ہیں جس کی ضرورت تک ہم رسائی پاچکے ہیں یعنی جو مملکت ہم قائم کرنے والے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کی طرف ہم پوری توجہ صرف کر رہے ہیں، کیونکہ یہی علم حق ہے اور تمام علوم کے درمیان اسی پر سب سے زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہی وہ علم ہے جس کو مدرسوں میں صحیح طور پر پڑھایا جانا ضروری ہے۔ ہاں تو وہ انسانی زندگی اور اُس کے اُصولوں کا علم ہے، جو مراتب اور طبقات کے لحاظ سے تقسیمِ عمل اور تقسیمِ قوم کا مطالبہ کرتا ہے۔......
اب رہا معاملہ علم کی موجودہ حالت اور اُس منہج کی بات کا جو ہماری جانب سے اخذ و استفادہ کی غرض سے دی جاسکتی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ عام لوگ جو جاہل ہوتے ہیں وہ ان تمام مطبوعہ باتوں اور وہمی تصورات پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آئیں گے، جن کو ہم نے اُن کے ذہنوں میں پھونک مار کر بٹھا دیا ہے۔ اور وہ اپنے سے اعلیٰ تر تمام طبقات کے خلاف شدید نفرت رکھے گا۔ کیونکہ وہ ہر طبقے کی قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔

وقد بلغ العجز بالقوييم حدا أفقدهم التفكير فيما هو خارج عن

---

[۱۳] لفظ ZION جس کو عربی میں صہیون اور اُردو میں عموماً صیہون کہا جاتا ہے، یروشلم کے ایک پہاڑ کا نام ہے، جس پر شہر داؤد بسایا گیا تھا۔ اور یہ یہودیوں کی زندگی اور ان کی عبادت کے لئے ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ لفظ صیہونی اور صیہونیت اسی کی طرف منسوب ہیں۔

[۱۴] یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے، جو غیر یہودیوں کو خنزیر، بہائم، کافر اور نجس ظاہر کرنے کے لئے یہود کے مقدس صحیفوں اور خصوصاً ان کی کتاب شریعت تلمود میں بولا گیا ہے۔ گویا جس طرح برہمن اپنے علاوہ سب کو "ملیچھ" سمجھتے ہیں، اسی طرح یہودی بھی اپنی قوم کے سوا دُنیا کی تمام اقوام کو نجس و ناپاک قرار دیتے ہیں۔

نطاق آرائنا العلمية، فهم أعجز من أن يُدركوا ما ندرك من الحاجة الى احداث ما سنحدثه عن قيام مملكتنا، وهذا هو ما نوليه كل اهتمامنا، لأنه هو وحده العلم الحق بين سائر العلوم وأولى من سواه بالعناية اذ هو العلم الذي يجب أن يعلّم في المدارس تعليما صحيحا، ألا هو علم حياة الانسان وأصوله الاجتماعية الذي يتطلب توزيع العمل ثم تقسيم الشعب الى مراتب وطبقات۔

.... اما في حالة العلم الحاضرة والمنهج المسموح به من قبلنا للاتباع والأخذ به نرا الجمهور الجاهل المؤمن ايمانا أعمى بالكلمات المطبوعة وبالتصورات الوهمية التي نفثناها في ذهنه يحمل الضغينة لجميع الطبقات التي يظن أنها أرفع منه، وذلك لأنه غير مدرك قيمة كل طبقة [16]

یہ اقتباس بطور ایک تمہید ہے، جس سے یہودیوں کے عزائم پر تھوڑی سی روشنی ڈالنی مقصود تھی۔ اب ملاحظہ ہو اسی مجموعے کے ایک دوسرے پروٹوکول میں زیرِ بحث موضوع سے متعلق یہ حقیقت کہ کس طرح ڈارون، مارکس اور نیٹشے وغیرہ کے فلسفوں کو بنیاد بنا کر دین و مذہب کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کا اظہار کیا گیا ہے:

تم یہ مت سمجھو کہ ہماری یہ باتیں طفلانہ اور کھوکھلی ہوں گی۔ غور کرو اور ڈارون، مارکس اور نیٹشے کی کامیابی کو یاد رکھو۔ ہم نے ہی تو انہیں کھوج نکالا ہے۔ اور تم سب خوب جانتے ہو کہ ان ادکار کی زہرناکیوں کا اثر گوییم (غیر یہودی بلیچھوں) کے اخلاق اور اُن کی عقلوں پر کتنا ہے! اور یہ بات اس لئے بھی ضروری ہے کہ غلطی ہماری سیاست اور ہمارے تنظیمی عمل میں داخل نہ ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم پوری دقت اور توجہ کے ساتھ قوموں کی آراء، اُن کے اخلاق اور اُن کے میلانات کا مُطالعہ

[16] بروتوکولات صهيون، أحمد عبدالغفور عطار، ص ۴۷ - ۴۸، مکہ مکرمہ، ۱۹۷۶ء

کریں اور ہمارے اُس منصوبے کی کامیابی سے واقفیت رکھیں، جس کے اجزا مختلف حیثیتوں کے حامل ہوں، اس طرح کہ اُس کا ہر جزو قوموں کے حالات میں سے کسی ایک واقعہ کے مطابق ہو اور وہ ہمارے راستے میں عملی تطبیق کے لئے ماضی کے تجربے کے پیش نظر موجودہ تقاضوں کے مطابق ایک اساس بن سکے۔

لا تظنوا أن أقوالنا هذه ثرثرة جوفاء، تفكروا واذكروا نجاح دارون وماركس ونتشه، فنحن الذين أوجدناهم، وتعلمون جميعا ما كان لسموم هذه المذاهب من أثر فى اخلاق القويم وعقولهم، ولكيلا يتدسّس الخطأ الى سياستنا وعملنا الادارى يجب أن ندرس بدقة وعناية آراء الشعوب واخلاقها وميولها، ويقف نجاح خطّتنا التى يجب أن تشتمل أجزاؤها مختلف النواحى بحيث يصب كل جزء ناحية منها وفقاً لأوضاع الشعوب الواقعة فى طريقنا على اتخاذ أساس فى تطبيقها العلمى تقوم عليه تجربة الماضى المطبقة بحسب مقتضيات الحاضر[۱۷]

اسی طرح اس کتاب میں ایک اور جگہ مذکور ہے کہ: ڈاروِن یہودی نہیں ہے، لیکن ہم نے جان لیا ہے کہ اُس کی آراء کو وسیع پیمانے پر کس طرح پھیلائیں اور دین کو تباہ کرنے کی راہ میں اس سے کس طرح فائدہ اُٹھائیں۔

ان دارون ليس يهوديا، ولكننا عرفنا كيف ننشر آراءه على نطاق واسع ونستغلها فى تحطيم الدين[۱۸]

نیز اسی طرح ان پروٹوکولوں میں تعلیم، صحافت اور علم کی اشاعت گاہوں پر قبضہ کرکے

---

[۱۷] بروتوكولات صهيون، ص ۴۱

[۱۸] بحوالہ "مصرع الداروينية"، ص ۶۱، مطبوعہ جدہ

انہی اپنی مقصد برآری کے لئے استعمال کرلے اور مختلف طریقوں سے عوام کو گمراہ کرکے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی راہ میں عجیب و غریب انکشافات موجود ہیں، جن کے مطالعہ سے آنکھیں کھل جاتی ہیں کہ اس وقت دُنیا میں عالمگیر پیمانے پر قومی، نسلی، طبقاتی، لسانی، معاشی، ثقافتی، جغرافیائی، سیاسی، دربین الاقوامی جو بھی بدامنیاں اور بے چینیاں پائی جا رہی ہیں اُن کے پھیلانے میں بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر صیہونیت اور ماسونیت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس کتاب پر حسبِ ذیل نوٹ موجود ہے:

"عالم اور بزرگ صیہونیوں کے معاہدات" ایک پُرفریب دستاویز ہے جو مخالف یہودیت کے لئے حیلہ واستدلال بہم پہنچاتی ہے۔ یہ دستاویز ۲۴ مجلسوں کے سلسلوں کی ایک رپورٹ پر مشتمل ہے جو ۱۸۹۷ء میں سوئٹزرلینڈ کے مقام باسل میں پہلی صیہونی کانگرس کے موقع پر منعقد ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر یہودیوں اور ماسونیوں نے مسیحی تہذیب کو منتشر کرکے اپنی ایک مشترکہ عالمی ریاست قائم کرنے کے منصوبے بنائے۔ حریت پسندی اور سوشلزم دُنیائے مسیحیت کو تہہ و بالا کرنے کے لئے ذرائع قرار دیئے گئے۔ اگر تخریب کاری ناکام ہوجائے تو یورپ کے تمام دارالسلطنتوں کو تباہ کردیا جائے۔

Protocols of the learned Elders of Zion, fraudulent document that served as a pretext and rationale for anti-Semitism. The document purports to be a report of a series of 24 (in other versions, 27) meetings held at Basel, Switz., in 1897, at the time of the first Zionist congress. There Jews and Freemasons were said to have made plans to disrupt Christian civilization and erect a world state under their joint rule. Liberalism and socialism were to be the means of subverting Christiandom; if subversion failed, all the capitals of Europe were to be sabotaged.[19]

اس کتاب کی اشاعت پہلی بار ۱۹۰۳ء میں ہوئی تھی۔ پھر اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں

۱۹ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (خورد): ۲۵۳/۸، ۱۹۸۳ء

اگرچہ اس دستاویز کے جعلی ہونے کا بھی دعویٰ کیا گیا ہے[20]۔ مگر ظاہر ہے کہ یہودیوں نے اپنا بھانڈا پھوٹ جانے کے بعد اپنی خفت مٹانے کے لئے اس قسم کی کوشش کی ہوگی۔

غرض یہ کتاب کیا ہے یہودیوں کے عزائم اور اُن کے ناپاک منصوبوں کو طشت از بام کرنے والی ایک حیرت انگیز دستاویز ہے۔ یہ کتاب جس کا عربی ترجمہ "بروتوکولات صہیون" کے نام سے کیا گیا ہے، اُس کا ایک نسخہ ۱۹۵۱ء میں کسی طرح حکومتِ مصر کے ہاتھ لگ گیا، جس کو اُس نے پانچ سو پونڈ کے عوض میں خریدا۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس وقت پُوری دُنیا میں اس کے صرف تین ہی نسخے باقی رہ گئے تھے۔ اور مصری حکومت کے ہاتھ لگا ہُوا یہ نسخہ پورے مشرقِ وسطیٰ میں واحد نسخہ تھا[21]۔

میرا موضوعِ بحث اس وقت چونکہ نظریۂ ارتقا کے افسانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت آدم علیہ السلام کی ابوالبشریت کا اثبات کرنا ہے، اس لئے اس وقت اتنی ہی وضاحت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ مذکورۂ بالا مباحث سے اس خود ساختہ نظریہ (نظریۂ ارتقا) کا مقصد اور اس کا حقیقی پس منظر ظاہر ہوگیا اور یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ اس مفروضے کو سائنس کے پردے میں زبردستی ایک علمی حقیقت قرار دے کر تحکمانہ طور پر اس کو منوانے کی کوشش کی جارہی ہے، اور اس کو ایک دودھاری تلوار بنا کر پیش کیا جارہا ہے، تاکہ اس کے ذریعہ جہاں ایک طرف خالقِ کائنات کا انکار کیا جاسکے تو دوسری طرف مذہب واخلاق کے بچے کھچے نقوش وآثار کو بھی کھرچ کر پھینک دیا جاسکے۔ جب کہ یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ایک بے بنیاد نظریہ ہے، جس کی حیثیت لکڑی کی ایک تلوار سے زیادہ نہیں ہے۔

---

[20] دیکھئے میکملن انسائیکلوپیڈیا، ۱۹۸۱ء

[21] بروتوکولات صہیون، ص ۸، مکہ مکرمہ، ۱۹۷۶ء

دوسرا باب

نظریۂ ارتقا اور ماقبل آدم مخلوق

چند اسلامی عقائد اور جدید اکتشافات کا ایک جائزہ

تورات کی غلط بیانی

تورات (بائبل کے موجودہ عہدنامۂ قدیم) کے مطابق ظہورِ آدم اب سے کوئی چھ ہزار سال پہلے ہوا ہے۔ ڈاکٹر موریس بوکائی کی تحقیق کے مطابق تورات کی رُو سے چار ہزار سال قبلِ مسیح حضرت آدمؑ کی تخلیق عمل میں آئی تھی[1] جس کو اُنھوں نے حقیقت واقعہ سے بہت دُور قرار دیا ہے۔ واضح رہے کہ خود مسلمان مؤرخین نے بھی یہودیوں کے ان ادّعائی بیانات پر تنقید کی ہے۔ چنانچہ علامہ ابنِ اثیر نے اپنی تاریخ میں یہودیوں کے اس بیان کو اُن کا محض ایک دعویٰ قرار دیا ہے کہ تخلیقِ آدم سے ہجرت تک ۴۶۴۲ سال ہوتے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس یونانی نصاریٰ کا دعویٰ ۵۹۹۲ سال ہے۔[2] اس سلسلے میں علامہ ابنِ کثیر نے بڑے پتے کی بات بیان کی ہے کہ

---

1. The Bible, the Quran and Science, P. 31, Karachi.

[2] الکامل فی التاریخ، ۱/۱۴، مطبوعہ دار صادر بیروت، ۱۴۰۲ھ

تورات میں تاریخ اور سنین کے بارے میں جو غلطیاں واقع ہوئی ہیں اُس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شاید بعد والوں نے بطورِ تفسیر داخل کر دی ہوں گی جو اصل سے زائد ہیں۔[۳۱]

جدید اثری اکتشافات

اس طرح مسلمان مؤرخین کے نزدیک بائبل کے ان بیانات کی حیثیت پہلے ہی سے مشکوک رہی ہے۔ مگر جدید اثری تحقیقات archaeological discoveries، علم الانسان anthropology اور علمِ اُحفوریات Paleontology کے تحت منظرِ عام پر آنے والے نئے نئے اکتشافات کی بنا پر اس قسم کے واقعات کی تاریخی حیثیت کو جھٹلایا اور چیلنج کیا جا رہا ہے کہ انسان کا وجود رُوئے زمین پر صرف چند ہزار سال سے نہیں بلکہ لاکھوں سالوں سے ہے۔ نیز یہ کہ انسان بائبل یا قرآن کے مُطابق کسی تخلیقِ خصوصی کی بنا پر یکبارگی یا ناگہاں طور پر نہیں بلکہ لاکھوں سال کے تدریجی ارتقا کے تحت ظاہر ہُوا ہے۔ اور اس کے ثبوت میں زمین سے برآمد ہونے والے بعض ناقص ڈھانچے اور اُحفوری آثار fossils وغیرہ پیش کئے جاتے ہیں جو انسانی شکل و صُورت سے کچھ مشابہت رکھتے ہیں۔ اور ان کو اُحفوری انسان fossil man بھی کہا جاتا ہے۔ اور اس قسم کے آثار و باقیات کو بنیاد بنا کر کہا جاتا ہے کہ انسان کسی خالق Creator کی کرشمہ سازیوں کی بنا پر یکبارگی پردۂ خفا سے ظاہر نہیں ہو گیا بلکہ اپنے مُورثِ اعلیٰ بوزنہ (لمبے ہاتھ والا بے دُم کا بندر، جس کو انگریزی میں ape کہا جاتا ہے، مثلاً چمپنزی اور گوریلا وغیرہ) سے ارتقائی طور پر بتدریج ترقی کرتے کرتے موجودہ شکل میں نمودار ہُوا ہے۔

اس طرح یہ دونوں بیانات اور دعوے افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اگرچہ دورِ آدم متعیّن تو نہیں ہے، یعنی قرآن اور حدیث میں کہیں بھی دورِ آدم کا تعیّن نہیں کیا گیا ہے، مگر وہ لاکھوں سال تک پھیلا ہُوا بھی نہیں ہو سکتا۔ تورات کا بیان اگرچہ کچھ غلط سہی، مگر پھر بھی اس کو بہت زیادہ انحراف نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ " علم الانسان " کی رُو سے

---

[۳۱] البدایہ والنہایہ، ۹۶/۱، مکتبۃ المعارف بیروت، ۱۴۰۴ھ

" جدید انسان " modern man کا دور اب سے کوئی دس ہزار سال پہلے شروع ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ ثابت کیا جائے گا " جدید انسان " کے اولین نمائندہ پر " آدم " کا اطلاق بخوبی ہو سکتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس " اُحفوری انسان " پر اس کا اطلاق مشکوک اور غیر یقینی ہے۔

ایک وضاحت

اس مسئلے پر قرآنی نقطۂ نظر سے بحث شروع کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُحفوری انسان fossil man سے متعلق جدید ترین اثری تحقیقات کا ایک خلاصہ بطور تمہید پیش کر دیا جائے، جس کی تفصیل مع حوالوں کے آگے آ رہی ہے۔ تاکہ ان مسائل اور ان کی نوعیت کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ اور یہ مباحث زیادہ تر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۳ء) سے ماخوذ ہیں۔

مگر آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت کر دینا بہت ضروری ہے کہ علم الانسان anthropology اور علم اُحفوریات یعنی زمین کے اندر گڑے ہوئے حیوانات و نباتات کے متحجر آثار یا رکازات کا علم paleontology آج وسیع علوم بن چکے ہیں اور ان علوم کی اپنی وضع کردہ اصطلاحات ہیں، جن کا تذکرہ کر کے بحث کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا ان اصطلاحات کو نقل کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اپنے اعتقاد یا حقیقتِ واقعہ کے بھی عین مطابق ہیں۔ بلکہ بدرجۂ مجبوری ایسا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً " اُحفوری انسان " یا " جاوا کا تحتی انسان " the ape man of Java وغیرہ کو اسلامی نقطۂ نظر سے " انسان " یا " آدمی " کہنا قطعاً درست نہیں ہے۔ کیونکہ انسان یا آدمی نام ہے اُس فردِ خاندان کا جس کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے چلا تھا۔ مگر مجھے جہاں کہیں بھی موقع ملا اس کے لئے میں نے اپنی طرف سے ایک نئی اصطلاح " ماقبل آدم مخلوق " کی پیش کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ قابلِ قبول ہو سکے۔ مگر جہاں کہیں جدید اصطلاحات آ ہی گئی ہیں تو وہ بطور مجبوری ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وضاحت کے بعد کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہئے۔

ارتقا پسندوں کے دعوے

طبقات الارض geology کی تحقیقات کے سلسلے میں برآمد ہونے والے بعض

آثار و باقیات remains کی بنیاد پر ماہرینِ آثارِ قدیمہ اور ماہرینِ اُحفوریات یا رکازات paleontologists یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ انسان، کا مُورثِ اعلیٰ بوزنہ ape یعنی چمپنزی اور گوریلا وغیرہ تھا۔ چنانچہ ان چار پیروں والے بندروں میں لاکھوں سال تک بتدریج ارتقا ہوتا رہا، حتیٰ کہ دو پیروں پر چلنے والی ایک نئی نوع species برآمد ہُوئی جو صُورت شکل کے اعتبار سے اُسی "بوزنہ خاندان" سے تعلق رکھنے والی تھی مگر وہ انسان کی طرح دو پیروں پر چل سکتی تھی، مگر قدرے جُھک کر۔ اس نوع کو راماپیتھی کس ramapithecus کا نام دیا گیا ہے۔ اور پھر اس کے بعد اس کی کچھ مزید "ترقی یافتہ" نوع کو آسٹرالوپیتھی کس australopithecus کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اسی طرح پھر کئی لاکھ سال کے ارتقا کے بعد اس میں مزید سُدھار ہُوا اور سیدھا چلنے والی ایک اور نوع کا ظہورِ عمل میں آیا جس کو "تحت الانسان" یا Homo Erectus (سیدھا چلنے والا انسان) کہا جاتا ہے۔ مگر بتایا جاتا ہے کہ اس میں بھی کسی قدر کبڑا پن ضرور تھا۔ نیز اس کے بارے میں یہ بھی قیاس ہے کہ وہ غالباً گونگا تھا۔ لیکن اس نوع کا دماغ اپنی سابقہ انواع سے بڑا تھا اور وہ پتھر کے اوزار کا استعمال جانتا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ "جاوا کا تحتی انسان" the ape man of Java اور "ہائیڈل برگ انسان" heidelberg man وغیرہ کا تعلق اسی نوع سے تھا۔ یہ دو مشہور "اُحفوری انسانوں" کی قسمیں ہیں جو بالترتیب جاوا اور جرمنی میں دریافت ہُوئیں۔ غرض اسی طرح پھر مزید لاکھوں سال کے ارتقا کے بعد موجودہ انسان سے یک گونہ قریبی تعلق رکھنے والی ایک اور نئی نوع کا ظہور ہُوا جس کو ھوموسیپئینس homo sapiens (ذہین انسان) کا نام دیا گیا ہے، یہ دماغ میں اپنی سابقہ انواع سے بڑا تھا اور شکار کھیلتا نیز مختلف اوزار بنانا جانتا تھا۔ اس نوع کی دو معدوم شدہ قسمیں "نیندرتھل انسان" neanderthal man اور "کرومیگنن انسان" cro-magnon man بہت مشہور ہیں۔ قسمِ اول کا ڈھانچہ مغربی جرمنی کے ایک مقام نیندرتھل میں اور قسمِ دوم کا ڈھانچہ فرانس کے ایک غار کرومیگنن میں پہلی مرتبہ ملا تھا۔ اسی بنا پر ان کو یہی نام دے دیا گیا ہے۔

مذہب کے لئے ایک نیا چیلنج

اسی طرح زمین کی کھدائی سے یورپ، ایشیا اور افریقہ کے مختلف مقامات سے بہت سے اور مختلف قسم کے اُحفوری نمونے یا رکازات fossils جو زیادہ تر دانتوں، جبڑے کی ہڈیوں اور کھوپڑی کے ٹکڑوں کی شکل میں ہونے کی وجہ سے نامکمل "ڈھانچے" کہلاتے ہیں، دن بدن اور مسلسل برآمد ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ان مختلف آثار اور نمونوں کی شکل و صورت کا تعین ان اجزا کے ذریعہ کیا جا رہا ہے اور ان کی عمروں اور ان کے ادوار کا پتہ مختلف طریقوں سے چلایا جا رہا ہے۔ پھر انہیں مختلف انواع species میں بانٹ کر ارتقا evolution کی کڑیاں دریافت کی جا رہی ہیں۔ ان دریافت شدہ آثار اور جزئی ڈھانچوں کی رُو سے چونکہ ان میں سے بعض نمونے موجودہ انسان سے ملتے جلتے ہیں اس بنا پہ قیاس کیا جا رہا ہے کہ انسان کا وجود رُوئے زمین پر چونکہ لاکھوں سال سے ہے لہٰذا ظہورِ آدم کی مدت کو چند ہزار سال پہلے قرار دینا کسی بھی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ اور پھر مادہ پرست اس سے ایک اور نتیجہ یہ بھی نکالتے ہیں چونکہ نوعِ انسانی کے ظہور کے تعلق سے "مذہب" کا یہ بیان قطعاً غلط ہے اس لئے مذہب کی اصل بھی غلط ہے۔ یعنی مذہب بجائے خود صحیح اور واقعی نظریات کی بنیادوں پر قائم نہیں بلکہ محض چند اوہام و خرافات یا بعض خود غرض انسانوں کے گھڑے ہوئے نظریات کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا مذہب کی کوئی حقیقت نہیں ہو سکتی۔

یہ ہے موجودہ دور کا وہ اہم ترین مسئلہ جس نے نہ صرف عیسائی اہلِ علم کو بوکھلا دیا ہے بلکہ بعض مُسلم علماء اور دانشوروں کو بھی شک و شبہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ چنانچہ اب آدم کی متعین شخصیت اور اس کی قطعیت کے بارے میں بعض مذہبی حلقے عام طور پر ارتیابیت اور بے یقینی کا شکار ہو چکے ہیں۔ عیسائی دُنیا میں تو اس نئی صورتِ حال کے مقابلے کے لئے کوئی دم خم ہی باقی نہیں رہ گیا ہے۔ کیونکہ اپنے ناکافی بیانات کے باعث نئے مسائل اور گرہوں کو کھولنے کی راہ میں وہ کوئی بھی تشفی بخش مواد یا رہنمائی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تورات اور انجیل محض عارضی اور موقت صحیفے تھے جو محض اپنے ادوار کی رہنمائی کے لئے نازل ہوئے تھے۔

جدید چیلنج کا جواب قرآن میں

اب اس کے برعکس قرآنِ مجید ہی وہ واحد اور سدابہار صحیفۂ ربانی ہے جو ہر دور کے پیدا شدہ مسائل کا جواب دے سکتا ہے اور ہر دور میں پیدا ہونے والے پیچیدہ مسائل اور معمّوں کو کھول سکتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآنِ حکیم کو تمام کتبِ سماویہ کا "مُهَيمن" یعنی نگران و محافظ قرار دیا گیا ہے:

وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ : ہم نے تجھ پر وہ کتاب اُتاری ہے جو اگلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور ان پر نگران ہے۔ لہٰذا تو اللہ کے نازل کردہ (حکم) کے مطابق اُن کے درمیان فیصلہ کر۔ (مائدہ : ۴۸)

نیز اس کتابِ حکمت کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ پوری نوعِ انسانی کے لئے ہدایت اور علمی دلائل سے بھرپور کتاب ہے جو انسان کی سبق آموزی کے لئے مختلف اسالیب میں بیان کئے گئے ہیں :

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ : یہ لوگوں کے لئے نامۂ ہدایت اور (حق و باطل میں) فرق و امتیاز کے دلائل سے پُر ہے۔ (بقرہ : ۱۸۵)

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا : اور ہم نے اس قرآن میں (مختلف مضامین) پھیر پھیر کر بیان کئے ہیں تاکہ وہ چونک سکیں۔ (اسراء : ۴۱)

اسی بنا پر ارشاد ہے کہ یہ حیرت انگیز صحیفہ ایک دانش مند اور ہمہ دان ہستی کی طرف سے نازل کیا گیا ہے :

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ : اور تم اس قرآن کو یقیناً ایک حکمت والی اور ہمہ دان ہستی سے حاصل کر رہے ہو۔ (نمل : ۶)

قرآن مجید کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ نوعِ انسانی کے درمیان برپا ہونے والے اختلافات کے درمیان کلامِ فیصل بنے۔ جیسا کہ اس کے بارے میں ارشادِ ربّانی ہے :

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰٮكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنۡ لِّلۡخَآٮِٕنِيۡنَ خَصِيۡمًا : یقیناً ہم نے تیرے پاس یہ کتاب سچائی کے ساتھ بھیج دی ہے تاکہ تو (اس کی روشنی میں) اللہ کی فہمائش کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرسکے۔ اور تو (علمی) خیانت کرنے والوں کا وکیل مت بن۔ (نساء : ۱۰۵)

وَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ‌ۙ وَهُدًى وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ : اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب اسی لئے اُتاری ہے کہ تو اُن لوگوں کے سامنے وہ بات کھول کر بیان کردے جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اور (اس طرح) وہ اہلِ ایمان کے لئے ہدایت و رحمت بن سکے۔ (نحل : ۶۴)

اس اعتبار سے قرآنِ حکیم ایک زندہ اور ابدی کتاب ہے، جس میں قیامت تک پیش آنے والے تمام مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اور قرآنی علم رکھنے والے علماء اور اہلِ بصیرت اس کے معانی و مطالب کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرکے جدید مسائل کا حل نکال سکتے ہیں جس کے ذریعہ عالمِ انسانی کی رہنمائی ہو۔ اس طرح قرآنِ حکیم کے معجزہ ہونے کی حقیقت اور اُس کے اعجاز کے نئے نئے پہلو بھی ظاہر ہوتے رہیں گے۔

لہٰذا قرآن زیرِ بحث مسئلے کو تشفی بخش طور پر حل کردے تو پھر اُس کی صداقت و سچائی اور ابدیت و عالمگیری میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ بغیر خدائی رہنمائی کے ہزاروں سال پہلے ایسی کوئی کتاب پیش کردینا ناممکن ہے جو مستقبل کے تعلق سے ہر دور کے مسائل کا صحیح صحیح حل پیش کردے! اس لحاظ سے قرآنِ حکیم یقیناً کتابِ الٰہی ہے، جس کا مزید انکار اب بہت بڑی محرومی اور بدنصیبی کی بات ہوگی۔ بہرحال آئیے اب دیکھیں قرآن اس مسئلے کو کس نظر سے دیکھتا ہے اور اس کا کیا حل پیش کرتا ہے؟

نظریۂ ارتقا کی عالمگیری

واقعہ یہ ہے کہ آج نظریۂ ارتقا اور اُس سے متعلق مسائل نے ایک عالمگیر شکل اختیار کرلی

ہے۔ اور یہ مسائل اس وقت پوری نوعِ انسانی کے ذہنوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ ہر طرف سوال و جواب کا بازار گرم ہے۔ دعووں اور جوابی دعووں کی بھرمار ہے۔ نزاعی بحثوں کا ایک انبارِ عظیم وجود میں آچکا ہے۔ نصابی کتابیں ان مسائل سے بھری ہوئی ہیں جو نئی نسلوں کے ذہنوں پر اثرانداز ہو رہی ہیں۔ اور اس نظریہ کی چھاپ اس وقت دُنیا کے ہر علم و فن پر نمایاں نظر آرہی ہے۔ لہٰذا یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ اس مسئلے نے علمی حلقوں کے سامنے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے۔ اور اس اعتبار سے پوری نوعِ انسانی اس وقت حیراں و سرگرداں ایک دوراہے پر کھڑی نظر آرہی ہے۔ لہٰذا اس مسئلے میں مذہب کی طرف سے صحیح رہنمائی نہ ملنے کی صورت میں الحاد و لادینیت کو مزید تقویت ملے گی اور دین و مذہب کو ہمیشہ کے لئے ناکام قرار دے دیا جائے گا۔

اسلام کی رہنمائی

لہٰذا ضروری ہے کہ اسلام جیسے سچے اور ابدی دین کی طرف سے اس سلسلے میں واضح اور تسلّی بخش جواب دیا جائے، جو اُس کی جامعیت و کاملیت کا ثبوت ہو۔ اسی جذبے کے تحت یہ سطور تحریر کی جارہی ہیں۔ چنانچہ قرآنِ حکیم کے سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ وہ کسی حقیقتِ واقعہ سے انکار یا اس سے آنکھیں بند کر لینے کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ حقائق سے مقابلہ کرنے یا حقیقت پسندی سے کام لینے کی دعوت دیتا ہے، جو دیگر تمام مذاہب کے مقابلے میں ایک نرالی دعوت ہے۔ بلکہ وہ تو علمی تحقیق پر نہ صرف اُبھارتا ہے بلکہ مختلف طریقوں سے اس کی ہمت افزائی بھی کرتا ہے، تاکہ نوعِ انسانی دُنیا بھر کی چیزوں کا جائزہ لے کر حقائق کا کھوج لگائے اور پھر مذہب کے بُنیادی تصورات و تعلیمات سے ان کا مقابلہ کر کے سچائی معلوم کرے۔ خود زیرِ بحث مسئلے کو لیجئے کہ حیات کا آغاز کیسے ہُوا اور انسان کی تخلیق کس طرح عمل میں آئی؟ اس باب میں دیکھئے کہ وہ کتنے زوردار طریقے سے بنی نوعِ انسان کو دعوتِ فکر اور دعوتِ تحقیق دیتا ہے:

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ: کہہ دو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو تو سہی کہ تخلیق کا آغاز کس طرح ہُوا؟ (عنکبوت: ۲۰)

نیز وہ مزید کہتا ہے کہ انسانوں کی خلقت اور مختلف انواع species اور خاص کر حیوانات کے زمین میں انتشار اور پھیلاؤ میں یقین کرنے والوں کے لئے خلاقِ فطرت کی جانب سے علمی دلائل ودیعت کر دیئے گئے ہیں:

وَفِیۡ خَلۡقِكُمۡ وَمَا یَبُثُّ مِنۡ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ : تمہاری خلقت اور حیوانات کے پھیلاؤ میں یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں موجود ہیں۔ (جاثیہ: ۴)

وَمِنۡ اٰیٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَثَّ فِیۡهِمَا مِنۡ دَآبَّةٍ : اور اُس کے وجود کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور ان دونوں میں (مختلف) جانداروں کو پھیلا دینا۔ (شوریٰ: ۲۹)

نیز اسی طرح وہ کہتا ہے کہ انسان کی عبرت و بصیرت کے لئے حیوانات و نباتات وغیرہ ہر چیز میں جوڑے جوڑے بنائے گئے ہیں تاکہ وہ خالقِ کائنات کی خلاّقیت کا مشاہدہ کر سکے:

وَمِنۡ كُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ : اور ہم نے ہر چیز میں نر و مادہ بنائے ہیں تاکہ تم چونک سکو۔ (ذاریات: ۴۹)

اس قسم کی بے شمار آیتیں موجود ہیں جن کے ذریعہ انسان کو مختلف علمی و سائنسی میدانوں میں تجربہ و مشاہدہ کر کے ابدی صداقتوں کا پتہ لگانے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس لحاظ سے علمی و سائنسی تحقیقات و اکتشافات قرآنی منشا و مقصد ہی کے عین مطابق ہیں اور اس اعتبار سے جدید سے جدید تحقیقات و اکتشافات قرآن کی ابدی تعلیمات کو متاثر نہیں کر سکتے۔ ورنہ وہ اس کی دعوت ہرگز نہ دیتا۔ چونکہ قرآن اور کائنات دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے لہٰذا ان دونوں میں تعارض و تضاد کبھی نہیں ہو سکتا۔

قرآنِ حکیم نے یہ طریقہ علمی اعتبار سے نوعِ انسانی پر حجت قائم کرنے کی غرض سے اختیار کیا ہے۔ کیونکہ خلاّقِ فطرت نے اس عالمِ رنگ و بو کے مظاہر کی تخلیق کچھ اس ڈھنگ سے کی ہے کہ ان میں غور و فکر کے باعث اُس کے کلامِ ابدی کی صداقت نمایاں ہو جائے۔ اسی لئے ارشاد ہے:

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ :

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو (اور اسی طرح ان میں موجود اشیاء کو) حقانیت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یقیناً اس باب میں اہلِ ایمان کے لئے ایک بڑی نشانی موجود ہے۔ (عنکبوت: ۴۴)

اس اعتبار سے کتابِ الٰہی کے نصوص اور اُس کے اشارات کی روشنی میں تحقیقاتِ جدیدہ کی بہتر سے بہتر توجیہہ کی جا سکتی ہے۔ اور اس طرح خود کتاب اللہ کی عظمت بھی ظاہر ہوگی کہ اس میں دُنیا بھر کے تمام علمی حقائق کو سمیٹ لینے کی استعداد پُوری طرح رکھ دی گئی ہے۔ مگر اس سلسلے میں دو شرطیں ہیں: پہلی یہ کہ علمی وتحقیقی اعتبار سے یا دوسرے لفظوں میں تجربہ و مشاہدہ کی رُو سے ثابت شدہ حقائق ہوں، نہ کہ محض قیاسات و مفروضات۔ اور دوسری شرط یہ کہ قرآنی بیانات میں تاویل نہ کی جائے، بلکہ اُس کے نصوص (جن کو اُصولِ فقہ کی زبان میں عبارت النص، اشارت النص، دلالت النص اور اقتضاء النص کہا جاتا ہے) کے ذریعہ ثابت شدہ مفہوم سے استدلال کیا جائے۔ بالفاظِ دیگر قرآنی منصوصات (اُس کے واضح بیانات) کو توڑ مروڑ کر پیش نہ کیا جائے۔ بلکہ لغت، نحو اور اُصولِ تفسیر کی رُو سے جو صحیح مفہوم ثابت ہو رہا ہو اُسی سے استدلال کیا جائے۔ اور یہ خیال ذہن سے بالکل نکال دیا جائے کہ قرآنِ حکیم کبھی اور کسی بھی حالت میں علم و تحقیق کی رُو سے ثابت شدہ حقائق سے ٹکرا سکتا ہے۔ حاشا و کلاّ۔ کیونکہ یہ ربّ العالمین کا کلام ہے جو ماضی اور مستقبل کے تمام احوال و کوائف اور حقائق و معارف کا یکساں علم رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کی دی ہوئی خبر اور اُس کا بیان کیا ہُوا کوئی واقعہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اور اس لحاظ سے صحیح اور ثابت شدہ اُصولوں کے مُطابق اُس کے مفہوم کو زمانہ مُستقبل کبھی چیلنج نہیں کر سکتا۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ : حق بات تیرے رب کی جانب سے ہے۔ لہٰذا تو کبھی شک کرنے والا نہ بن۔ (بقرہ : ۱۴۷)

ماقبل آدم مخلوق

اب آیئے اصل موضوع کی طرف۔ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ بعض قرآنی اشارات اور اسلامی روایات کی رُو سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے بھی زمین پر کوئی دانا یا

باشعور مخلوق ضرور آباد تھی جس کو "جنّ" کہا گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں قرآنِ حکیم سے دو بنیادی اشارے اور دلائل مہیّا ہوتے ہیں۔ چنانچہ پہلی دلیل یہ ہے کہ تخلیقِ آدم کے موقع پر جب اللہ تعالیٰ اور فرشتوں میں مکالمہ ہُوا تو اُس وقت فرشتوں نے زمین پر آباد سابقہ مخلوق پر قیاس کرتے ہُوئے بارگاہِ الٰہی میں ایک شُبہ پیش کیا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ نئی مخلوق بھی زمین میں فساد اور خون ریزی برپا کرے۔

قَالُوٓا اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَیَسۡفِكُ الدِّمَآءَ : اُنہوں نے کہا کہ کیا تو زمین میں ایسی مخلوق کو خلیفہ بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے اور خون بہائے؟ (بقرہ: ۳۰)

جنّ ایک مادی مخلوق

اس سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے پہلے بھی زمین میں کوئی مخلوق ضرور آباد تھی جو خون ریزی برپا کرتی تھی (جس کو روایات میں جنّ کہا گیا ہے)۔ اب دیکھیئے اس قرآنی بیان کی روشنی میں کتنے حقائق ثابت ہوتے ہیں:

۱۔ دورِ آدم سے پہلے زمین میں ایک قسم کی مخلوق کا وجود تھا۔

۲۔ اس مخلوق میں شر پسند افراد بھی موجود تھے جو خون ریزی کرتے تھے۔

۳۔ وہ گوشت پوست رکھنے والی یا دوسرے لفظوں میں مادی مخلوق تھی، جس کی رگوں میں خون دوڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ بغیر گوشت پوست کے خون کا وجود نہیں ہوسکتا۔

۴۔ وہ مخلوق ہتھیار چلانا جانتی تھی، جو خون ریزی کا لازمہ ہے۔

۵۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی اُنگلیوں کی بناوٹ انسان جیسی رہی ہوگی۔ ورنہ ہتھیار چلانا ممکن نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ انواع species میں سوائے انسان کے اور کوئی بھی نوع ہتھیار نہیں چلاسکتی۔

۶۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود ہتھیار بنانا بھی جانتی تھی۔ کیونکہ ہتھیار چلانے کے لئے ہتھیار بنانا بھی ضروری ہے۔

۷۔ ہتھیار بنانے کے لئے چونکہ ذہانت کی ضرورت ہے اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ وہ

کوئی ذہین مخلوق تھی۔

۸۔ نیز اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ شرعی اعتبار سے مکلف بھی رہی ہو گی، جیسا کہ اس موقع پر لفظ "فساد" دلالت کر رہا ہے۔ اس کا متقابل لفظ "صلاح" ہے۔ اور یہ الفاظ (صلاح وفساد) شرعی اعتبار سے مکلف مخلوق ہی کے حق میں استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

۹۔ اس کے مکلف ہونے کا تقاضا ہے کہ وہ نطق وگویائی سے بھی متصف رہی ہو گی۔ کیونکہ شرعی تکلیف کے لئے وعظ وارشاد کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور یہ چیز نطق وگویائی اور فہم و ادراک کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی

۱۰۔ ان تمام حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کا اپنا کوئی نظام تمدّن بھی ضرور رہا ہو گا، خواہ اُس کا درجہ و مرتبہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

یہ تمام حقائق منطقی اعتبار سے بغیر کسی تاویل کے اُس کے محض ایک اشارے (اشارۃ النص) سے ثابت ہو رہے ہیں۔ اس طرح قرآنِ حکیم میں غور وخوض کر کے اُس کے اشارات وکنایات تک کی قدر وقیمت بغیر کسی تاویل کے متعین کی جا سکتی ہے۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ قرآنِ حکیم ایک دوسرے موقع پر مذکورۂ بالا "ماقبل آدم مخلوق" کو خود ہی "جنّ" قرار دیتا ہے، جو "بنصِ قرآنی" آدمؑ سے پہلے پیدا کی گئی تھی:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَاٍ مَسْنُوْنٍ ۔ وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُوْمِ : اور یقیناً ہم نے انسان کو بجتی ہُوئی مٹی سے جو سڑے ہُوئے گارے سے تھی پیدا کیا۔ اور اس سے پہلے ہم نے جنّوں کو گرم ہوا کی آگ سے پیدا کیا تھا۔ (حجر: ۲۶ - ۲۷)

اب اگر جدید اثری تحقیقات کے ذریعہ ایسی کسی عجیب مخلوق کی موجودگی کا پتہ (جو ماقبل آدم زمین پر آباد تھی) چل رہا ہو تو آخر ایک مُسلم ومؤمن کے لئے اس میں انکار کی گنجائش ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے؛ بلکہ یہ تحقیقات تو ہمارے ایمان میں اضافہ کا باعث بن رہی ہیں۔ کیونکہ ان کے ذریعہ قرآنِ عظیم کی صداقت اور اُس کی عظمت وجلال کے نقوش ظاہر ہو رہے ہیں۔

آدم جنّوں کے جانشیں

اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ مفسّرین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اسی سابقہ مخلوق کے "خلیفہ" تھے، یعنی نوعی ترتیب specific order کے لحاظ سے رُوئے زمین پر سابقہ مخلوق کے بعد جلوہ افروز ہونے والی ایک نئی نوع۔ کیونکہ خلیفے کے اصل معنی لغوی اعتبار سے "پیچھے آنے والے" کے ہیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام علامہ ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں:

والمراد "بالخليفة" أنه خلف من كان قبله من الخلق : خلیفہ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے سے ماقبل مخلوق کا جانشین بنا۔[۴]

اور متعدد روایات میں آتا ہے کہ وہ مخلوق جو آدم سے پہلے زمین پر آباد تھی وہ "جنّ" تھی۔ کتبِ تفسیر میں اس معنی کی کئی ایک روایات اور بعض حیرت انگیز انکشافات موجود ہیں، جن کے ملاحظہ سے اسلامی روایات و تعلیمات کی صداقت کے نئے نئے پہلو ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر بعض روایات درج کی جاتی ہیں اور ان سب کا ماحصل ایک ہی ہے۔

ابنِ قُتیبہ وہب بن مُنبّہ سے نقل کرتے ہیں کہ آدم سے پہلے زمین پر جنّ رہتے تھے۔ پھر اُن میں سے ایک گروہ نے خون ریزی کی۔ اللہ نے آسمانِ دُنیا کے ساکن فرشتوں کی ایک فوج کو بھیجا جن میں ابلیس بھی اُن کے سردار کی حیثیت سے موجود تھا۔ پس وہ زمین پر اُترے اور اُنھوں نے جنّوں کو مار بھگایا۔ پھر موصوف نے اس کی تائید میں یہ آیت پڑھی: "وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُوْمِ" (اور ہم نے اس سے پہلے جنّوں کو گرم ہوا کی آگ سے پیدا کیا تھا) یعنی آدم کی تخلیق سے پہلے۔ غرض انھوں نے جنّوں کو سرحدوں اور سمندر کے جزیروں تک پہنچا دیا۔[۵]

علامہ ابنِ جریر طبری نے حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت کی ہے کہ زمین پر جو پہلے آباد تھے وہ جنّ تھے۔ پھر اُنھوں نے فساد برپا کیا اور خون ریزی کی اور ایک دوسرے کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ

---

[۴] فتاویٰ ابنِ تیمیہ، ج ۳۵ ص ۴۳، مطبوعہ ریاض، ۱۳۹۸ھ

[۵] المعارف، ابن قتیبہ، ص ۸، مطبوعہ کراچی

ابلیس کو فرشتوں کی ایک ایسی جماعت کے ساتھ بھیجا جو خود بھی جن کہلاتے تھے۔ چنانچہ ابلیس اور اُس کے ساتھیوں نے جنّوں کو قتل کیا اور انہیں سمندروں کے جزیروں اور پہاڑوں کے اطراف میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

فأول من سكن الأرض الجن۔ فأفسدوا فيها وسفكوا الدماء وقتل بعضهم بعضاً۔ فبعث الله اليهم ابليس في جند من الملائكة، وهم هذا الحي الذين يقال لهم الجن۔ فقتلهم ابليس ومن معه حتى ألحقهم بجزائر البحور وأطراف الجبال۔ [۶]

علامہ جلال الدین سیوطی نے حاکم کے حوالے سے حضرت ابنِ عباسؓ کی ایک روایت نقل کی ہے جس کو بقول سیوطی حاکم نے صحیح قرار دیا ہے کہ " انی جاعل فی الارض خلیفۃ ....." کی تفسیر میں آپ نے فرمایا کہ جنّوں کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا تھا۔ پھر جب انہوں نے زمین میں فساد برپا کیا اور خون ریزی کی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی فوجوں کو بھیجا جنہوں نے اُنہیں مار بھگایا ..... لہٰذا جب اللہ نے فرمایا کہ مَیں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہُوں تو فرشتوں نے عرض کیا کہ کیا تو کسی ایسی مخلوق کو خلیفہ بنائے گا جو جنّوں کی طرح فساد مچاتی اور خُون بہاتی ہو؟ اس پر اللہ نے فرمایا کہ مَیں وہ بات جانتا ہُوں جو تُم نہیں جانتے۔ [۷]

علامہ ابنِ جریر نے اپنی ایک دوسری روایت میں اس پر اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ:
پھر اللہ نے آدم کو پیدا کیا اور اس کو زمین پر بسایا۔ یہی بات " انی جاعل فی الارض خلیفۃ" میں کہی گئی ہے۔ اس قول کے مُطابق مطلب یہ ہُوا کہ مَیں زمین میں (آدم کو) جنّوں کا جانشین بنانے والا ہُوں جو اس میں سکونت اختیار کرے گا اور اس کو آباد کرے گا۔ [۸]

---

[۶] تفسیر ابنِ جریر، ۱۵۸/۱، دارالمعرفہ بیروت، ۱۴۰۰ھ
[۷] تفسیر درِمنثور، از سیوطی، ۱/۴۴-۴۵، دارالمعرفہ بیروت
[۸] تفسیر ابنِ جریر، ۱۵۷/۱، مطبوعہ بیروت

اسی طرح علامہ ابنِ کثیر نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں اس معنی کی ایک سے زیادہ روایتیں نقل کی ہیں کہ تخلیقِ آدم سے پہلے زمین پر جنّات آباد تھے جن کو سرکشی کے جرم میں تہِ تیغ کیا گیا۔[۹]

جِنّوں سے پہلے ایک اور مخلوق

نیز علامہ ابنِ کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) نے ایک اور چونکا دینے والا انکشاف بھی کیا ہے کہ زمین پر جنّوں سے پہلے بھی کوئی مخلوق آباد تھی جس کو "حِنّ" (حاء سے) اور "بِنّ" کہا گیا؛ اور بقول ابنِ کثیر یہ بہت سے اہلِ تفسیر علماء کا قول ہے۔ اور اس ماقبل "حِنّ" مخلوق کو بھی جنّوں نے اپنے دور میں بالکل اسی طرح مار بھگایا تھا جس طرح کہ فرشتوں نے جنّوں کو مار بھگایا تھا، چنانچہ آپ تحریر کرتے ہیں:

بہت سے علمائے تفسیر نے کہا ہے کہ حضرت آدم سے پہلے جنّوں کی تخلیق کی گئی تھی۔ اور جنّوں سے پہلے زمین پر حِنّ اور بِنّ رہتے تھے۔ پھر اللہ نے جنّوں کو حِنّوں پر مسلّط کر دیا تو انہوں نے حِنّوں کو زمین سے مار بھگایا اور اُن کا صفایا کر کے اُس میں آباد ہو گئے۔

قال کثیر من علماء التفسیر خلقت الجنّ قبل آدم علیہ السلام، وکان قبلہم فی الأرض الحِنّ والبِنّ، فسلط اللہ الجنّ علیہم، فقتلوھم وأجلوھم عنھا وأبادوھم منھا، وسکنوھا بعدھم۔[۱۰]

اور لفظ "حِنّ" کے معنی مستند عربی لغات میں اس طرح بیان کئے گئے ہیں:

۱۔ جنّوں کی ایک قسم (حیّ من الجِنّ)۔

۲۔ جنّوں اور انسانوں کے درمیان کی ایک مخلوق (خلق بین الجن والانس)۔

۳۔ کمتر اور کمزور قسم کے جنّ (سَفِلۃ الجن وضعفاؤھم)۔[۱۱]

---

[۹] ملاحظہ ہو تفسیر ابنِ کثیر ۷۰/۱ اور البدایہ والنہایہ ۵۵/۱، مطبوعہ بیروت۔

[۱۰] البدایہ والنہایہ، ۵۵/۱، مکتبۃ المعارف بیروت، ۱۴۰۴ھ۔

[۱۱] لسان العرب: ۱۳۲/۱۳، القاموس المحیط: ۲۱۷/۴، الصحاح: ۲۱۰۶/۵۔

اور لفظ "بَنّ" سے مراد یہ ہو سکتا ہے کہ وہ غالباً بود و باش اختیار کرنے والی مخلوق تھی۔ کیونکہ بَنَّ یَبِنُّ بَنّاً کے معنی قیام کرنے کے آتے ہیں۔[۱۲]

اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ مذکورۂ بالا تصریح کے مطابق اگرچہ لفظ "حِنّ" کو ماقبلِ جِنّ ایک نوع قرار دیا گیا ہے، مگر عربی ادب کے استعمال کے مطابق بعض اوقات کسی بھوت پریت کو بھی "جِنّ" اور "حِنّ" بول دیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شاعر کہتا ہے:

اَبِیْتُ اَهْوِیْ فِیْ شَیَاطِیْنَ تُرِنّ مُخْتَلِفٍ نَجْوَاهُمْ حِنٍّ وَجِنّ[۱۳]

یعنی میں ایسے شیطانوں میں بھاگتے ہوئے رات بسر کرتا ہوں جو حِنّوں اور جِنّوں کی قسم کے ہیں اور وہ اپنی سرگوشیوں میں مختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہیں۔

ارتقا نہیں وحدتِ خدائی

غرض یہ ایک حیرت انگیز انکشاف ہے جو نظریۂ ارتقا کے مؤیدین کو خاموش کرنے کے لئے ایک قطعی اور مُسکت دلیل ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام خود ہی نہ صرف آدم سے پہلے ایک دوسری نوع کا وجود تسلیم کرتا ہے بلکہ صراحتاً یہ بھی کہتا ہے کہ اس ماقبل آدم مخلوق (جِنّ) سے پہلے بھی کوئی دوسری قسم کی مخلوق ضرور موجود تھی، جس کا درجہ جِنّوں سے کم تر تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ خود اسلام کی نظر میں ایسی مخلوقات کا وجود پایا گیا ہے جو درجہ بدرجہ کمتر اور "ضعیف" رہی ہیں۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنی مخلوقات کی تخلیق درجہ بدرجہ تفاوت کے ساتھ کرتا ہے، مگر وہ ارتقا کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں انسان کے امتحان اور اُس کی سبق آوری کے لئے دلائل رکھنا مقصود ہے۔ اور اس سبق آوری کے کئی پہلو ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کثیر الانواع تخلیقات کے ذریعہ دراصل "وحدتِ تخلیق" اور "وحدتِ خُدائی" کا نظارہ کرایا جائے۔ مگر یہ ایک الگ بحث ہے۔

---

[۱۲] لسان العرب: ۵۹/۱۳ (بیروت)، القاموس المحیط: ۲۰۳/۴ (بیروت)

[۱۳] لسان العرب: ۱۳۲/۱۳

بہرحال اسلامی روایات کی رُو سے ماقبل آدم کئی قسم کی "شعوری انواع"[۱۴] intellectual species پائی گئی ہیں۔ مگر اُن کی شکل وصُورت یا ساخت و پرداخت کے تعین کے بارے میں کوئی صراحت نہیں ملتی۔ بلکہ بعض روایات میں اتنا اور ملتا ہے کہ جنّات کی کئی قسمیں ہیں، جن میں سے ایک قسم سانپوں وغیرہ کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے۔[۱۵] لہٰذا جدید اثریات کی رُو سے ان انسان نما ڈھانچوں کی جو بھی شکل وصورت متعین ہو جائے اس سے اسلامی عقائد و تصوّرات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہو سکتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ یہ نامکمل ڈھانچے (جو زیادہ تر اجزا پر مشتمل ہیں اور اب تک کوئی بھی مکمل ڈھانچہ برآمد نہیں ہو سکا ہے، جیسا کہ تفصیل آگے آرہی ہے) اُنھی سابقہ ماقبل آدم مخلوق (جنّات اور جِنّات) کے ہوں۔ کیونکہ خدائی تخلیقات اور خصوصاً زمانی اعتبار سے قریبی انواع میں بہت زیادہ مشابہتیں پائی جاتی ہیں، جس کی وجہ سے ارتقا پسندوں evolutionists کو دھوکا ہو جاتا ہے کہ وہ "ارتقا" کا نتیجہ ہوں گی۔ کیونکہ بدقسمتی سے اُن کے نزدیک ایک خالق یا خُدائے برتر ہستی کا وجود ثابت نہیں ہے۔

غرض اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ واقعی موجودہ انسان سے قطعاً مختلف قسم کی انواع سے تعلق رکھنے والے آثار و باقیات ہیں اور یہ کہ یہ آثار و باقیات بہت زیادہ قدیم ہیں تو اس سے اسلامی عقائد و تعلیمات پر ایک نئی روشنی پڑتی ہے اور قرآن کے اعجاز کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر بعض اسلامی تعلیمات اور جدید ترین حقائق کا تقابل کیا جاتا ہے تاکہ اسلامی فلسفۂ حیات کی برتری ثابت ہو سکے۔

اسلام کا امتیاز

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کو اعتراف ہے کہ مغربی مذاہب میں جنّوں کا کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے، جبکہ اسلام میں روحانی مخلوق کی تین قسمیں قرار دی گئی ہیں جو یہ ہیں: فرشتے، جن اور شیاطین۔

---

[۱۴] یہ میری اپنی اصطلاح ہے، جو میں نے hominids اور homo sapiens وغیرہ قسم کی مادہ پرستانہ اصطلاحوں سے اجتناب کرنے کی غرض سے اختیار کی ہے۔

[۱۵] آکام المرجان فی أحکام الجان، از علامہ بدرالدین شبلی، ص ۱۷-۱۰۸، مطبوعہ کراچی۔

Ambivalent or neutral spiritual beings are usually not found in western religions, ... Islam, however, classifies spiritual beings into angels (mala'ika), demons (shayatin), and jins or genies.[16]

ظاہر ہے کہ یہ بات یہودیت و مسیحیت کے نقص کو ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی فضیلت و برتری کا بھی ایک اعتراف ہے۔ اور اسلام اپنی اسی کاملیت کی بنا پر عصرِ حاضر کی رہنمائی کرنے کے قابل ہے۔

واضح رہے کہ اسلام میں جنّات کی کئی قسمیں قرار دی گئی ہیں، جن کا تذکرہ قرآن اور حدیث میں ذرا مبہم انداز میں کیا گیا ہے، جس میں بہت بڑی حکمت ملحوظ ہے۔ مگر اس موقع پر ان سب پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں ہے[17] مگر اشارتاً اتنا عرض کیا جا سکتا ہے کہ جنّات مختلف اجرامِ سماوی میں بھی پائے جا سکتے ہیں۔ اور اس موضوع پر میں نے ایک دوسرے موقع پر بحث کی ہے۔[18] لہٰذا اس موقع پر صرف زمینی جنّات اور وہ بھی صرف ماقبل آدم ہی کا تذکرہ مقصود ہے۔ ورنہ جنّات کی ایک قسم جو شیاطین پر مشتمل ہے وہ آج بھی روئے زمین پر پائی جاتی ہے جو غیر مرئی شکل میں ہے۔

ان مباحث کا ایک اور نتیجہ یہ بھی سامنے آئے گا کہ بعض "روشن فکر" اور متجدّد قسم کے اہلِ علم نے یہ جو جنّوں کو انسانوں سے الگ ایک مخلوق ماننے سے انکار کرتے ہوئے ان کو ایک قسم کے "جنگلی انسان" قرار دینے پر اصرار کیا ہے اُس کا ردّ بھی بخوبی ہو جائے گا۔

جنّات مکلّف تھے

۱۔ پچھلے صفحات میں ایک قرآنی آیت (حجر: ۲۷) کے حوالے سے بتایا جا چکا ہے کہ جنّات کی تخلیق حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے ہوئی تھی۔ اس کی تفسیر میں بعض روایات میں آتا

---

[16] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا: جلد اول صفحہ ۸۷۴، ۱۹۸۳ء

[17] اس موضوع پر ایک الگ تصنیف زیرِ تکمیل ہے۔

[18] ملاحظہ ہو سہ ماہی ندائے فرقان کے دوسرے شمارے میں میرا مقالہ بعنوان: "اجرامِ سماوی کا جغرافیہ: قرآن کی نظر میں"۔

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنّات کو حضرت آدمؑ سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا تھا۔[۱۹]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ فرشتوں کی تخلیق بُدھ کے دن، جنّوں کی جمعرات کے دن اور آدم کی جمعہ کے دن عمل میں آئی۔[۲۰] تو ظاہر ہے اس سے ہمارے چوبیس گھنٹے والے دن مراد نہیں بلکہ ایک لمبی مدّت کا اظہار مقصود ہے۔ جب کہ اللہ کے نزدیک بنصِ قرآنی ایک دن ایک ہزار سال کا (حج ۴۷) بلکہ پچاس ہزار سال کا (معارج ۴) بھی ہوسکتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی صحیح مدت اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ہم اس کا تعین کسی بھی طرح نہیں کرسکتے۔ کیونکہ یہ اُمورِ غیب میں داخل ہے۔

۲۔ علامہ ابنِ کثیر تحریر کرتے ہیں کہ جنّات بنی آدم ہی کی طرح کھاتے پیتے اور بچے پیدا کرتے ہیں۔ (وھم کبنی آدم یأکلون ویشربون ویتناسلون)۔[۲۱]

۳۔ نیز موصوف سورۂ جنّ میں مذکور جنّوں کے واقعے سے استدلال کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ جنّات مؤمن اور کافر دونوں قسم کے ہوتے ہیں۔[۲۲]

۴۔ نیز وہ مزید تحریر کرتے ہیں کہ مؤمن جنّوں کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ جنّتی ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ یا یہ کہ اطاعت گزار جِنّ صرف دوزخ کے عذاب سے بچ رہیں گے؟ پھر فرماتے ہیں کہ سورۂ رحمان میں مذکور حقائق کے مطابق صحیح قول یہ ہے کہ وہ بھی جنّت میں داخل ہوں گے۔[۲۳]

لہٰذا ثابت ہُوا کہ ماقبل آدم مخلوق بھی شرعاً مُکلّف تھی۔ گویا کہ اُن کے لئے بھی اسی طرح ایک نظامِ شریعت موجود تھا جس طرح کہ انسانوں کے لئے ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کی شریعت اور ہماری شریعت میں زمین و آسمان کا فرق رہا ہو۔ جنّات کے مکلّف ہونے پر خود قرآنِ مجید بھی دلیلِ ناطق ہے:

۱۹؎ تفسیر دُرِ منثور، از علامہ جلال الدین سیوطی، ۱/۴۵، مطبوعہ بیروت۔

۲۰؎ تفسیر ابنِ جریر: ۱/۱۵۷

۲۱؎ البدایہ والنھایہ، ابنِ کثیر: ۱/۵۶، مطبوعہ بیروت۔

۲۲؎ ایضاً

۲۳؎ ایضاً: ۱/۵۷

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ : اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف میری عبادت کی غرض سے پیدا کیا ہے۔ (ذاریات : ۵۶)

۵۔ علامہ بدرالدین شبلی حنفی (متوفی ۷۶۹ ھ) نے جنوں کے بارے میں ایک مفصل کتاب لکھی ہے، جس میں موصوف نے زمخشری کی کتاب "ربیع الابرار" کے حوالے سے حضرت ابوہریرہ رضؓ کی ایک مرفوع حدیث بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار قسم کی مخلوق پیدا کی ہے جو یہ ہیں: ملائکہ، شیاطین، جن اور انس۔ پھر ان سب کے دس حصے کئے جن میں سے نو ملائکہ پر مشتمل ہیں اور صرف ایک حصہ بقیہ تین اصناف پر مشتمل ہے۔ پھر ان تین اصناف کے بھی دس حصے کئے جن میں سے نو شیطانوں پر اور صرف ایک حصہ جنوں اور انسانوں پر مشتمل ہے۔ پھر جنوں اور انسانوں کے بھی دس حصے کر کے ان میں سے نو حصے جنوں کے لئے اور صرف ایک حصہ انسانوں کے لئے مخصوص کیا۔[۲۴]

اس اعتبار سے گویا کہ جنات انسانوں کے مقابلے میں نو گُنا زیادہ ہیں۔ بہرحال اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیگر انواع کے مقابلے میں انسانوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔ واللہ اعلم۔

جنات کی تخلیق آگ سے ہونے کا مطلب کیا ہے؟

نصِ قرآنی (قرآن کے واضح بیان) کے مطابق جنوں کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں گزر چکا سورۂ حجر کی آیت ۲۷ اور سورۂ رحمان کی آیت ۱۵ اس پر روشنی ڈال رہی ہیں۔ اور حدیثِ شریف میں اس کی وضاحت اس طرح آئی ہے:

عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : خُلقت الملئکۃ من نُور، وخُلق الجانّ مِن مَارج، وخُلق آدمُ مما وُصِفَ لکم۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ فرشتوں کی تخلیق نُور سے، جنوں کی تخلیق شعلے سے اور آدم کی تخلیق اُس چیز سے ہُوئی ہے جو تُم سے بیان کی جا چکی ہے۔ (یعنی مٹی سے)۔[۲۵]

---

[۲۴] آکام المرجان فی اُحکام الجان، از قاضی بدرالدین شبلی، ص ۱۱، مطبوعہ کراچی۔

[۲۵] صحیح مسلم، کتاب الزھد ۶۰، جلد ۴، صفحہ ۲۲۹۴، مطبوعہ ریاض، نیز مسند أحمد، ۶/۱۶۸، مطبوعہ بیروت۔

اس موقع پر ایک اہم سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُوپر مذکور شدہ مباحث کے مُطابق جب جنات کے بارے میں اتنے سارے حقائق ثابت ہوجائیں کہ وہ گوشت پوست والے تھے، ان کی رگوں میں خون دوڑتا تھا، وہ کھاتے پیتے اور شادی بیاہ وغیرہ سب کچھ کرتے تھے، تو صاف ظاہر ہے کہ وہ پوری طرح ایک مادّی مخلوق تھے جیسے انسان ہیں۔ اگر حقیقت یہ ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اس مخلوق کو "آگ" سے پیدا کئے جانے کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ اگر وہ مادّی مخلوق تھے (اور اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارۂ کار بھی نہیں ہے) تو پھر ان کا انہی عناصر سے مرکب ہونا لازم آتا ہے جن عناصر سے دُنیا کی دیگر مخلوقات مرکب و مُتشکّل ہیں۔ اور جدید تحقیقات کے مُطابق دُنیا کی تمام چیزیں ۹۲ عناصر کا مجموعہ ہیں، جبکہ ان میں سے بعض کثیر مقدار میں اور بعض قلیل مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی مادی چیز ان عناصر سے مرکب نہ ہو۔ حتیٰ کہ اجرامِ سماوی میں بھی یہی عناصر پائے جاتے ہیں۔[۲۶]

نیز اسی طرح بنصِ قرآنی دُنیا کے تمام جاندار پانی ہی سے پیدا کیے گئے ہیں:

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ : اللہ نے ہر جاندار پانی سے پیدا کیا ہے۔ (نور: ۴۵)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ : اور ہم نے ہر جاندار شے پانی ہی سے بنائی ہے۔ (انبیاء: ۳۰)

اس کا صاف مطلب یہ ہُوا کہ دُنیا بھر کی تمام مخلوقات (باستثنائے ملائکہ، کیونکہ ان کا شمار "دابّہ" سے ایک الگ جنس میں ہوتا ہے جیسا کہ سورۂ نحل کی آیت ۴۹ اس پر روشنی ڈال رہی ہے) پانی ہی سے بنائی گئی ہیں، جن میں جنات بھی شامل ہیں۔ پانی سے بنانے کا مطلب سائنسی نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ جدید تحقیقات کے مُطابق زندہ اشیاء کے خلیوں cells میں ستّر فیصد حصّہ پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ خدائی کلمات کی وہ صداقت ہے جو عصرِ جدید میں ظاہر ہو رہی ہے۔

غرض جب جنات کی تخلیق میں پانی بھی ایک اہم جُزو کی حیثیت سے موجود رہا ہے تو پھر

---

۲۶ تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "اسلام کی نشأۃ ثانیہ: قرآن کی نظر میں" ص ۳۰۳ - ۳۰۴، مطبوعہ مجلسِ نشریاتِ اسلام کراچی، ۱۹۸۳ء

اُن کے آگ سے پیدا کئے جانے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے ؟ اس سوال پر بندہ سالہا سال سے غور کرتا رہا ہے ۔ اور میری ناقص رائے میں اس کا مطلب شاید یہ ہو سکتا ہے کہ جنات کی سرشت میں غالباً کسی "التہابی عنصر" جیسے ہائیڈروجن یا فاسفورس یا سلفر وغیرہ کی زیادتی پائی جاتی ہو ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنوں اور انسانوں کے خلیوں cells کی تشکیل میں بعض اجزا وعناصر کی کمی بیشی پائی جاتی ہوگی ۔ جدید تحقیق کے مطابق موجودہ تمام اشیاء (حیوانات و نباتات) کی مقدارِ مادہ کا ۹۹ فی صد حصہ حسبِ ذیل عناصر پر مشتمل ہوتا ہے :

آکسیجن	۶۲	فی صد
کاربن	۲۰	"
ہائیڈروجن	۱۰	"
نائٹروجن	۳	"
کیلشیم	۲ ، ۵	"
فاسفورس	۱ ، ۱۴	"
کلورین	۰ ، ۱۶	"
سلفر	۰ ، ۱۴	"
پوٹاشیم	۰ ، ۱۱	"
سوڈیم	۰ ، ۱۰	"

نیز ان کے علاوہ میگنیشیم ، لوہا ، میگنیز ، تانبا ، زِنک ، بورون ، مولبڈینم ، ایوڈین اور کوبالٹ بھی (قلیل مقدار میں پائے جاتے ہیں ، جو) حیوانی اور نباتاتی زندگی کے لئے ضروری مادے شمار کئے جاتے ہیں[۲۷]

واضح رہے کہ ان عناصر کا تناسب تمام حیوانی اور نباتاتی خلیوں cells میں ہمیشہ

[۲۷] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا : ۴/۱۱۷ (۱۹۸۳ء)

یکساں نہیں ہوتا بلکہ مختلف انواع species میں مختلف مقدار میں ہوتا ہے اور انہی اختلافات کے باعث انواع کی نوعی خصوصیات مختلف ہوتی ہیں۔ لہٰذا اغلب یہ ہے کہ انسانوں اور جنّوں میں بھی یہ تناسب مختلف ہوگا۔ اور غالباً اسی اختلافِ عناصر کے اظہار کے لئے انسانوں کو خاکی اور جنوں کو ناری مخلوق کہا گیا ہوگا۔ واللہ اعلم بِالصّواب۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ انسان کی تخلیق مٹی سے ہونے کے باوجود انسان مٹی نہیں ہے بلکہ عناصر سے مرکب گوشت پوست کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح جنّات آگ سے پیدا کئے جانے کے باوجود حقیقتاً آگ کا مجموعہ نہیں ہوسکتے۔ جیسا کہ علامہ بدرالدین شبلی نے جنّات کے بارے میں اپنی قابلِ قدر تصنیف میں استدلال کیا ہے[۳۸]۔ لہٰذا ہوسکتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ جنّات کی تخلیق میں آگ پکڑنے والے کسی عنصر یا آتش گیر عناصر کی زیادتی رہی ہو، جیسے ہائیڈروجن، کاربن، فاسفورس اور سلفر وغیرہ۔ واللہ اعلم بمرادہ۔

سلفر ایک جلنے والا عنصر ہے جس سے دیا سلائی وغیرہ بنائی جاتی ہے۔ فاسفورس ایک انتہائی آتش پذیر مادہ ہے جو کُھلی ہوا میں رکھے جانے پر فوراً خود بخود بھڑک اُٹھتا ہے۔ اسی طرح ہائیڈروجن اور کاربن بھی جلنے والے عناصر ہیں۔

مگر یہ بھی واضح رہے کہ فاسفورس اور سلفر دونوں ہائیڈروجن اور کاربن کے مقابلے میں کمیاب عناصر ہیں، جبکہ کارخانۂ قُدرت میں آخرالذکر دو عناصر کی زیادتی پائی جاتی ہے۔ مگر ان دونوں میں بھی فرق یہ ہے کہ ہائیڈروجن عنصر جب تک وہ مفرد رہتا ہے گیس کی شکل میں ہونے کی وجہ سے وہ آتش پذیر مادہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر اس کے برعکس دیگر عناصر سے تعامل کے بعد اُس کی یہ صلاحیت ختم ہوجاتی ہے۔ مثلاً وہ آکسیجن سے کیمیادی تعامل کے بعد پانی بن جاتا ہے جو بجائے جلنے کے بُجھانے والی چیز بن چکی ہے۔ البتہ کاربن تو یہ دُنیا کی بہت سی چیزوں میں پایا جاتا ہے اور چیزیں اسی عنصر کی موجودگی کے باعث آسانی سے جلنے لگتی ہیں۔ اور کسی چیز میں اس عنصر کی

---

[۳۸] ملاحظہ ہو آکام المرجان فی أحکام الجانّ، ص ۱۳ - ۱۴

موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ "آگ" اس چیز میں گویا کہ بِالقوّہ potentially موجود ہے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ آگ بجائے خود کوئی عنصر نہیں ہے (جیسا کہ یونانی حکما کا غلط نظریہ تھا)۔ بلکہ وہ مختلف اشیاء میں بِالقوّہ (امکانی طور پر) موجود رہتی ہے، جو محض کاربن کی وجہ سے ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ کاربن ہی کا دوسرا نام آگ ہو سکتا ہے۔

کاربن اگرچہ قشرِ ارض (زمین کی بالائی پرت) میں صرف ۰۲۶ فی صد ہی پایا جاتا ہے، مگر یہی وہ عنصر ہے جو دیگر عناصر کی بہ نسبت زیادہ سے زیادہ مرکبات کی تشکیل کرتا ہے[29] اور چونکہ تمام نامیاتی مرکبات organic compounds میں کاربن ایک اہم ترین جُزو کی حیثیت سے موجود رہتا ہے، اس لئے جملہ حیوانات و نباتات کی تشکیل میں یہ عنصر لازمی طور پر پایا جاتا ہے۔ لہٰذا "زندہ اشیاء" کو کاربنی مرکبات carbonic compounds بھی کہا جاتا ہے۔

حاصل یہ کہ پانی اور کاربن تمام "زندہ اشیاء" کے لازمی اجزا ہیں، جن سے یہ کارخانۂ رُبوبیت تشکّل ہُوا ہے۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ جنّوں کی تخلیق و تشکیل میں ان اجزا کے تناسب میں تفاوت پایا جاتا ہو۔ اب نہیں معلوم کہ قبلِ آدم مخلوق میں ان اجزا و عناصر کا تناسب کیا تھا؟ ہو سکتا ہے کہ زمین کی کُھدائی سے دریافت شدہ قدیم اُحفوری ڈھانچوں یعنی متحجر آثار کے کیمیاوی تحلیل و تجزیہ سے اس موضوع پر کوئی روشنی پڑ سکے۔ اب اس نقطۂ نظر سے بھی تحقیق کی ضرورت ہے۔

نیز اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ قرآنِ حکیم میں اس موقع پر مُجرّد آگ نہیں کہا گیا ہے، بلکہ "مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ" (آگ کے شعلے سے) اور دوسری جگہ "مِنْ نَارِ السَّمُوْمِ" (گرم ہوا کی آگ سے) کہا گیا ہے۔ اور اس کا مطلب اب تک پوری طرح منکشف نہیں ہو سکا ہے۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ زمانۂ مستقبل میں اس موضوع پر بھی کُچھ روشنی پڑ سکے۔ اس لحاظ سے اس قسم کی آیات "متشابہاتِ اضافی" ہو سکتی ہیں۔ یعنی ایسی متشابہات جن کی حقیقت ... مُستقبل میں کُھلنے کی اُمید ہو۔

[29] ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (خو۔د) : ۲/۳۴۹ (۱۹۸۳ء)

متشابہاتِ اضافی

اس موقع پر امام راغب اصفہانی نے مُتشابہات (قرآن کی مُبہم و مُجمل آیات) کی جو تقسیم و تشریح کی ہے وہ پیشِ نظر رہنی چاہیئے جو بڑی فکر انگیز ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ قرآنی آیات کی تین قسمیں ہیں :

۱۔ مُحکم علی الاطلاق

۲۔ مُتشابہ علی الاطلاق

۳۔ ایک حیثیت سے مُحکم اور دوسری حیثیت سے مُتشابہ۔

پھر مزید فرماتے ہیں کہ تمام مُتشابہات کو پھر تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

۱۔ وہ مُتشابہات جن کی حقیقت سے واقفیت کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، (اور اس کو سوائے خُدائے تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا) مثلاً قیامت کا وقت اور دابۃ الارض کا خروج وغیرہ۔

۲۔ وہ مُتشابہات جن سے انسان کی واقفیت ممکن ہے۔ مثلاً غریب الفاظ اور مُغلق احکام کی شرح و تفسیر وغیرہ۔

۳۔ وہ متشابہات جو ان دونوں کے درمیان گردش کرنے والی ہوں اور ان کی حقیقت بعض علمائے راسخین پر واضح اور دوسروں کے لئے مخفی ہوسکتی ہے۔[۳۰]

اس اعتبار سے اس تقسیم میں ایک چوتھی قسم کا بھی اضافہ ہوسکتا ہے۔ اور وہ ایسی متشابہات ہوں گی جن کی حقیقت سے کوئی ایک دور یا سابقہ تمام ادوار ناواقف رہ گئے ہوں اور وہ مابعد کے دور یا ادوار میں ظاہر ہو رہی ہوں۔ اس طرح جدید علمی تحقیقات کی رُو سے جو بھی نئے نئے حقائق ظاہر ہوتے جائیں گے ان کی روشنی میں اس قسم کی "مُتشابہات" کا مفہوم زیادہ بہتر طور پر ظاہر ہوتا جائے گا۔ اور ایسی مُتشابہات کو اصطلاحاً "متشابہاتِ اضافی زمانی" کا نام دیا جاسکتا ہے۔

مفسّرین نے مُحکمات و مُتشابہات کی تفصیل میں بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے۔ مگر

---

۳۰ المفردات فی غریب القرآن، ص ۲۵۴ - ۲۵۵، دار المعرفۃ بیروت۔

اس شرح و تفسیر سے اس سلسلے کی ساری پیچیدگیاں دُور ہو جاتی ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے سُورۂ آل عمران آیت ۷ اور اُس کی مختلف تفسیریں۔

غرض جنات کے سلسلے میں اسلامی حقائق و تصوّرات کا یہ ایک مختصرترین جائزہ تھا جو صرف ماقبل آدم جنات سے متعلق ہے۔ یہ حقائق چونکہ دین کے بُنیادی اور اساسی اُمور سے تعلق نہیں رکھتے، بالفاظِ دیگر اہلِ اسلام کی عملی زندگی سے براہِ راست ان کا کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے اسلام میں اس قسم کے تصوّرات ذرا مُبہم رکھے گئے ہیں۔ اور جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا جائے گا اس قسم کے اشارات و کنایات کی قدر و قیمت واضح ہوتی جائے گی۔ قرآن حکیم میں متشابہات رکھنے کی یہ ایک بہت بڑی حکمت ہے جس کی وجہ سے اُس کی صداقت و حقانیت کے نئے نئے ابواب کُھل سکتے ہیں۔

اس لحاظ سے اسلامی عقائد و تصوّرات کی تصدیق و تائید موجودہ دور میں بخوبی ہونے لگی ہے۔ لہٰذا اب کچھ جدید اکتشافات پیش کئے جاتے ہیں۔

اُحفوریات میں کُلّی صداقت مفقود

مگر آغازِ بحث سے پہلے ایک حقیقت بیان کر دینا ضروری ہے کہ کوشش بسیار کے باوجود جدید سائنس "انسانِ اول" کے بارے میں کسی کُلّی صداقت کا پتہ نہیں چلا سکی ہے۔ کیونکہ "ماہرین" کو خود ہی اعتراف ہے کہ اس سلسلے میں متعلقہ آثار و باقیات remains نہایت درجہ ناقص اور ناکافی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک اعتراف ملاحظہ ہو:

"انسانِ اول کے بارے میں ہماری معلومات میں بہت سی دڑاریں حائل ہیں۔ حالانکہ اُحفوریات کی حالیہ دریافتوں نے ان دڑاروں کو ڈرامائی طور پر تنگ کر دیا ہے۔ ہڈیوں، ہتھیاروں اور آلات کی تفصیلی جانچ کے نتائج اس بات کی تشریح کرتے ہیں کہ انسان کب اور کہاں نمودار ہُوا؟ اور اس کے آبا و اجداد کون تھے؟ مگر یہ آثار عموماً جزئی ہوتے ہیں۔ پُورا ڈھانچہ تو دُور کی بات ہے، سالم ہڈیاں بھی شاذ و نادر ہی ملتی ہیں، جس کی وجہ سے کسی دریافت کا تعلق انسانی خاندان سے دکھانا مشکوک ہو جاتا ہے"۔

Tantalizing gaps remain in our knowledge of early man, even though they have been narrowed dramatically by recent fossil discoveries. Detailed examination of bones, weapons and tools has resulted in interpretations of where and when man first appeared and who his ancestors were. But the remains are usually fragmentary - rarely are whole bones found, let alone a complete skeleton - which makes the assignment of any find within the family of man problamatic.[31]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ علمِ طبیعیات اور علمِ کیمیا کے اُصولوں کی طرح اثری تحقیقات اور اُن کے نتائج دو اور دو چار کی طرح متعین نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ گڑے مُردوں کو اُکھیڑنے کا کام ہے، مجازاً نہیں بلکہ حقیقتاً۔ لہٰذا اب تک اس سلسلے میں جو بھی آثار و نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ زیادہ تر قیاسات و مفروضات ہیں، جو صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ اس کو زیادہ سے زیادہ "ایک گمان" کہا جا سکتا ہے۔ اور اس سلسلے میں سائنس داں بھی بعض اوقات دھوکا کھا جاتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ ملاحظہ ہو۔ ۱۹۱۲ء میں انگلینڈ کے ایک مقام پلٹ ڈاؤن piltdown میں ایک عجیب قسم کا انسانی سر کا حصّہ ملا، جس کی کھوپڑی کا حصّہ تو موجودہ انسان جیسا مگر جبڑے کی ہڈی چمپنزی جیسی تھی۔ اس کو سائنس دانوں نے "پلٹ ڈاؤن انسان" کے نام سے مُتعارف کرا دیا۔ مگر چالیس سال کی مُسلسل بحث و تمحیص کے بعد پتہ چلا کہ دراصل یہ ایک جعلسازی تھی اور کسی نے سائنس دانوں کو غلط راہ پر ڈالنے کی غرض سے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کو بعض دوسری پُرانی ہڈیوں اور اوزار کے ساتھ خلط ملط کر کے رکھ چھوڑا تھا۔[۳۲]

اُحفوری انسانوں کی قسمیں

بہرحال سائنس دانوں کا دعویٰ ہے کہ رُوئے زمین پر بائبل کے بیان کے مطابق انسان

31. The Illustrated Reference Book of the Human Body, General Editor James Mitchell, P.4, Winward, London, 1982.

۳۲۔ ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (خورد) : ۷/۱۰۰۹ (پلٹ ڈاؤن)

کا وجود صرف چھ ہزار سال سے نہیں بلکہ لاکھوں سال سے ہے۔ اور اس کے ثبوت میں وہ بعض "انسان نما مخلوق" کی ہڈیاں پیش کرتے ہیں جن کی نسلیں اب ناپید ہو چکی ہیں۔ مگر ان تمام ہڈیوں اور کھوپڑیوں کے ٹکڑے ایک جیسے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی بناوٹ اور قدامت میں کافی اختلافات ہیں۔ لہٰذا ان آثار و باقیات remains کو سائنس داں مختلف قسموں یا ذیلی خاندانوں اور مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ان کی ایک تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ مگر ان سب کو وہ "انسانی سلسلے" ہی کی مختلف انواع تصور کرتے ہوئے ان کو ایک مشترکہ خاندانی نام hominid یا hominidae کا دیا ہے۔ اور اس کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے: "انسانی حیاتیاتی خاندان کا کوئی فرد، خواہ وہ موجودہ انسان ہو یا اُحفوری انسان۔"

Members of the human zoological family including existing and fossil man.[33]

اس طرح یہ اصطلاح موجودہ انسان سے پہلے "انسان نما مخلوق" کی جتنی بھی انواع species گزر چکی ہیں ان سب کو شامل ہے۔ اُحفوری انسان fossil man کا اطلاق اُس ناپید شدہ انسان نما مخلوق پر ہوتا ہے جس کے آثار و باقیات آج صرف زمین میں مدفون شدہ شکل میں موجود ہیں۔ ان آثار و باقیات کو مُتعدّد قسموں اور سلسلوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جو یہ ہیں:۔

راماپیتھی کس ________ ramapithecus

آسٹرالوپیتھی کس ________ Australopithecus

ھوموایریکٹس ________ Homo Erectus

ھوموسیپی ینس ________ Homo sapiens

نینڈرتھل انسان ________ Neanderthal man

۳۳؎ دی آکسفورڈ السٹریٹڈ ڈکشنری، ۱۹۸۲ء

کرومیگنن انسان ــــــــــــ Cro-magnon man

یہ چند مشہور قسمیں ہیں[۳۴] جن کا تذکرہ اس موقع پر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور بھی قسمیں پائی گئی ہیں، جن کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان تمام اقسام کا تذکرہ اس وقت مقصود نہیں ہے۔

راما پیتھی کس RAMAPITHECUS

اس (انسان نما بندر یا بندر نما انسان) کا زمانہ تقریباً ستر لاکھ سال قبلِ مسیح مانا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ قد میں چھوٹا (تقریباً چار فٹ) تھا۔ مگر اس نوع کا کوئی ڈھانچہ نہیں مل سکا ہے، جس کی بنا پر اس کے جسم کا صحیح تعین کیا جا سکتا۔ ہاں البتہ اب تک صرف جبڑوں اور دانتوں کے کچھ جزئی رکازات یا حفوری ٹکڑے fossil fragments ہی مل سکے ہیں، جن کی بنیاد پر یہ مفروضہ قائم کیا گیا ہے۔ چونکہ اس کے بعد والی نوع یعنی آسٹرالوپیتھی کس دو پیروں پر چلنے کی صلاحیت پیدا کر چکی تھی، اس لئے یہ اشارہ ملتا ہے کہ چار پیروں کے بجائے دو پیروں پر چلنے کی تبدیلی شاید اسی ابتدائی نوع (راما پیتھی کس) کے دور میں ہوئی ہوگی۔ اسی بنا پر اس کا تعلق حیاتیاتی اعتبار سے "انسانی خاندان" میں کیا جاتا ہے۔[۳۵]

آسٹرالوپیتھی کس AUSTRALOPITHECUS

لاطینی زبان میں اس کے معنی "جنوبی بندر" کے ہیں۔ کیونکہ اس کی دریافت پہلی بار افریقہ میں ہوئی تھی۔ یہ تحتی انسان sub-man بن مانسوں کی اعلیٰ قسموں اور انسان کے درمیان ایک "سرحد" کے طور پر ہے۔ ہیکل Haeckel کے نزدیک یہ نوع گونگی تھی۔[۳۶] بہت سے ماہرین

۳۴؎ ان انواع کے چارٹ کے لئے دیکھئے کتاب "دی السٹریٹڈ ریفرنس بک آف دی ہیومن باڈی" ص ۳، مطبوعہ لندن، ۱۹۸۲ء

۳۵؎ خلاصہ از انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (خورد) : ۸/۴۰۳ (۱۹۸۳ء)

۳۶؎ انسانی ارتقا، از ایم آر ساہنی، ص ۲۴۵ و ص ۲۵۰

اس بات پر متفق ہیں کہ آسٹرالوپیتھی کس کی حیثیت بوزنہ یا بن مانس (ape) اور انسان کے درمیان ایک کڑی کی سی ہے۔ اس نوع کی ایک خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ بجائے چار پیروں کے واضح طور پر دو پیروں پر چلنے والی تھی۔ اور اس کا دور تقریباً اسّی لاکھ سے پندرہ لاکھ سال پہلے تک بتایا جاتا ہے۔[۳۷] جاوا کے تحتی انسان the ape man of Java کا شمار بھی اسی خاندان میں کیا جاتا ہے۔ یہ "تحت الانسان" بندر سے تین خصوصیات کی بنا پر ممتاز سمجھا جاتا تھا: اول یہ کہ وہ چار ٹانگوں کے بجائے دو ٹانگوں پر چلنے والا تھا۔ دوم یہ کہ اُس کا دماغی حجم بن مانس سے بڑا تھا۔ سوم یہ کہ وہ پتھر وغیرہ کے اوزار بنانا جانتا تھا۔

ھوموایریکٹس HOMO ERECTUS

اس کے لغوی معنی ہیں سیدھا ہو کر چلنے والا انسان (ھومو: انسان، یرکٹس: سیدھا چلنے والا)۔

"یہ وہ معدوم شدہ انسانی نوع ہے جس کا تعلق (حیاتیاتی اعتبار سے) انسانی خاندان سے تھا۔ اس کا زمانہ نچلا اور درمیانی "پلی سٹوسین" pleistocene دور مانا گیا ہے۔ (پلی سٹوسین دور تقریباً پچیس لاکھ سال پہلے شروع ہو کر تقریباً دس ہزار سال پہلے ختم ہو جاتا ہے)۔ اگرچہ اس نوع کے بارے میں (ماہرین کی) رائیں مختلف ہیں، تاہم گمان کیا جاتا ہے کہ یہ موجودہ انسان کی قریبی پیشرو تھی۔ اس نوع کے آثار و باقیات افریقہ، ایشیا اور یورپ میں ملے ہیں۔"[۳۸]

یہ نوع (انسان نما مخلوق) تقریباً دس لاکھ سال سے دو لاکھ سال پہلے تک کے عرصے میں پائی گئی ہے۔ اس کی کھوپڑی کچھ محراب نما اور پیشانی سکڑی ہوئی اور نوکدار تھی۔ اُس کے کاسۂ سر کی گنجائش capacity ۸۰۰ سے ۱۱۰۰ مکعب سنٹی میٹر تھی۔ اس کا چہرا لمبا اور دانت اور جبڑے بڑے تھے۔[۳۹]

---

[۳۷] خلاصہ از انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا: ۲/۴۵۶

[۳۸] ایضاً (خورد): ۵/۱۰۵

[۳۹] ایضاً: ۸/۱۰۴۴

ھوموسپی ینس HOMO SAPIENS

اس کے معنی ہیں ذہین انسان (ھومو : انسان ، سپی ینٹ : ذہین)

"یہ وہ جنس اور نوع ہے، جس سے موجودہ انسان تعلق رکھتے ہیں، اور اس سے منسوب ہونے والے انسانی اُحفوری آثار قریب قریب ساڑھے تین لاکھ سال پُرانے ہیں۔ یہ (ذہین مخلوق) دوسرے حیوانات اور سابقہ انسانی انواع سے چند خصوصیات اور عادات میں ممتاز ہے۔ مثلاً دو پیروں پر چلنے کی چال ڈھال، دماغی مقدار (اوسطاً ۱۳۵۰ مکعب سنٹی میٹر)، اُونچی پیشانی، چھوٹے دانت اور جبڑے، (برائے نام) ٹھوڑی، تعمیر کے کام سے واقف اور اوزار کا استعمال کرنے والی، زبان اور تحریر وغیرہ کی علامتوں کا استعمال کرنے کی قابلیت وغیرہ۔ ان میں سے بعض خصوصیات اس نے اپنی قریبی پیشرو "ھوموایرکٹس" سے حاصل کیں۔ لیکن مجموعی اعتبار سے یہ تمام خصوصیات صرف ھوموسپی ینس ہی کی ہیں"۔[۴۰]

ھوموسپی ینس کا زمانہ ایک لاکھ سال پہلے یا دو لاکھ سال پہلے یا شاید تین لاکھ سال پہلے بھی ہوسکتا ہے۔[۴۱]

قطعیت مفقود

واضح رہے کہ مذہبی اُمور کے برعکس یہ سب قیاسات و مفروضات ہیں جن کا شمار "ظنیات" میں ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں قطعیت کے ساتھ کوئی دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح کہ مذہبی عقاید قطعی و یقینی ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس سلسلے میں بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کے بارے میں ماہرین خود حیران اور باہم مختلف ہیں۔ چنانچہ چند مزید اعترافات ملاحظہ ہوں :

اُوپر جن دو مؤخرالذکر انواع کا تذکرہ کیا جاچکا ہے، اُن کے بارے میں طبقات الارض geology کے اعتبار سے ان دونوں کے ادوار میں بہت بڑا خلا پایا جاتا ہے۔

۴۰۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (خورد) : ۵/ ۱۰۷ (۱۹۸۳ء)

۴۱۔ ایضاً : ۸/ ۱۰۳۰

"وقت کے اعتبار سے ان دونوں انواع یعنی ہوموایریکٹس (سیدھا چلنے والا اوّلین انسان) اور ہوموسیپئنس (ذہین انسان) کے نمونوں (یعنی باقیات) کے درمیان قابلِ لحاظ خلا پایا جاتا ہے"۔

There is a considerable gap in time betwen specimens of Homo Erectus (the earliest man to walk erect) and Homo Sapiens (intelligent man).[42]

یعنی زمین کی کُھدائی کے دوران طبقاتی اعتبار سے ان دونوں کے جو آثار ملے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں کے زمانے میں بہت بڑا فرق ہے۔ اور ماہرینِ آثارِ قدیمہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اسی طرح یہ آثار و باقیات دُنیا کے ہر مقام پر یکساں طور پر نہیں ملتے۔ بلکہ کہیں ملتے ہیں اور کہیں نہیں ملتے۔ اور یہ بھی اس سلسلے میں ایک معمہ ہے۔ چنانچہ "ہیومن باڈی" کے مرتبین تحریر کرتے ہیں:

ذہین آدمی h. sapiens کے ابتدائی ارتقا کے بارے میں کھوج لگانے میں ایک دُشواری یہ ہے کہ قدیم آثار یورپ کی بہ نسبت دیگر مقامات میں بہت ہی محدود طور پر پائے جاتے ہیں، حالانکہ ارتقا ہر جگہ ہُوا ہے۔

In tracing the early evolution of Homo Sapiens a major difficulty has been that the older finds are limited mainly to Europe.[43]

اس کے علاوہ خود یورپ کے مختلف مقامات پر پائے جانے والے اُحفوری نمونوں کی مختلف کھوپڑیوں کی دماغی مقدار میں بھی تفاوت پایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ تفاوت ان کھوپڑیوں کے جُزئی مطالعے کی بنیاد پر ہے۔

But these estimates are based only on fragments of the skull.[44]

۴۲؎ دی السٹریٹیڈ ریفرنس بک آف دی ہیومن باڈی، ص ۸

۴۳؎ ایضاً

۴۴؎ ایضاً

مطلب یہ کہ ان اندازوں کے لئے کوئی مکمل کھوپڑی نہیں مل سکی ہے۔ بلکہ کھوپڑیوں کے بعض اجزا کی بنیاد پر یہ قیاس کیا گیا ہے۔ اس طرح جزئی مطالعے کے ذریعہ کُلی نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو صحیح بھی ہوسکتی ہے اور غلط بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس باب میں نہ صرف نظریاتی اختلافات پائے جاتے ہیں بلکہ خود نظریات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک محقق ڈی سی جوہانسن D.C. Johanson کا قابلِ قدر مقالہ Rethinking the Origins of Genus Homo ملاحظہ ہو جو مشہور کتاب انسائیکلوپیڈیا آف اِگنورنس[45] یعنی "قاموسِ جہالت" میں شائع ہوا ہے۔ اس میں موصوف نے نظریاتی تبدیلیوں کی بعض مثالیں پیش کی ہیں۔ موصوف نے اپنے مضمون کا آغاز ہی اس اعتراف کے ساتھ کیا ہے:

نوعِ انسانی کے اولین ارتقائی مرحلوں کی عقدہ کشائی کے سلسلے میں جو پیچیدگیاں حائل ہیں، ان سے متعلق تحقیقات پچھلے پندرہ سال کے دوران بارآور ہوچکی ہیں۔ یہ بات بتدریج واضح ہوچکی ہے کہ اگرچہ انسانی علمِ اُحفوریات اب ماضی کی بہ نسبت زیادہ لبریز ہوچکا ہے، تاہم اب بھی ہم کو آخری فیصلہ کرنے سے پہلے اُس ضمنی شہادت کا انتظار کرلینا چاہئے جو انسانی ارتقا اور درجہ بندی سے تعلق رکھتا ہے۔

Investigations related to unravelling intricacies of mankinds earliest stages of evolution have proliferated during approximately the last 15 years. It has become increasingly clear that although the storehouse of human paleontology is considerably fuller now than in the past, we still must await additional evidence before final decisions can be made concerning human evolution and taxonomy.[46]

وہ مزید لکھتا ہے کہ ماہرین کے لئے مختلف اُحفوریات fossils کے درمیان

45. The Encyclopaedia of Ignorance, Edited by Ronald Duncan, Pergamon Press, Oxford 1978.

رشتہ و تعلق دکھانا ایک مشکل ترین مرحلہ ہے :

It is a difficult task for the anthropologists to ascertain relationships between such fossils.[47]

اسی طرح وہ تحریر کرتا ہے کہ کسی قدیم انسانی جبڑے کے محض ایک جزو یا ٹکڑے کی بدولت ہم کو ایسی کوئی بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی جو اصلِ انسانی کے مسائل کو حل کرنے میں معاون بن سکے، کیونکہ یہ آثار بالکل جزئی ہیں :

A hominid jaw fragment and an arm bone fragment do not give us much insight into the problems of human origins because these specimens are so fragmentary.[48]

نیز وہ تحریر کرتا ہے کہ مجموعی طور پر موجودہ شہادت کی رُو سے تمام نمونوں کو ایک واحد نوع قرار دینا ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ انحراف کا دائرہ بالکل نُمایاں ہے اور عضویاتی تبدیلیاں بالکل امتیازی طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔

Taken as a whole, the present evidence does not substantiate placing all specimens into a single species the range of variation is too pronounced and the morpholcgical adaptations to be quite distinctive.[49]

یہ ایک خلاصہ ہے جو نظریاتی اعتبار سے فکر و نظر کو کافی جِلا بخش سکتا ہے۔ تاکہ کوئی بھی فیصلہ جلد بازی اور روا داری میں نہ کیا جا سکے۔ اب بقیہ اقسام کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ذہین انسان کی قسمیں

اُوپر جن انواع کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں سے آخری یعنی ہوموسپی ینس (ذہین انسان)

---

۴۶ و ۴۷ و ۴۸ انسائیکلوپیڈیا آف اِگنورنس، ص ۲۴۴، آکسفورڈ، ۱۹۷۸ء
۴۹ ایضاً، ص ۲۴۶

کی چند قسمیں قرار دی گئی ہیں، جن میں سے دو : نینڈرتھل انسان اور کرومیگنن انسان تو ختم ہوگئے، مگر اس سلسلے کا تیسرا نمائندہ "جدید انسان" باقی ہے۔[۵۰] اس اعتبار سے آج سوائے موجودہ انسان کے خاندان hominidae کی کوئی بھی نوع species یا جدید انسان کا کوئی بھی مورثِ اعلیٰ ancestor باقی نہیں رہ گیا ہے۔[۵۱] لہٰذا اس موقع پر "ذہین انسان" کے دو معدوم اور ناپید شدہ قسموں کا تذکرہ کرنا باقی ہے، جن میں سے ایک نینڈرتھل انسان ہے اور دوسرا کرومیگنن انسان۔

نینڈرتھل انسان NEANDERTHAL MAN

"نینڈرتھل انسان" سے مراد ماقبل تاریخ انسان کی ایک قسم ہے جو یورپ کے بیشتر علاقوں کے علاوہ بحیرۂ روم کے اطراف و اکناف میں (طبقات الارض کے اعتبار سے) جدید ترین دور "پلی سٹوسین" (the pleistocene epoch : جو پچیس لاکھ سال قبل سے دس ہزار سال قبل تک مانا جاتا ہے) کے آخری حصے میں بود و باش اختیار کئے ہوئے تھی۔ نینڈرتھل کا نام وادیٔ نینڈر سے ماخوذ ہے جو مغربی جرمنی کے ایک مقام Dusseldorf سے قریب واقع ہے، جہاں پر انسانی ڈھانچے کے بچے کھچے آثار کا انکشاف پہلی بار ۱۸۵۶ء میں ہوا۔[۵۲] اور اس بنا پر اس کو نینڈرتھل انسان کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔

نینڈرتھل انسان کا شمار اسی "ذہین انسان" h. sapiens میں ہوتا ہے جو یخ بستگی کے شدید اور آخری دور میں زمین پر آباد تھا۔[۵۳] یہ پست قد والا، مضبوط، بڑے دماغ کا اور گھنے ابرو والا تھا، جواب سے کوئی تیس ہزار سال پہلے تک پایا جاتا تھا۔[۵۴] نینڈرتھل انسان سے تہذیب کا آغاز ہوتا ہے۔[۵۵] وہ نہ صرف ایک شکاری تھا بلکہ اہم بات یہ ہے کہ وہ زندگی اور

۵۰۔ ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (خورد) : ۱۰۵/۴ (۱۹۸۳ء)

۵۱۔ ایضاً ، ۱۰۲۳/۸

۵۲۔ ایضاً ، ۲۳۵/۷

۵۳۔ ۵۴ و ۵۵ دی ہیومن باڈی ، ص ۸

موت کے بارے میں شعور بھی رکھتا تھا۔ اور ہو سکتا ہے کہ جادو اور مذہبی رسوم کی شروعات بھی اسی سے ہوئی ہو۔[۵۶]

نینڈرتھل انسان بہت اچھا شکاری اور ہتھیار ساز تھا، جو تقریباً ایک لاکھ دس ہزار سال پہلے نمودار ہوا، جو برفانی دور کا آخر تھا۔[۵۷] اور وہ آگ کا استعمال جانتا تھا۔[۵۸] وہ مختلف اوزار بناتا تھا۔ مثلاً لکڑی کو بھگو کر اور اس کو آگ میں تپا کر بعض ہتھیار تیار کرتا تھا۔ وہ کدانیاں hand axes چاقو knives اور ساطور choppers بھی بناتا تھا۔[۵۹] (واضح رہے کہ) زمین پر سب سے قدیم اوزار جن کا پتہ لگا ہے وہ تقریباً ۲۶ لاکھ سال پرانے ہیں۔[۶۰]

نینڈرتھل انسان کے پاس یقیناً اوزار تھے۔ ان میں سے بعض کے متعلق دعوے کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ چمڑا صاف کرنے کے آلات رکھتے تھے۔ ان کی عورتیں گھروں میں رہتی تھیں اور مرد شکار کے لئے نکلتے تھے۔ اور یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اس دور میں مرد اور عورتوں کے درمیان لباس میں فرق و امتیاز ظاہر ہوا۔[۶۱]

ان کے دور میں مُردوں کو دفن کرنے کا رواج تھا۔ اس اعتبار سے یہ رواج تقریباً بچاس ہزار سال پرانا ہے۔[۶۲]

جن مقامات پر نینڈرتھل انسان کے نمونے برآمد ہوئے ہیں انہی جگہوں میں پتھر کے ایسے اوزار بھی ملے ہیں جن کی عمر کا اندازہ ۹۰ ہزار سے ۴۰ ہزار سال تک کا ہے۔[۶۳]

---

[۵۶] دی ہیومن باڈی ، ص ۹
[۵۷] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا : ۶۰۸/۸ (۱۹۸۳ء)
[۵۸] ایضاً : ۶۰۹/۸
[۵۹] ایضاً : ۶۰۸/۸ ـ ۶۰۹
[۶۰] ایضاً : ۶۰۸/۸
[۶۱] ایضاً : ۱۰۱۶/۵
[۶۲] ایضاً : ۵۳۳/۵
[۶۳] ایضاً : ۱۰۴۶/۸

دُنیا کے مختلف مقامات میں نینڈرتھل انسان کے جو بھی آثار ملے ہیں ان سے ان کے دور کا صحیح تعین مشکل ہے۔ کیونکہ اس سلسلے میں بہت سی چیزیں مبہم ہیں [۶۴]

اگرچہ کلاسیکل نینڈرتھل، بہت سے آثار کی دریافت کی بنا پر بجا طور پر مشہور ہے، تاہم جدید انسان کے ارتقا کا کھوج لگانے کی راہ میں جو معلومات ضروری ہیں وہ ان نمونوں سے حاصل نہیں ہوسکی ہیں۔ [۶۵]

Although the number of finds of this "classical" Neanderthal have made them justly famous, the various specimens do not provide the vital information necessary to trace the evolution of modern man.[65]

نینڈرتھل موجودہ انسان سے مختلف تھا

نینڈرتھل انسان (اپنی ساخت کے اعتبار سے) موجودہ انسان سے قطعاً مختلف تھا۔

He was certainly different from modern man.[66]

ابتدائی نینڈرتھل لوگوں کے چہروں کے عمومی نقش ونگار اور اُن کی کھوپڑیوں کا محراب نما ہونا تشریح anatomy کے اعتبار سے موجودہ ھوموسیپینس (جدید انسان) سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھا۔ یہ بات اعضا کی ہڈیوں کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ اگرچہ یہ سب باتیں ابھی سختی کے ساتھ جانچی ہیں۔ اس کے باوجود اس کے ڈھانچے کی ہیئت پیچیدہ ہے جو موجودہ انسانی آبادیوں سے ممتاز ہے۔

The general pattern of the anatomy of the face and even of the skull vault of these early Neanderthal peoples

---

۶۴؎ دی ہیومن باڈی، ص ۹

۶۵؎ ایضاً، ص ۹

۶۶؎ ایضاً، ص ۸

was not greatly unlike that of modern Homo Sapiens, this was also true of the bones of the limbs, although these are still hardly known. There was nonetheless a complex of skeletal features that distinguished them from modern human populations.[67]

نینڈرتھل انسان کے بارے میں ایک دوسرا بیان یہ بھی ہے کہ یہ گروہ اصلاً کاسۂ سر، دانت اور دیگر اوصاف کی یکجائی کی وجہ سے پہچانا گیا ہے، جن کی بنا پر اس کو ایک علٰحیدہ نوع تصور کرنے کے لئے کافی سمجھا گیا ہے۔

This group was originally recognized by a combination of cranial, dental and postcranial features that were generally considered distinct enough to classify Neanderthal man as a seperate species.[68]

اس طرح ان دونوں بیانات میں کچھ تضاد پایا جاتا ہے، مگر مجموعی اعتبار سے ظاہر ہوتا ہے کہ نینڈرتھل مخلوق ایک الگ ہی نوع تھی، جس کو غالباً محض اُس کی "ذہانت" کی بنا پر ھوموسیپئنس میں شامل کرلیا گیا ہے۔ بہرحال ماہرین اس کے بارے میں کافی تذبذب میں دکھائی دیتے ہیں۔

نینڈرتھل انسان کے بارے میں ایک اور مُعمّہ

یورپ میں حجری دور کا کلچر تقریباً ۳۵ ہزار سال پہلے دفعتاً غائب ہوگیا اور نینڈرتھل انسان کی جگہ کرومیگنن انسان نے لے لی، جو موجودہ انسان سے قدرے مختلف تھا۔[۶۹]

نینڈرتھل انسان اچانک اور دفعتاً رُوئے زمین سے کس طرح غائب ہوگیا؟ یہ ایک ایسا معمہ ہے جو اب تک حل نہیں ہوسکا ہے۔ یعنی زمین کی کھدائی اور طبقات الارض کی تحقیق کے مطابق اُحفوری ریکارڈ fossil record سے یہ نوع اچانک غائب ہوگئی جس کے بارے میں مختلف

---

۶۷ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا: ۱۲/ ۹۱۱، مقالہ نینڈرتھل مین (۱۹۸۳ء)

۶۸ ایضاً: ۸/ ۱۰۴۶

۶۹ دی ہیومن باڈی، ص ۹

نظریات ہیں۔ مگر ان کا کوئی بھی صحیح حل اب تک سامنے نہیں آیا ہے۔ گویا کہ عقلِ انسانی اس کی گرہ کشائی سے عاجز دکھائی دیتی ہے۔

Quite suddenly these people disappeared from the fossil record, and various theories have been put forward to account for their disappearance.[70]

The factors responsible for the disappearance of the Neanderthal peoples are an important problem to which there is unfortunately still no clear solution.[71]

کرومیگنن انسان CRO-MAGNON MAN

ھوموسیپی ینس h. sapiens یا "ذہین انسان" کا دوسرا نمائندہ کرومیگنن انسان مانا جاتا ہے۔ اور یہ نام اس کو اس بنا پر دیا گیا ہے کیونکہ فرانس کے جس غار میں پہلی مرتبہ اس کے نمونے ملے تھے اُس کا نام کرومیگنن تھا۔ اور اندازہ ہے کہ کوئی ۳۵ ہزار سال پہلے اس کا ظہور ہوا۔

"مکمل طور پر جدید انسان غالباً ۳۵ ہزار سال پہلے ظاہر ہوا، جس کا اولین نمائندہ کرومیگنن انسان ہے، جب کہ پتھر کا زمانہ (حجری اوزار کے اعتبار سے) ترقی اور عروج پر تھا۔"[۷۲]

کرومیگنن فرانس کے ایک مقام Dordogne میں ایک غار کا نام ہے، جہاں پر ۱۸۶۸ء میں ماقبل تاریخ کے چند ڈھانچے برآمد ہوئے[۷۳] ان کے سر لمبے، پیشانیاں چھوٹی، چہرے بہت چوڑے، آنکھیں گہرائی میں اور قد لمبا تھا[۷۴] ان کے دور کے متعلق اندازہ ہے کہ وہ ۳۵ ہزار سے لے کر ۱۰ ہزار سال قبلِ مسیح تک پائے گئے ہیں۔ جب کہ ایک دوسرے اندازے کے مطابق ان کا

---

۷۰ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا : ۱۰۴۶/۸ (۱۹۸۳ء)

۷۱ ایضاً : ۹۱۲/۱۲

۷۲ ایضاً : ۶۰۹/۸ ۷۳ ایضاً : ۲۸۹/۵

۷۴ دی آکسفورڈ السٹریٹڈ ڈکشنری ، ۱۹۸۲ء

دَور ۲۵ ہزار سال تصوّر کیا جاتا ہے۔[۷۵] ان کے کاسۂ سر کی گنجائش capacity ۱۶۰۰ مکعب سنٹی میٹر تھی۔[۷۶]

کرومیگنن انسان موجودہ انسان سے قدرے مختلف تھا۔ یہ اپنے مورثوں کی طرح شکار کرتا اور گروہ کی شکل میں رہتا تھا۔ خانہ بدوش قبیلے غذا کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومتے تھے۔ یہ تمام تبدیلیاں تقریباً سات سے آٹھ ہزار سال قبلِ مسیح تک جاری رہیں، جب کہ جدید حجری دور کے انسان نے مشرقِ وسطیٰ میں زراعت اور کاشت کاری کرنے اور مویشی پالنے کا آغاز کیا۔[۷۷]

کرومیگنن انسان موجود ہے یا ختم ہوگیا ؟

نینڈرتھل انسان کے اچانک غائب ہوجانے کے بارے میں جن مسائل کا سامنا ہے، تقریباً وہی مسائل کرومیگنن انسان کے بارے میں بھی پائے جاتے ہیں، اگرچہ اس کے بارے میں کچھ شکوک وشبہات کا بھی اظہار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بعض تصریحات ملاحظہ ہوں :

شاید کرومیگنن انسان کی اصل ہی کی طرح اس کے کلچر کی مدت اور اُس کا غائب ہوجانا بھی ایک پیچیدہ سوال ہے۔ تاہم خیال کیا جاتا ہے کہ کرومیگنن نسل مابعد کی یوروپین آبادیوں میں جذب ہوگئی[۷۸] مگر اس کے برعکس یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نینڈرتھل انسان ہی کی طرح کرومیگنن انسان بھی ناپید ہوگیا۔[۷۹]

یہ سوال کہ کرومیگنن انسان کا رشتہ اُس سے پہلے کے ھوموسیپینس سے تھا یا نہیں ؟ اب تک غیر واضح ہے۔ اسی طرح اس کا رشتہ نینڈرتھل انسان سے جوڑنا بھی غیر فیصلہ شدہ ہے۔[۸۰] اس سے یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ غالباً یہ الگ ہی نوع تھی۔ بہر حال اگر مزید تحقیقات سے

---

[۷۵] و [۷۶] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا : ۲۸۹/۵ (۱۹۸۳ء)
[۷۷] دی ہیومن باڈی ، ص ۹
[۷۸] برٹانیکا : ۲۹۰/۵
[۷۹] ایضاً (خورد) : ۱۰۵/۵
[۸۰] ایضاً : ۲۹۰/۵.

یہ بات ثابت ہو جائے کہ کرومیگنن مخلوق آج باقی نہیں رہی بلکہ پوری طرح ناپید extinct ہو چکی ہے تو پھر اسلامی نقطۂ نظر سے "آدم" کے تعین میں کوئی دشواری نہیں ہوگی، بلکہ جدید انسان modern man یا موجودہ ہوموسیپینس کا اولین نمائندہ ہی آدم قرار پائے گا۔ اور اب تک کی تحقیقات کی رُو سے بھی یہی بات زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کا ظہور کم و بیش دس ہزار سال پہلے ہُوا ہے۔

اُحفوری انسان ارتقا کا ثبوت نہیں ہے

ارتقا پسند لوگ کہتے ہیں کہ موجودہ انسان سے لاکھوں سال پہلے سے انسان جیسی شکل و صُورت کی چند انواع کا اُحفوری اعتبار سے پایا جانا ارتقا کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس سے ارتقا کا ثبوت نہیں ملتا۔ کیونکہ زمانی اعتبار سے کسی نوع کا دوسری نوع سے مقدم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مابعد کی نوع نے لازمی طور پر اسی کے بطن سے جنم لیا ہو۔ بلکہ زیادہ قرینِ قیاس بات یہ ہے کہ "ترقی یافتہ انواع" زمین کے طبیعی حالات کی سازگاری کے اعتبار سے زمانی طور پر یکے بعد دیگرے وجود میں آئی ہوں۔ پھر جب زمین کے حالات بدل گئے تو اس ناسازگاری کی وجہ سے اگلی انواع ختم ہوگئی ہوں۔

مگر اس موقع پر طبیعی حالات کے علاوہ غیر معمولی طور پر بعض فوق الطبیعی عوامل بھی کارفرما نظر آتے ہیں، جیسا کہ اسلامی روایات کے تحت پچھلے صفحات میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس لحاظ سے "شعوری انواع" یا کوئی بھی "مُکلّف مخلوق" رُوئے زمین پر صرف ابتلا و آزمائش کی غرض سے پیدا کی جاتی ہے اور اس کے سر پر "خلافتِ ارض" کا تاج رکھا جاتا ہے۔ مگر جب وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ناکام ہو جاتی ہے تو پھر خلافتِ ارض کا تاج بھی اُس سے چھین کر کسی دوسری نئی مخلوق کے سر پر رکھا جاتا ہے۔ ازل سے یہی سُنّتِ الٰہی جاری و ساری ہے۔ اس موضوع پر اگلے صفحات میں مزید روشنی ڈالی جائے گی۔

غرض اس لحاظ سے سابقہ انواع کے چند جزئی آثار و باقیات کو دیکھ کر یہ جو قیاس کر لیا

گیا ہے کہ زندگی کا ارتقا ادنا سے اعلا حالتوں کی طرف خود بخود بتدریج موجودہ ترقی یافتہ حالت تک پہنچا ہوگا، وہ کسی بھی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ صرف ایک قیاس یا مفروضہ ہے جس کے ثبوت میں کوئی مشاہداتی حقیقت موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس راہ میں کئی ایسے پیچیدہ مسائل بھی کھڑے ہوگئے ہیں جن کا کوئی حل نہیں ہے۔ انسانی "ارتقا" کا سلسلہ ماقبل کی انواع سے ملانے کے سلسلے میں جو دشواریاں حائل ہیں ان کے پیش نظر خود ڈارون نے بھی اپنی کتاب Descent of Man میں اس طرح اعتراف کیا ہے:

مختلف شکلوں کے ایک سلسلے میں جو بندر نما مخلوق سے موجودہ انسان تک غیر محسوس طور پر بتدریج رونما ہوئے ہیں اس بات کا تعین کرنا ناممکن ہے کہ (ان مختلف شکلوں کے لئے) انسان کی اصطلاح کب استعمال کی جانی چاہئے؟

In a series of forms graduating insensibly from some ape-like creature to man as he now exists, it would be impossible to fix on any definite point when the term man ought to be used.[81]

اس لحاظ سے ارتقا استقرا کی کسوٹی پر ثابت ہونے کے بجائے محض ایک دعویٰ ہی دعویٰ دکھائی دیتا ہے، جس کا کوئی ثبوت اب تک مہیا نہیں ہوسکا ہے۔ بلکہ حقائق مسلسل طور پر اس کو غلط قرار دے رہے ہیں۔

روح خداوندی کا جلوہ

لہٰذا ان ناپید انواع کا وجود کسی بھی طرح ارتقا کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس سلسلے میں کچھ ایسے حقائق پائے جاتے ہیں جو بجائے ارتقا کے تخلیقِ خصوصی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک واضح اور نمایاں حقیقت یہ ہے کہ حیاتیاتی ارتقا biological evolution کی برنسبت شعوری و نفسیاتی ارتقا جس نے مدنیت و عمرانیت کو جنم دیا، بہت تیزی سے واقع ہوا ہے،

---

۸۱ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا: ۱۰۴۳/۸ (۱۹۸۳ء)

جس نے ماہرین کے سامنے ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کا اعتراف اس طرح کیا جاتا ہے :

حیاتیاتی اور نفسیاتی۔ عمرانی ارتقا کا بہت بڑا فرق یہ بھی ہے کہ حیاتیاتی ارتقا بہت ہی سست رو واقع ہوا ہے، جس نے انسان کو پیش کرنے کے لئے تقریباً ۳ ارب سال لے لئے جبکہ اس کے برعکس نفسیاتی۔ عمرانی ارتقا نہایت تیزی کے ساتھ صرف ایک قلیل مدت یعنی ۱۰ ہزار سال میں ہو گیا۔[۸۲]

مشہور مؤرخ ٹائن بی نے بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ شعور consciousness کا ظہور پچھلے ایک ملین یا نصف ملین سال سے اتنی شدت کے ساتھ نہیں ہوا جتنا کہ صرف پچھلے پانچ ہزار سال کے دوران ہوا ہے۔[۸۳]

اس موقع پر سوال یہ ہے کہ شعوری یا نفسیاتی وصف کی یہ زیادتی اور تیز رفتاری اچانک اور دفعتہً کیونکر نمودار ہو گئی ؟ کیا بغیر کسی سبب کے یا اس کے پیچھے کوئی سبب و عامل بھی کارفرما ہے ؟ اگر اس کائنات میں "ذہن" کی کوئی کارفرمائی اور اُس کی منصوبہ بندی موجود ہے تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ غیر معمولی واقعہ بلا وجہ اور بلا سبب پیش نہیں آ گیا اور ایک "بے معنی مادہ" میں یونہی الل ٹپ "معنویت" پیدا نہیں ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ غیر معمولی واقعہ "ظہورِ آدم" کی طرف اشارہ کر رہا ہے، جب کہ نقاشِ فطرت نے "نفخِ روح" کے ذریعہ آدم کو پردۂ سیمیں پر پیش کیا تاکہ لاکھوں کروڑوں سال کے فاصلے ہزاروں سال میں طے ہو جائیں۔

آپ مادہ اور اُس کے عناصر کا تجزیہ کیجئے اور ان کے خواص و تاثیرات کا تفصیلی جائزہ لیجئے آپ کو کہیں بھی "شعور و ادراک" کی پرچھائیاں تک بھی نہ ملیں گی۔ یہ ایک ایسی پُراسرار

۸۲۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا : ۲۱/۷

83. Toynbee, Mankind and Mother Earth, P.25, Oxford University Press, New York, 1976.

چیز ہے جس کو "رُوحِ خُداوندی" یا "خُدائی پھُونک" کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ایک فوق الطبیعی یا Super natural چیز ہے، جس کی حقیقت تک رسائی انسان کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور اس کو طبیعیات کی دُنیا میں تلاش کرنا بے سُود ہے۔ مگر یہی وہ "امرِالٰہی" ہے جس کے ذریعہ انسان دیکھتا اور سُنتا ہے، بولتا اور لکھتا ہے، سوچتا اور خیال کرتا ہے اور احساس و استدلال کرتا ہے۔

اگرچہ سابقہ انواع میں بھی یہ چیزیں کسی نہ کسی درجہ میں موجود تھیں، جس کے باعث وہ شرعاً مکلّف تھیں۔ مگر اس کی شدت اور تیزی وہ نہیں تھی جو "آدم" میں رکھی گئی تھی۔ اسی شدت و تیزی کے اظہار کے لئے غالباً آدم میں "نفخِ روح" کا اعلان و اظہار کیا گیا ہے جو آدم کا ایک امتیازی وصف ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں آدم کے لئے تین جگہ اس کا اظہار کیا گیا ہے:

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِينَ : اور جب مَیں (اُس کے جسم کو) درست کر کے اُس میں اپنی رُوح میں سے کچھ پھونک دُوں تو تم اُس کے سامنے سجدے میں گر جاؤ۔ (حجر : ۲۹ اور ص : ۷۲)

ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهِ : پھر اُس نے (آدم کے جسم کو) دُرست کیا اور اس میں اپنی رُوح میں سے کچھ پھونکا۔ (سجدہ : ۹)

غرض یہ رُوحِ خُداوندی ہی کا تو کرشمہ ہے جو انسان مدنیت و عُمرانیت کی اعلا سے اعلا منزلیں طے کر رہا ہے اور اس کا یہ قافلہ کہیں بھی رُکتا ہُوا نظر نہیں آ رہا ہے۔ اور یہ مقام و مرتبہ سوائے آدم اور بنی آدم کے اس دنیا میں کسی دوسری مخلوق کو نہیں مل سکا۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا : اور ہم نے آدم کی اولاد کو یقیناً عزت بخشی، خشکی اور سمندر میں اُنہیں سوار کیا، اُنہیں پاکیزہ چیزیں عطا کیں اور اپنی بہت سی مخلوقات پر اُنہیں فضیلت عطا کی۔ (اسراء : ۷۰)

بات چل رہی تھی حیاتیاتی ارتقا کی بہ نسبت شعوری اور نفسیاتی ارتقا کی تیزی اور سرعت کی تو اس سلسلے میں ماہرینِ حیاتیات کو اعتراف ہے کہ اس وقت انسانی مرحلے میں " حیاتیاتی ارتقا " رک چکا ہے اور اب " شعور و ادراک " کی کارفرمائی نظر آرہی ہے، جس نے غیر شعوری اور " بے معنی عمل " کی جگہ لے لی ہے۔ مگر ایسا کیوں ہے؟ یہ بات انسان کے علم میں نہیں آسکی ہے۔

The 'interiorization' of the evolutionary process at the stage of man, whereby conscious intelligence succeeded an apparently unconscious and "meaningless" process. In short, cultural evolution succeeded biological evolution, but how it did so remained obscure.[84]

کیا اس کو رُوحِ خداوندی کے جلوے کے سوا کوئی اور نام دیا جاسکتا ہے؟ مادہ پرست لاکھ انکار کریں مگر حقائق اپنی جگہ حقائق ہوتے ہیں۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ - وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ :

اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ اور خود تمہارے انفس میں بھی کیا تم دیکھتے نہیں؟ (ذاریات : ۲۰-۲۱)

چند مسائل اور اُن کا حل

یہ تھی انسانی " ارتقا " کی کہانی اور زمین سے برآمد ہونے والے ماقبل تاریخ انسان نما ڈھانچوں یا اُس کے آثار و باقیات ــــــ پر ایک نظر۔ ظاہر ہے کہ اس سے انسانی ارتقا تو ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس وقت موجود شدہ حیوانات و نباتات میں باوجود اپنی نوعی اور قریبی مشابہتوں کے ارتقا ثابت نہیں ہورہا ہے تو پھر زمین سے برآمد ہونے والے چند ٹکڑوں یا اجزا کی بدولت ارتقا کس طرح ثابت ہوجائے گا؟ ہاں البتہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ان اجزا fragments کی اگر واقعی کوئی اہمیت ہے تو پھر ان معدوم شدہ انواع کو کس زُمرہ میں شامل کیا جائے؟ تو جیسا کہ عرض کیا جاچکا اسلامی نقطۂ نظر سے یہ مسئلہ بہت ہی آسان ہے۔ کیونکہ آدم سے پہلے بھی زمین پر جنوں اور

۸۴؎ دی انسائیکلوپیڈیا آف اِگنورنس ، ص ۲۲۸ ، آکسفورڈ ، ۱۹۷۸ء

جِنوں کی آبادیاں رہ چکی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ پچھلی انواع میں سے آدم کس کو قرار دیا جائے اور جِنّ و جنّ کس کو؟ تو یہ مسئلہ اس طرح حل ہوسکتا ہے کہ قرآن اور حدیث میں حضرت آدم علیہ السلام کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں اُن کا انطباق جس نوع پر بخوبی ہو جائے وہی آدم ہے۔ اور اس سے ماقبل کی انواع کو جِنّ اور جنّ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس اعتبار سے جدید انسان modern man پر تو حضرت آدم کا انطباق یقینی ہے، جبکہ کرومیگنن نسل پر مشکوک ہے۔ اگر جدید انسان (جس کا آغاز تقریباً دس ہزار سال پہلے سے مانا جاتا ہے) کا سلسلہ حضرت آدم سے شروع ہوا ہے تو جنّوں کا سلسلہ کرومیگنن نسل سے شروع ہُوا ہوگا۔ یا پھر ہوسکتا ہے کہ وہ نینڈرتھل نسل سے شروع ہُوا ہو۔ مگر اس سلسلے میں قطعیت کے ساتھ کوئی بات بیان کرنا ابھی بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے ہمیں مزید تحقیقات کا انتظار کرنا چاہئے۔

اس موقع پر ایک نہایت درجہ قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ بعض انواع فاسل ریکارڈ سے اچانک غائب کیوں ہوگئیں جیسا کہ نینڈرتھل نسل کے بارے میں کہا جاتا ہے؟ اسی طرح بعض انواع کے درمیان زمانی اعتبار سے خلا کیوں پایا جاتا ہے؟ تو یہ مشکل مسئلہ اسلامی روایات کی روشنی میں بخوبی حل ہوجاتا ہے کہ ان "شعوری انواع" کو ان کی کسی عالمگیر نافرمانی کی پاداش میں پوری طرح ہلاک کر کے ان کی جگہ پر دوسری نوع کو بسایا گیا ہو۔ جیسا کہ قصّۂ آدم کے سلسلے میں مروی ہے کہ تخلیقِ آدم کے موقع پر فرشتوں نے جِنّوں کو مار بھگایا اور اُن کے وجود سے زمین کو پاک کر دیا۔

آدم کون ہے؟

اس موقع پر اسلامی نقطۂ نظر سے چند ایسے حقائق بیان کئے جاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آدم نہ صرف ایک مہذب اور ترقی یافتہ شخصیت کا نام تھا بلکہ وہ انتہائی معزز اور تعلیم یافتہ بھی تھا۔ بلکہ وہ بہت وجیہہ اور خوبصورت شخصیت کا مالک تھا۔ لہٰذا کسی "بُوزنہ" یا "انسان نما بندر" یا "تحت الانسان" پر آدم کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کے متعدد نصوص کی بنا پر حضرت آدم علیہ السلام نہ صرف ابوالبشر تھے بلکہ دُنیا کے اولین نبی اور پیغمبر بھی تھے۔

۱۔ آدم کو دُنیا کی تمام چیزوں کے نام بتا دئے گئے تھے:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا : اور اللہ نے آدم کو سارے نام بتا دئے۔ (بقرہ : ۳۱)

اس کا مطلب یہ ہُوا کہ آدم علم و معرفت کے اُجالے میں نمودار ہُوا تھا، نہ کہ جہل و ناواقفیت کے اندھیرے میں۔ لہٰذا کوئی جنگلی یا غیر مہذب یا جاہل "انسان" آدم نہیں ہو سکتا۔

۲۔ آدم یعنی دنیا کے پہلے انسان کو اُس کی پیدائش کے فوراً بعد بطور معجزہ بولنا سکھایا گیا:

خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ : اللہ نے انسان کو پیدا کر کے اُس کو بولنا سکھایا۔ (رحمان : ۳-۴)

واضح رہے کہ قرآن میں بعض مواقع پر "الانسان" سے مُراد حضرت آدم ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو: حجر ۲۶، مؤمنون ۱۲، سجدہ ۷، رحمٰن ۱۴، اور علق ۵ وغیرہ۔ غرض اس آیت کی تفسیر میں تین اقوال ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت آدم ہیں، جیساکہ ابنِ عباس رضؓ اور قتادہ سے مروی ہے۔ اسی طرح "عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" کے بھی تین مطلب ہو سکتے ہیں: (۱) ہر چیز کے نام (۲) ہر چیز کا بیان، اور (۳) زبانیں۔[۸۵]

نیز ابنِ منذر نے ابنِ جریج رضؓ سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد حضرت آدم ہیں جن کو اللہ نے ہدایت اور ضلالت کا راستہ کھول کر بیان کر دیا تھا۔[۸۶]

اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ "تعلیم" کے لئے نطق و گویائی ضروری ہے۔ اور اس خصوصیت کے بغیر یہ مقصد ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم نہ صرف نُطق و گویائی سے مُتّصف تھے بلکہ ذہنی و دماغی حیثیت سے بھی ایک اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے جس کی بنا پر وہ دُنیا بھر کی چیزوں اور ان کے حقائق کا ادراک کر سکیں۔ اس موقع پر مُفسّرین نے "الاسماء" کی جو تفسیر کی ہے وہ پیش نظر رہنی چاہئے، جس کے مطابق حضرت آدم کو دُنیا بھر کی تمام چیزیں اور ان کی خصوصیات بتا دی گئی تھیں۔[۸۷]

---

۸۵ زاد المسیر فی علم التفسیر، از ابن جوزی : ۸/۱۰۹، مطبوعہ دمشق۔
۸۶ تفسیر درمنثور، علامہ جلال الدین سیوطی : ۶/۱۴۰، بیروت۔
۸۷ ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ۱/۷۲، تفسیر کشاف ۱/۲۷۲، تفسیر روح المعانی ۱/۲۲۴، احکام القرآن جصاص ۱/۳۱، تفسیر کبیر ۱/۲۵۸، تفسیر المنار ۱/۲۶۲۔

جدید اثری تحقیقات کی رُو سے یہ بات ثابت نہیں ہے کہ hominidae خاندان کی کس نوع میں اور کب گفتگو کی زبان کا آغاز ہُوا؟ کیونکہ اُحفوری ہڈیاں اس مسئلے پر کسی بھی طرح کی روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں، لیکن چونکہ اُحفوری انسان بڑے بڑے جانوروں کا شکار کرنے کے لئے گروہوں کی شکل میں رہتے تھے اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ باہم اطلاع دہی کے لئے کچھ غیر لسانی اشارے استعمال کرتے رہے ہوں گے۔[۸۸]

اس لحاظ سے آدم کا اطلاق اس قسم کی کسی گونگی یا اشاراتی زبان میں گفتگو کرنے والی مخلوق پر نہیں ہو سکتا۔

۳۔ کیا حضرت آدم لکھنا پڑھنا جانتے تھے؟ اس موضوع پر حسب ذیل آیات سے کچھ روشنی پڑتی ہے:

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ:

پڑھ اور تیرا رب سب سے بڑھ کر کرم والا ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ سکھایا۔ انسان کو وہ سب سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ (علق : ۳-۵)

کعب کے بیان کے مطابق پہلے لکھنے والے انسان حضرت آدم ہیں[۸۹] اور ابن قتیبہ نے تحریر کیا ہے کہ حضرت آدم لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور آپ پر ۲۱ اوراق پر مشتمل حروفِ معجم نازل کئے گئے تھے۔ یہ دنیا کی پہلی کتاب تھی جس میں تمام زبانوں کی حد بندیاں کر دی گئی تھیں۔[۹۰]

علامہ زرکشی ابوالحسین بن فارس سے نقل کرتے ہیں: بیان کیا جاتا ہے کہ جس نے عربی اور سریانی تمام کتابیں لکھیں وہ آدم علیہ السلام ہیں، جنہوں نے اپنی موت سے ۳ سو سال پہلے مٹی پر لکھ کر اُس کو پکا لیا تھا۔ پھر موصوف فرماتے ہیں کہ خط (تحریر) اکتسابی چیز نہیں بلکہ توقیفی (محض

---

[۸۸] دیکھئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا : ۸/۱۰۲۸ (۱۹۸۳ء) -

[۸۹] تفسیر روح المعانی : ۳۰/۱۸۱، مطبوعہ بیروت -

[۹۰] المعارف، ابنِ قتیبہ، ص ۹، مطبوعہ کراچی -

نوازشِ الٰہی کی بدولت حاصل ہونے والی) چیز ہے۔ پھر وہ مذکورۂ بالا آیات کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ جب حقیقت اس طرح ہے تو پھر یہ بات بعید نہیں ہے کہ اللہ نے حضرت آدم اور دیگر انبیاء کو بغیر اکتساب کے لکھنا سکھا دیا ہو۔[۹۱]

اس وقت تک جو قدیم تحریری سرمایہ دریافت ہُوا ہے وہ قریب قریب ۵ ہزار ۵ سو سال پرانا ہے[۹۲] اور تاریخی نقطۂ نظر سے اس سے پہلے کے دور کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ تحریر کا آغاز درحقیقت کب ہُوا؟ لیکن چونکہ جدید انسان یا موجودہ ھوموسپی ینس h. sapiens سے پہلے کی انواع پر اس کا اطلاق مشکوک ہے۔ لہٰذا گمان کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ سپی ینس ہی "نوعِ آدم" ہوگی۔

۴۔ قرآن مجید کا قطعی بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین شکل و صورت پر پیدا کیا ہے اور اسے بڑے خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ : یقیناً ہم نے انسان کو بہت بہترین انداز میں پیدا کیا ہے۔ (تین : ۴)

لہٰذا بندروں جیسی کوئی کریہہ الخلقت مخلوق آدم نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ شرعی نقطۂ نظر سے بندر اور اسی طرح خنزیر اللہ تعالیٰ کی بدترین مخلوقات میں سے ہیں۔ جیسا کہ قرآن اور حدیث میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض پچھلی اقوام کو ان کے گناہوں کی پاداش میں اُن کی شکلیں مسخ کر کے انہیں بندر اور خنزیر بنا دیا تھا۔ (دیکھئے: مائدہ ۶۰)۔

۵۔ بخاری اور مُسلم کی ایک حدیث میں آتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا"۔[۹۳] اس حدیث پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بہت اعتراض کیا گیا ہے کہ اس سے تو اللہ تعالیٰ کا صاحبِ جسم ہونا ثابت ہوتا ہے وغیرہ۔ اور اس کے مُتکلمانہ نقطۂ نظر سے کئی جوابات بھی دئے گئے ہیں۔

۹۱۔ البُرہان فی علوم القرآن، بدرالدین زرکشی : ۱/۳۷۷، بیروت۔

۹۲۔ ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا : ۸/۱۰۲۹۔

۹۳۔ بخاری کتاب الاستیذان، ج ۷، ص ۱۲۵، استنبول۔ مسلم کتاب الجنۃ ۲۸، ۴/۲۱۸۳، ریاض۔

مگر حقیقت واقعہ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں بعض جدید مسائل کا جواب دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً:

(الف) یہ بیان دراصل خدائے لم یزل کی جانب سے تکریم آدم کے اظہار کے طور پر ہے۔

(ب) یہ بیان آدم کے بوزنہ یا جنگلی یا تحتی انسان ہونے کی نفی کی غرض سے دیا گیا ہے۔

(ج) یہ بیان نظریۂ ارتقا کی تردید میں ایک فرمانِ ربانی ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔

یعنی آدم ارتقا کی پیداوار نہیں تھا اور نہ اُس کی خلقت میں کسی قسم کا تغیر و انقلاب واقع ہُوا۔ بلکہ وہ اپنے پہلے ہی دن ایک مکمل شکل میں قُدرتِ خُداوندی کے طور پر جلوہ افروز ہُوا۔ اس حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں: "خَلَقَ اللّٰہُ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ" اور بعض محدثین کی توجیہہ کے مطابق "علی صُورتہ" میں نحوی اعتبار سے ضمیر آدم کی طرف راجع ہے نہ کہ اللہ کی طرف۔ چنانچہ حافظ ابنِ حجر نے اس توجیہہ کو اختیار کر کے اس حدیث کی یہی تشریح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو یکبارگی اس طرح پیدا کیا کہ آپ کو رحمِ مادر میں مختلف مراحل سے گزرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، جس طرح کہ آپ کی ذریت کا معاملہ ہے۔ بلکہ آپ کو ایک انسانِ کامل کے رُوپ میں پیدا کر کے پہلی بار اُن میں رُوح پھُونکی۔[۹۴]

۶۔ ایک اور حدیث کے ذریعہ اس حقیقت پر مزید روشنی پڑتی ہے کہ حضرت آدم پیغمبرِ آخر زماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرح بہت زیادہ وجیہہ اور خوبصورت تھے، جیسا کہ امام نووی نے تاریخ دمشق کے حوالے سے حضرت عائشہ رضؓ کی روایت اس طرح بیان کی ہے:

قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: أَنَا اَشْبَہُ النَّاسِ بِأَبِیْ آدَمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ۔ وَکَانَ اَبِیْ اِبْرَاھِیْمُ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ أَشْبَہُ النَّاسِ بِیْ خَلْقاً وَخُلْقاً: حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میں تمام لوگوں میں اپنے باپ حضرت آدم سے زیادہ مُشابہ ہُوں۔ نیز میرے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام مجھ سے جسمانی اور اخلاقی دونوں طرح سے مُجھ سے زیادہ مُشابہ تھے۔[۹۵]

---

[۹۴] فتح الباری، حافظ ابنِ حجر: ۳۶۶/۶، دارالافتاء ریاض۔

[۹۵] تہذیب الاسماء واللغات، نووی: ۱/۹۵-۹۶، بیروت۔

اس کا مطلب یہ ہُوا کہ یہ تینوں جلیل القدر پیغمبر (جن میں سے ایک پہلے، ایک آخری اور ایک درمیانی ہیں) شکل و صورت اور چہرے مُہرے کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مشابہ تھے۔ اگرچہ حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے حُلیہ کی کیفیت تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ نہیں ہے، مگر چونکہ پیمبر آخر زماں کا حُلیۂ مُبارک تاریخ کے مُستند ترین ریکارڈ میں موجود و محفوظ ہے اس لئے اگر مذکورۂ بالا روایت صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ آج ہم رسولِ اکرم صلعم کے حُلیۂ مُبارک میں حضرت آدمؑ کے حُلیۂ مُبارک کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ گویا کہ رسولِ آخر کی شبیہہ میں رسولِ اول کا عکس نظر آئے گا۔ بالفاظِ دیگر حضرت آدم غائب و مستور ہوتے ہُوئے بھی آج ہمارے سامنے موجود ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر جامع ترمذی اور شمائل ترمذی سے چند حدیثیں بیان کی جاتی ہیں جن کے ذریعہ آپ کے حُلیہ پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

حضرت براءؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سُرخ لباس میں کسی لمبے بال والے کو رسول اللہ صلعم سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا۔ آپ کے بال کندھوں کو چُھوتے تھے۔ اور آپ کا سینہ بہت کشادہ تھا۔ نہ آپ پست قد تھے اور نہ دراز قد۔[۹۶]

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نہ پست قد تھے اور نہ دراز قد۔ بلکہ درمیانہ قد کے لوگوں میں تھے۔ بال نہ بالکل گھنگھریالے تھے اور نہ بالکل سیدھے، بلکہ تھوڑی سی پیچیدگی لئے ہُوئے تھے۔ آپ نہ بالکل موٹے تھے اور نہ پُوری طرح گول چہرے والے، بلکہ چہرے میں تھوڑی سی گولائی تھی۔ رنگ سُرخی مائل سفید تھا۔ آنکھیں بالکل کالی اور پلکیں لمبی تھیں۔ شانے اور جوڑ بڑے تھے۔ بدن پر بال نہیں تھے، مگر بالوں کا ایک خط سینے سے ناف تک کھنچا ہُوا تھا۔ ہتھیلیاں اور تلوے پُر گوشت تھے۔ جب آپ چلتے تو پیر زمین پر پُوری طرح رکھ کر چلتے گویا کہ آپ نیچے اُتر رہے ہیں۔[۹۷]

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم معتدل اور خوبصورت جسم والے تھے۔ آپ کا

---

۹۶ جامع ترمذی، ابوعیسیٰ ترمذی، ابواب المناقب، باب ما جاء فی صفۃ النبی صلعم۔

۹۷ شمائل ترمذی، باب ما جاء فی خلق رسول اللہ صلعم، ص ۱-۲، مطبع مجیدی کانپور۔

رنگ گندمی تھا۔ جب آپ چلتے تو جھک کر چلتے۔[۹۸]

حضرت براءؓ سے کسی نے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلعم کا چہرہ تلوار کی طرح (لمبا) تھا تو آپ نے جواب دیا کہ نہیں وہ چاند کی طرح تھا۔[۹۹]

۷۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں بعض روایات اس قسم کی بھی ملتی ہیں کہ آپ بے ریش تھے اور ڈاڑھی آپ کے بعد آپ کی اولاد میں ظاہر ہوئی۔ نیز یہ کہ آپ بہت لمبے (بعض روایات میں ساٹھ ہاتھ کے)، گھنے بالوں والے، گندم گوں اور سب سے زیادہ خوبصورت تھے۔[۱۰۰]

۸۔ دورِ آدم سے زراعت اور پارچہ بافی کا آغاز ہوا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت آدم زمین پر اُترے تو آپ نے کھیتی باڑی کی اور حوا نے اُون کاتا اور اُس کو اپنے ہاتھ سے بُنا۔[۱۰۱] (و لما هبط الى الأرض حرث، وغزلت حوا الشعر وحاكته بيدها).

اسی طرح ابنِ عساکر نے حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ آدم علیہ السلام کھیتی کرتے تھے۔[۱۰۲]

نیز دیلمی نے مسند فردوس میں حضرت انسؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اولین پارچہ باف حضرت آدم تھے۔[۱۰۳]

۹۔ حضرت آدمؑ کو تمام ضروری صنعتوں کا علم دیا گیا تھا، جیسا کہ بزاز، ابنِ ابی حاتم اور طبرانی کی ایک مرفوع حدیث سے ثابت ہوتا ہے، جو حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مروی ہے۔[۱۰۴]

۱۰۔ حضرت آدمؑ نہ صرف بہت زیادہ خدا پرست اور متقی انسان تھے، جیسا کہ متعدد روایات سے ثابت ہوتا ہے، (دیکھئے تفسیر درمنثور) بلکہ آپ اسلامی عقیدے کے مطابق زمین پر

---

[۹۸] شمائل ترمذی، باب ماجاء فی خلق رسول اللہ صلعم، ص ۱–۲، مطبع مجیدی کانپور۔
[۹۹] جامع ترمذی، ابواب المناقب: ۵/۵۹۸، احیاء التراث العربی، بیروت۔
[۱۰۰] المعارف، ص ۹، مطبوعہ کراچی۔
[۱۰۱] ایضاً
[۱۰۲] تفسیر درِ منثور: ۱/۵۷
[۱۰۳] ایضاً
[۱۰۴] ایضاً

اولین نبی اور رسول بھی تھے۔ اس پر قرآن اور حدیث دونوں دلیلِ ناطق ہیں۔ مگر طوالت کے خوف سے اس بحث کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس پر مفصل بحث کسی اور موقع پر آئے گی۔

بہرحال یہ اور اس قسم کے دیگر حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ آدم انتہائی مہذب اور ترقی یافتہ نوع کا نمائندہ تھا۔ اب یہ حقائق اثری تحقیقات کی رُو سے جس نوع پر پوری طرح منطبق ہو جائیں اُسی کا اولین نمائندہ آدم مانا جائے گا۔

ارتقا ثابت نہیں ہے

قرآن اور حدیث کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت آدم کی تخلیق ارتقا کے طور پر نہیں بلکہ تخلیقِ خصوصی کے تحت عمل میں آئی تھی۔ لہٰذا حضرت آدم کا اپنے ظہور کے ساتھ ہی ایک واضح تہذیب پیش کرنا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ آپ ارتقائی طور پر نمودار نہیں ہوئے۔ بلکہ ایک غیر مرئی قوت قدم قدم پر آپ کی رہنمائی کر رہی تھی۔

تاریخی نقطۂ نظر سے ظہورِ آدم کے غیر ارتقائی ہونے کی ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ آدم اور آپ کی اولین اولاد اپنے مُردوں کو دفنانا نہیں جانتی تھی۔ بالفاظِ دیگر اُنہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کو اپنے مُردوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے؟ چنانچہ حضرت آدم کے اولین بیٹے قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو وہ نہایت درجہ حیران ہُوا کہ اُسے اپنے بھائی کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟ آخر اللہ تعالیٰ نے ایک کوے کو بھیجا تاکہ وہ زمین کھود کر اُسے دکھائے کہ مُردے کی تدفین کا طریقہ کیا ہے۔ تو قابیل اپنی اس ناواقفیت پر افسوس کے ساتھ پکار اُٹھتا ہے:

قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ : وہ کہہ اُٹھا ہائے افسوس! میں تو اس کوّے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو چھپانے کی تدبیر کرتا۔ اس طرح وہ شرمندہ ہُوا۔ (مائدہ : ٣١)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہورِ آدم ایک بالکل اجنبی اور نئے ماحول میں عمل میں آیا تھا۔ ورنہ آدم اگر ارتقا کا نتیجہ ہوتا یا "سابقہ انسانی قسم کی مخلوق" کے ساتھ اُس کی ملی جلی معاشرت عمل میں

آئی ہوتی تو پھر قابیل کو اپنے بھائی کی لاش ٹھکانے لگانے میں اس قدر پریشانی نہ ہوتی - کیونکہ ظاہر ہے کہ سابقہ ناپید شدہ انواع میں اپنے مُردوں کو دفن کرنے کا رواج تھا، جیسا کہ خود ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا دعویٰ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں آدم اور بنی آدم کو دوسرے انواع کے طور طریقوں اور اُن کے رسم و رواج سے ضرور واقفیت ہوتی -

ایک روایت میں آتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی وفات ہوئی تو فرشتوں نے آپ کو غسل دیا اور حنوط لگا کر آپ کو کفنایا۔ پھر آپ پر نماز پڑھی اور قبر کھود کر دفن کیا۔ پھر آدم کے بیٹوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے بنی آدم ! یہ تمہارے موتا کے بارے میں تمہاری سُنّت ہے اور تم اس سُنّت کو اسی طرح ادا کرو۔[۱۰۵]

تفسیر درِ منثور میں اس معنی کی متعدد روایات مروی ہیں جو حضرت ابنِ عباسؓ وغیرہ سے منقول ہیں۔ ان روایات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آدم اور آپ کی اولاد اپنے مُردوں کو کفنانے دفنانے کے رسوم و آداب سے واقف نہیں تھے۔ لہٰذا اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ آدم اپنی نوع کا اولین نمائندہ تھا۔

وجودِ باری اور تردیدِ ارتقا

آج دُنیا میں بن مانس (بوزنہ) اور انسان کے درمیان والی کوئی بھی نوع جس کو ھومنیڈ hominid کہا جاتا ہے پائی نہیں جاتی۔ اور اس میں ھوموریکٹس (سیدھا چلنے والی مخلوق) کی تمام ذیلی انواع اور ھوموسیپئنس (ذہین مخلوق) کے دو سلسلے : نینڈرتھل نسل اور کرومیگنن نسل بھی شامل ہیں۔ یہ سب انواع معدوم ہو چکی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ انواع دفعتہً اور اچانک رُوئے زمین سے غائب کیسے ہو گئیں جبکہ امیبا amoeba سے لے کر انسان تک دیگر حیاتیاتی انواع کا وجود (باستثنائے چند) ناپید نہیں ہو گیا ؟ آخر انسان سے "قریبی تعلق" رکھنے والی کُل انواع کی غیر موجودگی کیوں ؟ یہ ایک ایسا سوال

---

[۱۰۵] تفسیر درمنثور : ۱/۶۱

ہے جس کا جواب ارتقا پسندوں سے بن نہیں پڑ سکتا۔

اس واقعہ سے نظریۂ ارتقا کی تردید نکلتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بہت ساری انواع کا درمیان سے بالکل غائب ہو جانا کسی غیر معمولی سبب کی نشاندہی کرتا ہے۔ اگر ارتقا واقعی صحیح ہوتا تو قیاس کی رُو سے بجائے کسی قدیم نوع کے جدید نوع کو مٹ جانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ قدیم نوع اپنی قوت اور عددی کثرت میں ہر نئی نوع سے فائق و برتر ہوتی ہے۔ اور ہتھیار سازی کے باب میں خود ماہرین آثارِ قدیمہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا رواج لاکھوں سال سے جاری ہے۔ اور جیسا کہ گزر چکا آج زمین پر جن قدیم ترین اوزار کا پتہ چلا ہے وہ ۲۶ لاکھ سال پُرانے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ موجودہ نظریات کی رُو سے ھوموسیپی ینس اور ھوموپرکٹس سے پہلے بھی ہتھیار سازی کا رواج رہا ہے۔ لہٰذا یہ بات کس طرح قابلِ فہم ہے کہ ایک نئی نوع اپنے ظہور کے ساتھ ہی قدیم نوع کو بالکل ختم کر کے رکھ دے جب کہ وہ ابتداءً ہر اعتبار سے کمزور اور عددی اعتبار سے بالکل قلیل ہوتی ہے؟ مگر یہاں پر جو معمہ ہے اُس کی رُو سے اس کو واقعتاً مقابلہ آرائی کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ یہاں پر تو نئی انواع کے ظاہر ہونے کے وقت یا اس سے پہلے ہی قدیم انواع کا معدوم ہو جانا ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ گزر چکا خود ماہرینِ آثارِ قدیمہ تسلیم کرتے ہیں کہ طبقاتی اعتبار سے بعض انواع کے درمیان زمانی خلا پایا جاتا ہے۔ اور نینڈرتھل نسل کے بارے میں تو صاف طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ فاسل ریکارڈ سے اچانک غائب ہو گئی۔ گویا کہ ایک دوسری نوع اُس کی جگہ لینے کے لئے اچانک ظاہر ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ کم از کم بعض قدیم و جدید انواع کے درمیان کسی "تصادم" یا جنگ و جدال کی نوبت ہی نہیں آسکی۔ بلکہ اس قسم کی کسی معرکہ آرائی کے بغیر ہی سابقہ بہت سی انواع خود بخود ختم ہو گئیں۔ آخر کیوں؟ انہیں کس نے تباہ کیا اور کیسے تباہ کیا؟ یہ ایک ایسی گتھی ہے جس کو ارتقا پسند لوگ کبھی نہیں سلجھا سکتے۔

اس موقع پر ایک جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ hominid خاندان کے علاوہ بھی کئی ایسی انواع گزری ہیں جو آج زمین پر باقی نہیں رہیں، مثلاً ڈینوسار dinosaur وغیرہ۔ لہٰذا ھومینڈ خاندان کی یہ انواع بھی اسی طرح ختم ہو گئی ہوں گی۔ مگر یہ جواب اس لئے صحیح نہیں ہو سکتا کہ ڈینوسار

وغیرہ کا "تعلق" انسان سے بہت دُور کا ہے جب کہ زمین کے حالات ناسازگار تھے۔ یہاں پر سوال صرف قریب ترین انواع کا ہے۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ ان قریب ترین انواع میں سے کوئی بھی نوع آج زندہ نہیں رہی، جب کہ بہت سی کمزور ترین انواع حتیٰ کہ امیبا جیسی یک خلوی Unicellular نوع کا وجود بھی فنا نہیں ہوگیا؟ آخر "ترقی یافتہ" انواع کے مقابلے میں "کمزور انواع" کی یہ سخت جانی کیوں ہے؟ اور وہ کون سے حالات ہیں جن کے باعث ترقی یافتہ انواع تو مٹ گئیں مگر کمزور ترین انواع باقی رہ گئیں؟ جبکہ تنازع للبقاء struggle for existance اور بقائے اصلح survival of fittest کے فلسفے کے تحت تمام کمزور انواع کو فنا کے گھاٹ اُتر جانا چاہیئے تھا۔ آخر یہ کس قسم کا طبیعی انتخاب natural selection ہے جو اُلٹی سمت میں بہہ رہا ہے؟

اب مذہبی نقطۂ نظر سے اس مشکل ترین مسئلے کا حل یہ ہے کہ اگر مذکورۂ بالا واقعات اسی طرح ہیں جس طرح کہ ماہرینِ آثارِ قدیمہ بیان کرتے ہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا دستِ قدرت نے انسان کی عبرت و بصیرت کے لئے یہ آثار و باقیات بطورِ ثبوت طبقات الارض کے ریکارڈ میں نہایت درجہ احتیاط کے ساتھ رکھ چھوڑے ہیں۔ تاکہ اس سے موجودہ دور میں دوہرے فوائد حاصل ہوں۔ چنانچہ ان اکتشافات کے ذریعہ نہ صرف خُدا کا وجود ثابت ہوتا ہے بلکہ دینِ اسلام کی حقانیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اس طرح کہ کسی بھی "شعوری نوع" یا "مکلف مخلوق" (موجودہ اصطلاح کے مطابق جنس ھومو کی کوئی نوع) کو اللہ تعالیٰ اس دُنیا میں صرف امتحان اور آزمائش کی خاطر پیدا کرتا ہے تاکہ وہ ہمیشہ خیر و شر میں تمیز کرے اور اطاعتِ الٰہی سے رُوگردانی نہ کرے۔ اور پھر مسلسل نافرمانی کے نتیجے میں اس کو ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ جیساکہ قرآنِ حکیم میں جا بجا اقوامِ عالم کی سرکشی کے سلسلے میں مذکور تنبیہہ و تہدید سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

اس لحاظ سے یہ بات زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ شعوری انواع (ذہین مخلوق) کو ان کی کسی حد سے زیادہ نافرمانی کی پاداش میں عالمگیر طور پر ہلاک کر دیا ہو۔ جیساکہ قصۂ آدم کے سلسلے میں پچھلے صفحات میں مذکور روایات سے اس موضوع پر بخوبی روشنی پڑتی ہے کہ کس طرح

اللہ تعالیٰ نے ایک آسمانی مخلوق کے ذریعہ جنّوں کو (جو آدم سے پہلے زمین پر آباد تھے) مار بھگایا اور ان کے وجود سے زمین کو پاک وصاف کر دیا۔

قوموں کی تباہی کا اسلامی فلسفۂ تاریخ

قرآن مجید میں جہاں پر پچھلی انسانی قوموں کی تباہی وبربادی کا تذکرہ کیا گیا ہے تو وہاں پر اُس کا فلسفہ بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ خُدا فراموشی اور زمین میں حد سے زیادہ سرکشی، فتنہ وفساد اور ناحق کوشی وغیرہ، جس کی تعبیر قرآن مجید میں زیادہ تر "ظلم وزیادتی" کے الفاظ سے کی گئی ہے، کی وجہ سے پچھلی قوموں کا صفایا کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ "سُنّتِ الٰہی" یا خدائی قانون ہے جو ماقبل آدم انواع اور سابقہ اُمم بنی آدم دونوں پر یکساں طور پر صادق آسکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر جس طرح جنّوں اور جنّوں کو اُن کے گُناہوں کی پاداش میں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا اسی طرح عاد وثمود اور دیگر بہت سی قوموں کو بھی دُنیا کے اسٹیج سے اُتار دیا گیا۔ ازل سے یہی سُنّتِ الٰہی رہی ہے جو ابد تک جاری رہے گی اس میں کبھی کوئی استثنا نہیں رہا ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰۗىِٕفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ : اور یقیناً ہم نے تم سے پہلے کئی اُمتوں کو ہلاک کر دیا جب کہ اُنہوں نے ظلم کی راہ اختیار کی، حالانکہ (ہمارے) رسول اُن کے پاس کُھلی کُھلی نشانیاں لا چکے تھے، مگر وہ (ان پر) ایمان لانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ اور ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر اُن کے بعد ہم نے تمہیں زمین میں جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو؟ (یونس : ۱۳-۱۴)

ان دو آیات میں مختصر طور پر اقوامِ عالم کے سلسلے میں نہ صرف خُدائی قانون کی وضاحت کی گئی ہے بلکہ "خلافتِ ارض" کا پورا فلسفہ بھی سمجھا دیا گیا ہے۔ نیز اسی طرح ارشادِ باری ہے:

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰي عُرُوْشِهَا

اس طرح ہم نے کتنی ہی بستیوں کو تباہ کر دیا جو ظالم بن چکی تھیں، (وہ دیکھو) وہ اپنے چھتوں کے بل گری پڑی ہیں۔ (حج : ۴۵)

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْماً اٰخَرِيْنَ:

اور ہم نے کتنی ہی بستیوں کو غارت کر دیا جو ظالم تھیں، اور ان کے بعد ہم نے دوسری قومیں پیدا کیں۔
(انبیاء: ۱۱)

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَالَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا ص وَجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْناً اٰخَرِيْنَ : کیا اُنھوں نے مشاہدہ نہیں کیا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا! اور ہم نے اُنہیں زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا۔ اور ہم نے ان پر آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں۔ پھر ہم نے اُن کے گناہوں کی پاداش میں اُنہیں ہلاک کر کے ان کے بعد دوسری اُمتوں کو پیدا کیا۔ (انعام:۶)

یہ آخری آیتِ کریمہ اپنے اسلوب کے لحاظ سے بہت اہم ہے جو عصرِ جدید پر اس حیثیت سے بھی صادق آسکتی ہے کہ اس میں گزشتہ قوموں کی تاریخ اور اُن کے آثار سے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور اس میں جدید اثریات یا اُحفوریات Paleontology کا مطالعہ بھی شامل ہو سکتا ہے جو آج پوری نوعِ انسانی کے سامنے ایک سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو گیا ہے، جبکہ حقیقت بالکل سامنے ہے۔ صرف دیدۂ بینا کی ضرورت ہے۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ موجودہ ایٹمی اور بین السیاراتی میدان میں آج انسان نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ آج کی دو بڑی طاقتوں کے درمیان کوئی بھی تصادم (اگرچہ وہ کسی غلط فہمی ہی کی بنیاد پر کیوں نہ ہو) پوری انسانی آبادی کو تہس نہس کر سکتا ہے۔ اور یہ موجودہ مجرم اور خُدا فروش انسانوں کی سزا ہو گی جس کا بُھگتان پوری نوعِ انسانی کو دینا ہو گا۔ اور اس صُورت میں بغیر "خُدائی مداخلت" کے ایک اور دور کا "خاتمہ بالخیر" ہو جائے گا۔ گویا کہ انسان

خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ شاید ایسا ہی کوئی موقع اعلانِ قیامت اور حشرِ آخرت کا ہو۔

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ : تم پر آگ کے شعلے اور دُھواں چھوڑا جائے گا۔ پھر تم اپنا بچاؤ نہ کر سکو گے۔ (رحمٰن : ۳۵)

موجودہ انسان کے لئے ایک انتباہ

غرض پچھلی "شعوری انواع" کا اس طرح اچانک اور دفعتاً غائب ہو جانا موجودہ انسان کے لئے ایک زبردست تنبیہہ ہے، اور خصوصاً ارتقائیوں evolutionists کو کہ وہ خدا کے وجود کو اب اور زیادہ مذاق نہ بنائیں۔ بلکہ اپنی موجودہ خدا بیزاری کی روش ترک کر کے نہ صرف خدا کا وجود تسلیم کرلیں بلکہ اپنی انانیت اور ہر قسم کی خود غرضی کو ترک کر کے اس عظیم ترین ہستی کی اطاعت بھی دل و جان سے کریں۔ ورنہ خطرہ ہے کہ اپنی مسلسل نافرمانی کی پاداش میں موجودہ انسان بھی اسی طرح اچانک اور دفعتہً "خُدائی مار" یا "ضربِ ملکوتی" کی زد میں نہ آجائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس دُنیا میں کسی بھی "شعوری مخلوق" کو کام کرنے کی آزادی دینے کے ساتھ ساتھ کچھ ڈھیل بھی ضرور دیتا رہتا ہے، تاکہ اگر وہ سنبھلنا چاہے تو سنبھل جائے۔ مگر جب وہ بار بار کی تنبیہہ کے باوجود اپنی نافرمانی پر بالکل ہی اَڑ جاتا ہے تو پھر اس کا دفعتہً اور اچانک خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ جیساکہ پچھلی شعوری انواع homo genus کا انجام آج ہمارے سامنے ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں اپنے قانون کی وضاحت اس طرح کرتا ہے:

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۔ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ : اور ہم نے جتنی بھی بستیوں کو اُجاڑا اُن سب کے لئے ایک لکھا ہوا وقت مقرر ہو چکا تھا۔ (اس لحاظ سے) کوئی بھی اُمّت اپنے مقرّرہ وقت سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے۔ (حجر : ۴-۵)

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ

مِنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ۔ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ : اور ہم نے کتنی ہی بستیوں کو غارت کر دیا جو اپنے سامانِ معیشت پر نازاں تھیں ۔ وہ (دیکھو) اُن کے (تباہ شدہ) مکانات جو اُن کے بعد بہت ہی کم آباد ہو سکے ہیں ۔ (اس طرح نتیجے کے طور پر) ہم ہی وارث ٹھہرے ۔ اور تیرا رب آبادیوں کو (بلا وجہ) غارت نہیں کرتا، جب تک کہ اُس کے مرکز میں کسی رسول کو نہ بھیجے ، جو اُنہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا ہو ۔ اور ہم آبادیوں کو اُس وقت تک تباہ نہیں کرتے جب تک کہ اُن کے باشندے ظالم نہ ہو جائیں ۔ (قصص : ۵۸ - ۵۹)

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ : اور یقیناً ہم نے تم جیسے (بہت سوں) کو غارت کر دیا ہے ۔ تو کیا کوئی ہے سبق حاصل کرنے والا ؟ (قمر : ۵۱)

تخلیقِ خصوصی کا اثبات

حاصل یہ کہ شعوری انواع یا "مکلّف مخلوق" کا یہ مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ انواع رُوئے زمین پر اچانک ظاہر ہوئیں اور اچانک مٹ گئیں ۔ یہ "تخلیقِ خصوصی" کی ناقابلِ تردید دلیل ہے ۔ اگر وہ ارتقائی طور پر نمودار ہُوئی ہوتیں تو وہ دفعتہً کبھی غائب نہ ہو سکتیں، جیسا کہ دیگر انواعِ حیات جو ان سے کمتر ہیں وہ آج بھی موجود ہیں ۔ اس لئے اب یہاں پر ایک مافوق الفطرت ہستی کا وجود ثابت ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ اور کوئی بھی توجیہہ صحیح نہیں ہو سکتی ۔ ظاہر ہے کہ ایک نئے نوع کا اچانک ظاہر ہونا اور اچانک مٹ جانا آخر کیا معنی رکھتا ہے، سوائے اس کے کہ اس پردۂ زنگاری کے پیچھے کسی برتر ہستی کا وجود ہے جو ان کٹھ پُتلیوں کو نچا رہی ہے ؟ یہ الگ بات ہے کہ ان انواع میں بتدریج "شعور" یا دماغ کی زیادتی پائی جاتی ہو ۔ مگر یہ سب ربّانی مشیّت اور اُس کی حکمتوں کے تحت ہے، جس کو ارتقا کا نام کسی بھی طرح نہیں دیا جا سکتا ۔ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے یکے بعد دیگرے مختلف مخلوقات کو پیدا کرتا ہے ۔ اور اُس کی تخلیقات کی سب سے بڑی خصوصیت یا "ربانی چھاپ" یہ ہے کہ مختلف انواعِ حیات میں "یکسانیت" اور "مُشابہت" بھی پائی جاتی ہے، جو "وحدتِ خُدائی" اور "وحدتِ تخلیق" کے

اظہار کے لئے ہے، جس کو غلطی سے موجودہ انسان نے ارتقا کا نام دے دیا ہے۔ گویا کہ "صنعتِ ربّانی" کو سمجھنے میں موجودہ انسان نے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ دستِ قدرت کے معجزات کے بغیر محض ارتقائی حیثیت سے حیات کے اتنے سارے کرشمے کبھی ظاہر نہیں ہو سکتے اور ایک "نابینا" مادہ ان کرشمہ ہائے حیات کی علت ہرگز نہیں بن سکتا، جس کی نیرنگیاں خود انسان کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مادہ پرستوں نے خُدا کی جگہ "مادہ" کو بٹھا دیا ہے اور اُس کی طرف وہی خصوصیات منسوب کر رہے ہیں جو خُدا کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے معمائے حیات کبھی کھل نہیں سکتا بلکہ وہ اور زیادہ پُراسرار بن جاتا ہے۔

انسان اصلِ حیات سے ناواقف

جس طرح انسان طبیعی و حیاتیاتی دنیا کے بہت سے اسرار کو نہیں جانتا بلکہ اپنی "محدودیت" کی وجہ سے نہیں جان سکتا، اسی طرح وہ "تخلیقِ خصوصی" کی کُنہ و حقیقت کو بھی صحیح صحیح سمجھ نہیں سکتا۔ یہ دراصل خلّاقِ عالم کی طرف سے انسان کی عبرت و بصیرت کے لئے چند اسرار ہیں جن کا اسرار رہنا ہی بہتر ہے۔

بہرحال کسی نئی نوع کا ظہور بالکل اچانک اور دفعۃً ہوتا ہے، جس طرح کہ کسی نوع کا خاتمہ اچانک اور ناگہانی طور پر ہو جاتا ہے۔ قصّۂ آدم میں انہی تمام حقائق کا اظہار کیا گیا ہے اور موجودہ اُحفوری ریکارڈ سے اس کی بخوبی تصدیق و تائید ہوتی ہے۔ انسان کی فہمائش کے لئے اس تخلیقِ خصوصی کے متعلق صرف اتنا ہی بتا دینا کافی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کا ایک پُتلا بنا کر اس میں اپنی رُوح پھونک دی۔ اس سے زیادہ انسان کچھ بھی سمجھنے کا متحمل نہیں تھا۔ اور آج بھی سائنس کی ہمہ گیر ترقی کے دور میں انسان اس سے زیادہ کچھ بھی سمجھنے کی استطاعت نہیں رکھتا اور فوق الطبیعی حقائق کا ادراک اپنی ناقص عقل و فہم کی رُو سے کبھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کو وہ علم ہی نہیں دیا گیا جو اصلِ کائنات اور اصلِ حیات کے مُعموں کو کھولنے والا ہو۔ لہٰذا "وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا" (اور تم کو بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے) آج بھی ایک زندہ و تابندہ صداقت ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان باوجود اپنی ہمہ جہتی

ترقیوں کے "حیات" اور "اصلِ حیات" کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تو پھر وہ "تغیراتِ حیات" یا خالق کی کرشمہ سازیوں کو کیا خاک سمجھ سکتا ہے!

چنانچہ حیاتیات کے باب میں سب سے اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ "زندگی" کیا ہے؟ اور مادۂ حیات (پروٹوپلازم) کیونکر وجود میں آیا؟ مگر تمام سائنس داں اس مسئلہ پر مُہر بلب ہیں۔ کیونکہ یہ مسائل انسانی عقل اور اُس کی رسائی سے باہر دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ درحقیقت یہ انسانی دانش کے لئے ایک چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک حیاتیات داں نے تو صاف صاف اپنی نارسائیوں کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ "زندگی بجائے خود پُراسرار ہے، جس طرح کہ خود اُس کے مادے کا راز اب تک پردۂ خفا میں ہے"۔

Life itself is mysterious, and its origin still remains shrouded in mystery.[106]

ایک اور مشہور محقق ڈاکٹر اسیمو Dr. Issac Asimov زندگی کے بنیادی مادّے ڈی، این، اے (D.N.A. : حیوانی اور نباتی خلیوں میں موجود ایک خاص کیمیاوی مادہ، جس میں اُس نوع کی وراثتی خصوصیات موجود رہتی ہیں) کی پُراسرار ترکیب اور اُس کے پُراسرار عمل پر بحث کرتے ہُوئے تحریر کرتا ہے کہ یہ پوری دُنیائے سائنس کو حیران و ششدر کر دینے والا ایک معمہ ہے۔ بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر صاف صاف کہتا ہے کہ اصل زندگی اور مذہبی عقائد کا رشتہ بہت مضبوط ہے۔ اسی بنا پر سائنس داں زندگی اور اُس کے اسرار کی توجیہہ و تشریح بالکل گھٹے گھٹے اور معذرت خواہانہ انداز میں کرتے ہیں۔

......How then, did DNA, and life start? This is a question that science has always hesitated to ask because

---

106. Botany for Degree Students, by A. C. Dutta, P. X, Oxford University Press, 1979.

the origin of life has been bound up with religious beliefs even more strongly than has the origin of the earth and the universe. It is still dealt with only hesitantly and apologetically.[107]

اس لحاظ سے "حیات کی تبدیلیوں" کے بارے میں کسی قسم کی لب کشائی کرنا گویا کہ اپنے "خُدا" ہونے کا دعویٰ کرنا ہے، کیونکہ اس کی حقیقت سوائے خُدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔ چنانچہ مشہور ماہرِ حیاتیات سمپسن Simpson نے ایک جگہ پر بالکل صحیح اعتراف کیا ہے کہ آغازِ حیات کا مسئلہ ایک معمہ ہے جس کا اکتشاف دنیائے سائنس کی دسترس سے باہر ہے۔ اور انسان اس راز کو کبھی نہیں پا سکتا۔

اندھا عقیدہ اور بے دلیل دعوے

یہ اور اس قسم کے دیگر حقائق و اعترافات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ارتقا کا نظریہ محض ایک افسانہ ہے، جس کو مادہ پرستوں نے مذہب اور مذہبی اقدار کی مخالفت میں گڑھا ہے۔ اور یہ آج مذہبی عقیدے کے مقابلے میں ایک دوسرا "متوازی" عقیدہ بن گیا ہے، جس کو ترک کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مادہ پرستوں کو چار و ناچار خُدا کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اس کے سوا اور کوئی تیسرا راستہ موجود نہیں ہے۔ مگر چونکہ الحاد پرور لوگوں کو خُدا کا وجود تسلیم کرنا پسند نہیں ہے۔ (کیونکہ انہیں مذہب اور مذہبی اقدار سے ایک قسم کی چڑ سی ہو گئی ہے) اس لئے وہ اس نظریہ کی صحت پر اصرار کر رہے ہیں، باوجود اس کے کہ عقلی و سائنسی تمام دلائل اس نظریہ کی تائید کی بجائے مسلسل تردید کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اس اعتبار سے یہ موجودہ دور کا سب سے بڑا جھوٹ ہے جو گڑھا گیا ہے۔ اور آج اس پر ایک اندھے عقیدہ کی طرح "ایمان" لایا جا رہا ہے۔ عصرِ جدید کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ آج انسان بغیر علمِ صحیح کے محض ادّعائیت پسند بن گیا ہے اور دعووں پر

107. Asimov's Guide to Science, Vol.2, The Biological Science, PP.172-173, Pelican Books, Middlesex, England, 1978.

دعوے کئے جارہا ہے۔ حالانکہ حقیقت پسندی بلکہ سائنس کی صحیح روح کا تقاضا یہ ہے کہ سائنسی تحقیقات و تجربات کی رُو سے جو کچھ اور جتنا کچھ ثابت ہوتا ہے انسان اس کو ایمانداری کے ساتھ اختیار کرے اور جو چیز اپنے نظریات کے خلاف جا رہی ہو بلکہ انہی صاف صاف جھٹلا رہی ہو انہی ترک کر دے اور بلا وجہ ان پر اصرار نہ کرے، جو علمی روح کے خلاف ہے۔ اس لحاظ سے اصل سائنسی حقائق میں الحاد و لادینیت کے لئے کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ بلکہ الحاد و لادینیت دراصل بعض لوگوں کے اپنے ہی ذہنوں میں ہوتی ہے جو انکارِ حق کے سلسلے میں اپنی نفسانی خواہشات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مگر ان کی یہ خواہشات پوری نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات اور اُس کے مظاہر کو کچھ اس ڈھنگ سے پیدا کیا ہے کہ ان کے اُصول و ضوابط میں الحاد و لادینیت کے لئے حقیقتاً کوئی علمی دلیل فراہم نہیں ہوسکتی۔ مگر الحاد پرور لوگ ان اُصول و ضوابط کو محض مغالطوں کی مدد سے توڑ مروڑ کر انہیں اپنے حق میں کرلینا چاہتے ہیں۔ اس قسم کے رجحانات کو قرآن حکیم میں "خواہشاتِ نفس کا اتباع" "نفس کو معبود بنالینا" "غیر اللہ کی عبادت" "بے علمی کی باتیں" اور "تکبّر" وغیرہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے:

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَاۗءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ : بلکہ یہ ظالم لوگ بغیر علم کے اپنی خواہشات پر چلتے ہیں۔ (روم : ۲۹)

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰي عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰي سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰي بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ: بھلا تو نے اُس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے، اور باوجود جاننے بُوجھنے کے (گمراہ ہو رہا ہے تو) اللہ نے (بھی) اُس کو گمراہ کر دیا اور اُس کے کانوں اور دل پر مُہر لگا دی اور اُس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اب اللہ کے سوا اس کو کون راہ دکھا سکتا ہے؟ پھر تم کیوں نہیں سمجھتے؟ (جاثیہ : ۲۳)

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ : یہ لوگ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جس کی کوئی دلیل اللہ نے نہیں اُتاری اور نہ اُن کے پاس اس کا کوئی علم ہے۔ (حج : ۷۱)

اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ : جو لوگ اللہ کی نشانیوں میں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس (خدا کی طرف سے) آئی ہو (خواہ مخواہ) جھگڑتے ہیں تو ان کے دلوں میں (اظہارِ) بڑائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، جس کو وہ پا نہیں سکتے۔ (مؤمن : ۵۶)

یہ اور اس قسم کی بے شمار آیات الحاد و لادینیت اور ہر قسم کی فکری گمراہیوں کی تردید میں بڑی بلیغ اور معنی خیز ہیں، جن کا مفہوم ہر دور پر صادق آسکتا ہے۔ قرآنِ مجید میں دراصل انکارِ خداوندی کے سلسلے میں اس قسم کی آیات کے ذریعہ ہر دور کے "نفسیاتی احوال و کوائف" اور ان کے بنیادی نکات کو جمع کر دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے اُن کا اطلاق ہر دور میں یکساں طور پر ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآنِ حکیم ہمیشہ تازہ اور سدا بہار نظر آتا ہے۔ اور اس اعتبار سے اس پر کہنگی کی پرچھائیاں کبھی نہیں پڑ سکتیں۔

اس جائزہ سے یہ حقیقت پوری طرح کھل کر سامنے آگئی کہ جس غیر واقعیت پسندی اور ادّعائیت وغیرہ کے طعنے مادّہ پرستوں کی جانب سے اکثر و بیشتر اہلِ مذہب کو دیئے جاتے ہیں، اُن میں وہ خود ہی بُری طرح گرفتار ہیں۔ اب دیکھیئے علمی دُنیا کا یہ ناٹک کب تک چلتا رہے گا اور دُنیا کب تک بے سوچے سمجھے اس پر ایک مذہبی عقیدے ہی کی طرح "ایمان" لاتی رہے گی! مگر یہ تو صاف ظاہر ہے کہ جب کسی چیز کی بنیاد ہی ٹیڑھی ہو تو پھر پوری عمارت ہی ٹیڑھی ہو کر رہ جائے گی۔

قرآنِ عظیم کا نیا اعجاز

غرض ایک طرف قرآنِ عظیم کا بیان کردہ ایک سچا واقعہ قصّۂ آدم ہے اور دوسری طرف آدم سے قبل کی "شعوری مخلوق" سے متعلق تحقیقاتِ جدیدہ ہیں۔ اور ان دونوں کو ملانے اور ان میں تطبیق دینے پر عجیب و غریب حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں اور قرآن عظیم کے اعجاز اور اُس کی صداقت کا ایک نیا اور بے مثال پہلو ہمارے سامنے آتا ہے، جو ایک نئے انداز سے دعوت الی اللہ دینے والا اور پوری نوعِ انسانی کو متنبّہ کرنے والا ہے۔ اور ان حقائق میں عبرت و موعظت کے اتنے پہلو ہیں جو بیان سے باہر ہیں۔ لہٰذا تحقیقاتِ جدیدہ کی بدولت قرآنی بیانات پر کسی قسم کی آنچ نہیں آسکتی،

بلکہ اس کی صداقت وسچائی کے نئے نئے پہلو جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اسی لئے اسلام مظاہر کائنات میں غور و فکر کرنے اور آغازِ حیات کا پتہ لگانے کی تاکید کرتا ہے، تاکہ اس کے ذریعہ جہاں ایک طرف انسان کو اپنی بے چارگی کا صحیح احساس ہو جائے تو دوسری طرف اُس کی تحقیقات خود اُس کے لئے "گلے کا پھندہ" ثابت ہو جائیں۔ بالفاظِ دیگر اُس کی تحقیقات خود اُس کے لئے حجت بن جائیں۔ کیونکہ عقلی دلیلوں کو کبھی کبھی جھٹلایا جا سکتا ہے، مگر علمی وسائنسی دلیلوں کو جھٹلانا مشکل ہے، جو خود اُس کی اپنی تحقیقات کا نتیجہ ہوں۔ اسی بنا پر قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ مظاہر کائنات اور ان کے نظاموں میں غور و فکر کر کے صحیح نتائج اخذ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اور اس اعتبار سے قرآنِ حکیم کا یہ ایک انوکھا اور حیرت انگیز پہلو ہے۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : کہہ دو کہ غور سے دیکھو کہ اجرام سماوی اور زمین میں کیا کیا چیزیں موجود ہیں۔ (یونس : ۱۰۱)

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ : کہہ دو کہ تم زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ تخلیق کا آغاز کس طرح ہُوا ؟ (عنکبوت : ۲۰)

وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ : تمہاری تخلیق اور (زمین پر مختلف) جانداروں کے پھیلاؤ میں یقین کرنے والوں کے لئے نشاناتِ الٰہی موجود ہیں۔ (جاثیہ : ۴)

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ : یہ کلام سارے جہاں کے لئے ایک یاد دہانی ہے۔ اور تم اس کی (سچائی کی) خبر کچھ عرصہ بعد ضرور معلوم کر لوگے۔ (ص : ۸۷-۸۸)

رَسل کے بعض اعتراضات اور قلا بازیاں

عصرِ جدید کے مشہور مُلحد فلسفی برٹرانڈ رسل Bertrand Russel نے اپنی ایک کتاب The Impact of Science on Society (معاشرے پر سائنس کے اثرات) میں بعض "ارتقائی" سوالوں کو چھیڑ کر کچھ قلا بازیاں کھائی ہیں اور یہ فرض کر لیا ہے کہ اس کے اعتراضات کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ یہ اعتراضات بڑے غیر سنجیدہ انداز میں ہیں جن کے ذریعہ در اصل اہلِ مذہب کی توہین مقصود ہے۔ رسل کا اصل مخاطب اگرچہ عیسائی مذہب ہے لیکن جس انداز سے

اُس نے "مذہب" کا نام لیا ہے اس لحاظ سے اس میں دیگر مذاہب بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔ غرض وہ لکھتا ہے:

"انسان کے نظریۂ زندگی اور دُنیا کے تصور پر ڈارونیت کے بہت سے اثرات ہیں۔ انسانوں اور بندروں کے درمیان کسی خاص امتیاز کی غیر موجودگی مذہب کے لئے بہت پریشان کن ہے۔ انسان میں روح کب پھونکی گئی؟ کیا بندر اور انسان کے درمیان کی مخلوق گناہ کرنے اور نتیجتاً دوزخ میں ڈالے جانے کی اہل تھی؟ کیا قدیم انسان نما بندر میں اخلاقی ذمہ داری کا احساس تھا؟ کیا ہوموپکنینسز homo Pikiniensis مردود تھا؟ کیا پلٹ ڈاؤن آدمی جنّت میں جگہ پا سکتا تھا؟ ان سوالوں کا کوئی جواب بھی اُصولوں پر مبنی نہیں ہو سکتا۔"[۱۰۹]

Darwinism has had many effects upon man's outlook on life and the world. The absence of any sharp line between men and apes is very awkward for theology. When did men get souls? Was the missing link capable of sin and therefore worthy of Hell? Did pithecanthropus Erectus have moral responsibility? Was Home Pekiniensis demned? Did pilt-down man go to heaven? Any answer must be arbitrary.[109]

وہ مزید تحریر کرتا ہے:

"ہم اس سوال کو دوبارہ لیتے ہیں کہ اگر قدیم بندر نما انسان زندہ ہوتا تو کیا اسے "حقوقِ انسانی" حاصل ہوتے؟ اگر ھوموپکننسز کیمبرج میں تعلیم پاتا تو کیا وہ نیوٹن کا ہم پلہ ہو سکتا؟ کیا پلٹ ڈاؤن آدمی اتنا ہی ذہین تھا جتنا کہ سسیکس کے اس گاؤں کا رہنے والا موجودہ باشندہ؟ اگر آپ ان سوالوں کے جمہوری طریقے سے جواب دے سکیں تو آپ کو پیچھے دھکیل کر آدم نما بندر کے ساتھ ملایا جا سکتا

---

۱۰۸ و ۱۱۰ کتاب مذکور کا اُردو ترجمہ، از بشیر احمد چشتی، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۵ء

109 & 111. The Impact of Science on Society, P.26, Unwin Paperbacks, London, 1976.

ہے اور اگر آپ اپنی بات پر قائم رہیں تو اساسی طور پر آپ کو امیبا سے ملا دیا جائے گا۔[۱۱۰]

We must ask again : Should Pithecanthropus, if still alive, enjoy 'The Right of Man'? Would Homo Pekinlensis have been the equal of Newton if he could have gone to Cambridge? Was the Pilt-down Man just as intelligent as the present inhabitants of that Sussex village? If you answer all these questions in the democratic sense, you can be pushed back to the anthropoid apes, and if you stick to your guns, you can be driven back ultimately to the ameoba.[111]

اگر رَسل آج زندہ ہوتا تو اُس سے کہا جاسکتا تھا کہ جناب آپ کے تمام سوالوں کے جوابات اُصولی طور پر دے دئے گئے ہیں۔ لہٰذا اب آپ کو اسلام کی صداقت تسلیم کرتے ہوئے خداوندِ خلاّق کی رُبوبیت و اُلوہیت پر ایمان لے آنا چاہیئے۔ اور اس صورت میں آپ کا شمار مؤمنین اور حقیقت پسند لوگوں میں ہوسکتا ہے۔ ورنہ اگر آپ محض علمی تکبّر کا مظاہرہ کرتے ہُوئے حقائق کو جھٹلانا اور ان کا گلا گھونٹنا ہی چاہتے ہوں تو پھر آپ کا درجہ یقیناً بندروں سے مختلف نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ بندر ہی وہ مخلوق ہے جو انسانوں سے کچھ مشابہ ہونے کے باوجود حقائق کو سمجھنے کی استعداد بالکل نہیں رکھتی۔ کیونکہ طویل تجربات سے یہ بات بخوبی ثابت ہوچکی ہے کہ بندروں اور بن مانسوں کو سدھا کر انھیں اشاروں پر نچایا تو جاسکتا ہے مگر انھیں انسان نہیں بنایا جاسکتا۔

بعض انواع دیکھنے میں تو بہت قریبی اور مُشابہ نظر آتی ہیں، مگر ان دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً خچر اور گھوڑے میں کچھ یکسانیت نظر آتی ہے، مگر کون کہہ سکتا ہے کہ گھوڑے میں جو پھرتی ہے وہی خچر میں بھی ہے! ظاہر ہے کہ گھوڑا گھوڑا ہے اور خچر خچر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خچر ہزاروں لاکھوں سال سے خچر ہی کیوں ہے؟ اور وہ "ترقی" کرتے کرتے گھوڑے کے مقام و مرتبے تک کیوں نہیں پہنچ گیا؟ حالانکہ وہ گھوڑے ہی کے مادۂ منویہ سے پیدا ہُوا ہے، مگر اس کے باوجود وہ گھوڑا کیوں نہیں بن سکا؟ آخر اس کے پیروں میں بیڑیاں کیوں پڑی ہُوئی ہیں؟ اسی پر دوسری انواع کو بھی قیاس

کر لیجئے۔ لہٰذا یہ سوال ہی بالکل مہمل ہے کہ اگر کوئی سابق بندر نما انسان آج موجود ہوتا تو کیا وہ نیوٹن یا کسی اور ذہین انسان کے مقام تک پہنچ سکتا تھا ؟

رَسَل کی جہالت

جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے حوالے سے تفصیل گزر چکی "پلٹ ڈاؤن انسان" احفوریات کا کوئی اصلی نمونہ نہیں تھا' بلکہ وہ ایک نقلی اور جعلی چیز تھی' جس کے ذریعہ سائنس دانوں کو دھوکا دینا مقصود تھا۔ مگر حیرت اور عبرت کی بات ہے کہ موجودہ دَور کے سب سے بڑے فلسفی کی نظر سے یہ حقیقت اوجھل رہی' جس کی بنا پر وہ "پلٹ ڈاؤن انسان" کا تذکرہ اس انداز سے کر رہا ہے گویا کہ وہ ایک اصلی نمونہ ہے۔

رَسَل کی پیدائش ۱۸۷۲ء میں اور وفات ۱۹۷۰ء میں ہُوئی ہے۔ اور اس کی مذکورۂ بالا کتاب پہلی بار ۱۹۵۲ء میں چھپی تھی' یہ اُسی سال کا واقعہ ہے جس سال کہ پلٹ ڈاؤن انسان کا جعلی ہونا ثابت ہو گیا تھا۔ مگر رَسَل جیسے فلسفیٔ اعظم کو اس کی کوئی خبر نہ ہو سکی۔ ہو سکتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ یہ نتائج منظرِ عام پر آنے سے پہلے ہی کتاب شائع ہو گئی ہو۔ مگر اس کا کیا جواز ہے کہ اس کے بعد بھی رَسَل کی زندگی ہی میں اس کتاب کے متعدد ایڈیشن نکلتے رہے مگر مذکورۂ بالا عبارت جوں کی توں رہی؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رَسَل پر آخر وقت تک بھی "پلٹ ڈاؤن انسان" کی اصلیت واضح نہ ہو سکی اور وہ اس کو برابر ایک اصلی نمونہ ہی تصوّر کرتا رہا۔ یہ ہے عصرِ جدید کے سب سے بڑے اور عظیم ترین فلسفی کی معلومات کا حال' جن کے بل بوتے پر وہ دین و مذہب پر طنز و تعریض کرنے چلا ہے ! فاعتبروا یا اُولی الاَبصار !!

اسلام پر ایک اعتراض اور اُس کا جواب

غرض یہ تھی "ارتقا" کی داستان اور اُحفوریات fossils کی کہانی' اور یہ تھا "تخلیقِ انسانی" سے متعلق اسلامی عقائد و نظریات کی صداقت کا حال' جس سے ناواقفیت کے باعث یہ اور اس قسم کے دیگر اسلامی عقائد کو بھی "اُسطوریات" کی قبیل سے سمجھ لیا گیا تھا۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا

تک میں Creation, myth and doctrines of کے زیرِ موضوع Islamic doctrine and myth (اسلامی عقیدہ اور خرافات) کا بھی ایک عنوان نظر آتا ہے[۱۱۲] گویا کہ اس کے ذریعہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ دنیا کے دیگر افسانوی مذاہب کی طرح اسلام بھی اُسطوری اور خیالی قصے کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے۔

اور دوسرا تاثر یہ دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام کوئی مستقل مذہب نہیں بلکہ یہودیت اور عیسائیت ہی کا خوشہ چین اور انہی کی روایات سے ماخوذ ہے۔ مثال کے طور پر برٹانیکا کا ایک بیان دیکھئے جس میں کہا گیا ہے کہ اسلام میں خُدا کی قُدرت، اُس کے عدل اور اُس کی رحمت کے جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی روایات ہی سے کچھ ترمیمات کے ساتھ ماخوذ ہیں:

> This picture of God - wherein the attributes of power, justice, and mercy interpenetrate - is related to the Judeo-Christian tradition, whence it is derived with certain modifications.[113]

مگر اب ان بھلے مانسوں سے سوال یہ ہے کہ جب اسلام بھی افسانوی اور اُسطوری قصّے کہانیوں کا مجموعہ یا وہ یہودیت و عیسائیت ہی سے ماخوذ ہے تو پھر ہمیں بتایا جائے کہ ان جدید ترین مسائل و واقعات کے مقابلے میں اسلام کامیاب کیوں دکھائی دے رہا ہے اور یہودیت و عیسائیت اور اسی طرح دیگر افسانوی مذاہب ناکام کیوں نظر آ رہے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سے نہ صرف ان دونوں دعووں کا ابطال ہوتا ہے بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نہ تو اُسطوریات کا مجموعہ ہے اور نہ وہ یہودیت و عیسائیت سے ماخوذ ہے۔ بلکہ یہ بھی بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ آج اسلام کے سوا بقیہ تمام مذاہب اور اُن کے صحیفے آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ایک زندہ مذہب کو ایک مُردہ مذہب سے ماخوذ بتانا حقیقت واقعہ کا مُنہ چڑانا ہے۔

---

[۱۱۲] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (خورد): ۳/۲۲۶-۲۲۷، ۱۹۸۳ء
[۱۱۳] ایضاً: ۹/۹۱۳

یہ اور اس قسم کے جو الزامات آج مغربی فاضلوں کی جانب سے اسلام پر لگائے جاتے ہیں وہ اسلام کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ بلکہ اب سے چودہ سو سال پہلے نزولِ قرآن ہی کے دور میں خود مشرکینِ عرب بھی اسی قسم کے الزامات لگا چکے ہیں:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۔ وَقَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا:

اور منکرینِ خدا کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) تو محض ایک جھوٹ ہے جس کو (محمدؐ) نے گھڑ لیا ہے۔ اور دوسرے لوگوں نے بھی اس میں اس کی مدد کی ہے۔ اس طرح وہ ناحق گوئی اور غیر واقعی بات کے مرتکب ہو چکے ہیں۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ تو اگلوں کے افسانے ہیں جن کو (محمدؐ) نے لکھوا لیا ہے۔ اور وہی اُس کے سامنے صُبح شام پڑھے جاتے ہیں۔ (فرقان: ۴-۵)

مگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مشرکینِ عرب اس قسم کے شُبہات تو ہمیشہ پیش کرتے رہے مگر وہ کوئی ثبوت فراہم نہ کر سکے۔ قرآن مجید نے اس قسم کے تمام شبہات کو اپنے سفینے میں محفوظ کر کے مختلف مواقع پر ان کا مدلّل و مُسکِت جواب دیا ہے جو بجائے خود ایک اعجاز ہے۔ اور اس قسم کا ایک معقول جواب انہی آیاتِ مذکورہ کے بعد اس طرح دیا ہے:

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: کہہ دو کہ اسے تو اُس ہستی نے اُتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھیدوں کو جاننے والا ہے۔ (فرقان: ۶)

اور اس جواب کی صداقت عصرِ قدیم سے زیادہ عصرِ جدید میں ظاہر ہو رہی ہے۔ اور اس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر یہ قرآن کسی انسان کا گھڑا ہوا کلام یا افسانوی قصّے کہانیوں کا مجموعہ ہوتا تو اس میں مظاہرِ کائنات اور ان کے اسرار سے متعلق صحیح صحیح معلومات ہرگز مذکور نہ ہوتیں جن کی صداقت کا حال ہزاروں سال بعد کی تحقیقات کے ذریعہ بخوبی ہو سکتا ہو۔ قرآنِ مجید میں اسرارِ کائنات کے مذکور ہونے کا صاف و صریح مطلب یہی تو ہے کہ وہ ایسی ہستی کی طرف سے ہیں جو خود ان اسرار کو جاننے والی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اس آیتِ کریمہ کا منطقی نتیجہ ہے، جس سے نہ صرف اس کلام کا برحق ہونا ثابت

ہوتا ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کائنات میں ایک ہمہ داں اور ہمہ بیں ہستی کا وجود بھی ہے، جو کائنات کے سارے رازوں سے واقف ہے۔ اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہی ہستی اس کائنات کی خالق اور مُدبّر ہے، ورنہ وہ تمام "رازہائے تخلیق" سے واقف نہ ہوتی۔ لہٰذا ثابت ہُوا کہ جس ہستی نے اس کائنات کی تخلیق کی ہے اُسی نے اس کتابِ برحق کو بھی نازل کیا ہے۔ اس طرح ان دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔

غرض اس اعتبار سے بھی قرآن مجید ایک حیرت انگیز کلام بلکہ ایک معجزہ ہے، جو ابدی حقائق یا "رازہائے ربوبیت" کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے لازوال سچائیوں سے بھرپور ہے۔ اور اس کا یہ معجزہ تحقیقاتِ جدیدہ کی بدولت دن بدن روشن تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ : ہم عنقریب اپنی نشانیاں انہیں دکھا دیں گے اطرافِ عالم میں بھی اور خود ان کے اپنے نفوس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ کلام برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تمہارا رب ہر چیز سے آگاہ ہے؟ (حٰمٓ سجدہ: ۵۳)

قرآن کلامِ الٰہی

ان مباحث و ملاحظات سے بخوبی ثابت ہو گیا کہ قرآنِ مجید کلامِ الٰہی ہے، نہ کہ کسی انسان کا تراشیدہ کلام۔ اور یہ وہ کلام ہے جو خلاقِ فطرت کی جانب سے اپنے سب سے برگزیدہ بندے و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بطورِ وحی اُتارا گیا تھا۔ اور اس کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک مکمل دینی و شرعی ضابطہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسرارِ کائنات اور ان کی گرہوں کو کھول کر جدید ترین علمی مسائل کو حل کرنے کی استعداد بھی بخوبی رکھتا ہے۔ اور اس اعتبار سے وہ پوری نوعِ انسانی کے لئے نامۂ ہدایت ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا : یہ غیب کی خبریں ہیں، جن کی اطلاع ہم بذریعہ وحی تمہیں دے رہے ہیں۔ یہ باتیں اس سے پہلے نہ تو تم جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم۔ (ھود: ۴۹)

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ : میں تو صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف بطور وحی بھیجی جاتی ہے۔ اور میں تو صاف طور پر متنبہ کرنے والا ہوں۔ (احقاف : ۹)

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۔ قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ : اور ہم نے نوعِ انسانی کے لئے ہر قسم کی مثال بیان کر دی ہے تاکہ وہ چونک سکیں۔ (یہ) قرآن فصیح اور غیر پیچیدہ (کلام) ہے تاکہ وہ (ان مطالب عالیہ کی کچھ) پرواہ کرسکیں۔ (زمر : ۲۷-۲۸)

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا : بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان (حق و باطل میں تمیز کرنے والی کتاب) نازل کی تاکہ وہ سارے جہان کو متنبہ کرسکے۔ (فرقان : ۱)

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۔ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۔ وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ : اور یہ قرآن رب العالمین کا اُتارا ہوا ہے۔ اسے امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔ یہ کلام شُستہ عربی میں تیرے قلب پر اُتارا گیا ہے تاکہ تو متنبہ کرنے والا بن سکے۔ اور اس قرآن کی خبر اگلی (اُمتوں کی) کتابوں میں بھی موجود ہے۔ (شعراء : ۱۹۲-۱۹۶)

اس طرح یہ کتاب کہاں سے آئی؟ کس کے پاس آئی؟ کس ذریعہ سے آئی؟ کس طرح اور کیوں آئی؟ ساری باتیں صاف صاف بتا دی گئی ہیں۔ اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اس کتاب (قرآن) کی صحت و صداقت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس کی خبر تورات اور انجیل وغیرہ قدیم صحیفوں میں بھی موجود ہے۔ اور اس قسم کا کوئی بھی دعویٰ تورات یا انجیل یا دنیا کے کسی بھی صحیفے نے کبھی نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے تمام صحیفے اپنے دور کے لئے مُوقّت اور عارضی طور پر تھے۔ اور ابدی و دائمی صحیفہ صرف قرآن مجید ہے۔ اور اس اعتبار سے وہ زندگی کے میدان میں آج منفرد اور یکتا دکھائی دیتا ہے۔

وللہ الحمد۔

حصّۂ دُوم

تیسرا باب

نظریۂ ارتقا اور دانشورانِ اسلام

قرآن اور نظریۂ ارتقا میں تطبیق ممکن نہیں

اسلام کے علاوہ دیگر تمام آسمانی مذاہب اس خاکدانِ عالم میں ایک خالق و مدبر ہستی کے وجود کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ عالمِ انسانی کے اولین فرد بشر حضرت آدم علیہ السلام تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے تخلیقِ خصوصی کے طور پر پیدا فرمایا تھا۔ مگر یہ عقیدہ چونکہ نظریۂ ارتقا سے میل نہیں کھاتا، بلکہ اس کی ضد سمجھا جاتا ہے اس لئے بعض روشن خیال "مفکرین" نے ان دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش اس طرح کی کہ نظریۂ ارتقا کو تو جوں کا توں قبول کرلیا تاکہ نام نہاد اہلِ علم کی مخالفت نہ ہو، مگر مذہبی عقائد کی تاویل کرنی شروع کردی۔ حتیٰ کہ قرآن مجید کے واضح نصوص تک کو اپنی من مانی تاویلات کے ذریعہ بدل ڈالنے میں بھی کسی قسم کی قباحت محسوس نہیں کی، کیونکہ یہی ایک سستا کام ہے۔ گویا کہ ان کی نظر میں قرآن تک میں دُور از کار تاویل بلکہ تحریف ہوسکتی ہے مگر نام نہاد دانشورانِ علم کے اقوال یا ان کے نظریات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ جب کہ یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ نظریۂ ارتقا اور اس قسم کے دیگر نظریات محض مذہب دشمنی کی خاطر فروغ دیئے گئے ہیں اور ان میں سائنٹسٹوں سے زیادہ مُلحدین اور مادہ پرستوں، اشتراکیوں، یہودیوں اور اُن کی خُفیہ تنظیموں (صیہونیت اور ماسونیت) وغیرہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے، جنھوں نے دُنیا میں تاراج پھیلانے اور اپنے قومی اغراض و مقاصد کو بروئے کار

لانے کی غرض سے نہایت درجہ منظم طور پر اس نظریہ کی تبلیغ کی ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

اس لحاظ سے یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ وہ نظریہ ـــ بلکہ ایک مفروضہ ـــ جو مذہب دشمنی کو فروغ دینے کی غرض سے اختیار کیا گیا تھا اُس کو بعض "نادان دوستوں" نے عین اسلام اور عین قرآن قرار دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچایا!

عقل بسوزد ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تخلیقِ آدم اور نظریۂ ارتقا دونوں بیک وقت صحیح نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا پڑے گا۔ قرآن مجید میں جس اولین بشر یعنی حضرت آدمؑ کی تخلیقِ خصوصی کا ذکر جس انداز میں ـــ صاف و صریح بیّنات کے ساتھ ـــ کیا گیا ہے اور صحیح احادیث میں اس واقعہ کی جس طرح شرح و تفسیر کی گئی ہے، اس کے پیشِ نظر نظریۂ ارتقا ایک غلط اور خود ساختہ نظریہ قرار پاتا ہے، جو آج محض ایک نظریہ نہیں رہا بلکہ ایک اچھے خاصے "عقیدے" کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظریۂ ارتقا کو صحیح ماننے کا مطلب صراحتاً قرآن اور اسلام کا انکار ہے۔ ان دونوں میں جمع و تطبیق نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہر شخص کو فکری اعتبار سے آزادی حاصل ہے کہ وہ دلائل و براہین کی رُو سے جو بھی نظریہ اختیار کرے ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرے۔ دونوں کو بیک وقت صحیح ماننا علمی اعتبار سے ایک زبردست قسم کا تعارض و تضاد بلکہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ خُدا اور صنم دونوں کو بیک وقت خوش نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کو خوش کرنا پڑے گا۔

مگر واقعہ کے لحاظ سے تو یہاں پر خود ارتقا بھی ثابت نہیں ہے، جیسا کہ پچھلے ابواب کے مباحث سے بخوبی واضح ہو گیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریہ علمی و شرعی دونوں حیثیتوں سے غلط اور باطل ہے۔ قرآن اور حدیث کے تمام بیانات دلیلِ ناطق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نوعِ بشری کے جس اولین فرد کو اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا کیا تھا وہ ابوالبشر آدم تھا، جیسا کہ تفصیل اگلے ابواب

میں آرہی ہے۔

قرآن کے تمثیل ہونے کا قصّہ

واقعہ یہ ہے کہ بعض مسلم علماء اور دانشوروں نے جو عموماً فکرِ مغرب کے خوشہ چیں یا اس سے مرعوب و متاثر تھے، دانستہ یا نادانستہ طور پر وقت کے تمام "مقبول نظریات" کو اسلامی اور خالص قرآنی نظریات ثابت کرنے کا بیڑا اٹھایا، خواہ وہ نظریات حقیقتاً اس سے ٹکراتے ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اس باب میں بعض راسخ العقیدہ علماء بھی مغرب کے فن پروپگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ روشن خیالوں کے نزدیک قرآن فہمی کے لئے بس اتنا ہی کافی تھا کہ جو قرآنی آیات و نصوص (واضح بیانات) صاف صاف جدید نظریات کے خلاف ہوں، اُن کے متعلق صرف اتنا کہہ دیا جائے کہ یہ قرآن کا محض ایک "تمثیلی" اندازِ بیان ہے، ورنہ اس کا ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے۔ بلکہ حقیقتاً قرآن کا منشا بالکل وہی ہے جس کا آج کل "علمی حلقوں" میں چرچا ہو رہا ہے۔ اگرچہ قرآنی منشا و مفہوم — صحیح قرآن فہمی کی رُو سے — جدید رُجحانات سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو۔ یہ گویا کہ ایک ایسی "چابی" ہے جس کے ذریعہ تجدّد پسندوں کے سارے مسائل اور تمام مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلام یا قرآن کی کوئی خدمت نہیں بلکہ چند وقتی اغراض کی خاطر اسلام کو بدنام کرنا اور مذہبی حلقوں میں انتشار برپا کرنا ہے۔ قرآن فہمی کے لئے پہلے صحیح اُصولِ تفسیر سے واقفیت ضروری ہے ورنہ فکری انتشار اور گمراہی سے چھٹکارا کبھی نہیں مل سکتا۔

غرض عصرِ جدید کے بعض ایسے ہی روشن فکر اہلِ علم نے آدم اور تخلیقِ آدم کے سلسلے میں یہی روش اختیار کی، تاکہ نظریۂ ارتقا کو ایک خالص "اسلامی" نظریہ ثابت کیا جاسکے۔ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کئے جانے کا تذکرہ بالکل صاف اور صریح لفظوں میں قرآن مجید میں مذکور ہے (جو نظریۂ ارتقا کے بالکل خلاف ہے) اس لئے انھوں نے جھٹ سے کہہ دیا کہ قرآن تو یہ بات محض ایک تمثیلی روپ میں کہہ رہا ہے، ورنہ حقیقتاً کسی انسان کا مٹی سے پیدا کیا جانا ایک غیر واقعی اور غیر حقیقی بات ہے۔ بلکہ اُنھوں نے یہاں تک کہنے کی جسارت کر ڈالی کہ آدم نام کا کوئی شخص — اولین انسانی فرد کی حیثیت سے — سرے سے کبھی ظاہر ہی نہیں ہُوا۔ بلکہ وہ تو نوعِ بشری کا محض ایک تمثیلی نمائندہ

تھا اور بس۔ بالفاظ دیگر نوع انسانی کی پوری جماعت کو آدم کے نام سے پکارا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مشہور منکرِ حدیث غلام احمد پرویز صاحب تحریر کرتے ہیں :

"ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ "آدم" جن کے جنّت سے نکلنے کا قصہ قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں آیا ہے (مثلاً ۲/۳) نبی تھے۔ قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر قصّہ ٔ آدم کی جو تفاصیل بیان کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنّت سے نکلنے والا آدم کوئی خاص فرد نہیں تھا بلکہ انسانیت کا تمثیلی نمائندہ تھا۔ بالفاظ دیگر قصۂ آدم کسی خاص فرد (یا جوڑے) کا قصہ نہیں بلکہ خود "آدمی" کی داستان ہے جسے قرآن نے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے"۔[1]

"آدم ایک فرد نہیں ہے۔ یہ فطرتِ انسانی کی سرگذشت ہے جسے قصے کے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اس تمثیل میں آدم کا لفظ غالباً اس رعایت سے لایا گیا ہے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے اولین مراحل میں جن کا تعارف قرآنِ کریم نے کرایا ہے، آدم نامی کسی شخصیت کو ممتاز حیثیت حاصل تھی لیکن اس تمثیل میں اس شخص کی ذات مراد نہیں ہے"۔[2]

لیکن جہاں پر کسی قسم کی تاویل ممکن نہیں تھی وہاں پر جھٹ سے کہہ دیا کہ یہاں پر آدم سے مُراد ابو البشر نہیں بلکہ کوئی دوسرا آدم ہوگا۔ گویا کہ قرآن حکیم میں بیان ایک آدم کا نہیں بلکہ کئی "آدموں" کا ہُوا ہے :

"بہرحال جس آدم کا ذکر سورۂ آل عمران کی مندرجۂ بالا آیت (۳/۳۲) میں آیا ہے وہ "جنّت سے نکلنے والے آدم" سے مختلف تھے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ نبی ہوں (اور ان کا نام آدم ہو) قرآن نے ان کا مزید تعارف نہیں کرایا"۔[3]

---

[1] لغات القرآن، مصنفہ غلام احمد پرویز، ۱/۲۱۴، ادارۂ طلوعِ اسلام لاہور، ۱۹۶۰ء

[2] معارف القرآن، مصنفہ غلام احمد پرویز، ۲/۵۳، مطبوعہ دہلی، تاریخ اشاعت غیر مذکور۔

[3] لغات القرآن: ۱/۲۱۵، حوالہ مذکور

"لیکن سورۂ آل عمران کی متذکرۂ بالا آیت (۳۳/۳) میں چونکہ آدم کا ذکر نوح کے ساتھ آیا ہے اور دونوں کے لئے اصطفیٰ کا لفظ استعمال ہوا ہے اس لئے گمان غالب ہے کہ یہ آدم نبی تھے۔ اگرچہ قرآن کریم میں اس کی تائید میں کوئی نص صریح موجود نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آدم کسی نبی کا نام بھی ہو۔"[۵۴]

یہ ایک مکابرہ نہیں تو پھر کیا ہے جس کی صحیح تاویل میں متجدد قسم کے لوگ اس قدر تذبذب کا شکار نظر آ رہے ہیں؟ اس کو تو قرآن حکیم کی قطعیت کے سامنے اپنی حیرانی و سرگردانی کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ قرآن حکیم میں ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کے سوا کسی دوسرے آدم کا تذکرہ ہرگز موجود نہیں ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ احادیثِ رسول کا تو پہلے ہی انکار کر چکے ہیں اور اب اس قسم کی اوٹ پٹانگ تاویلات کے ذریعہ قرآن کریم کا بھی انکار کرنے والے بن جائیں گے۔ گویا اس قسم کے لوگوں کا ایمان نہ تو قرآن پر ہے اور نہ حدیثِ رسول پر۔

یہ ہے عصرِ جدید کے تجدد پسندوں کا حال جو قرآن کریم کی اتباع کے بجائے قرآن کو اپنی خواہشاتِ نفس کا تابع کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس باب میں دورِ حاضر کے مسلم "مفکرین" کی اکثر و بیشتر روش یہی ہے جو نظریۂ ارتقا کو ایک مرغوب اور دلپسند نظریہ تصوّر کر کے اس کو مطابقِ قرآن ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس باب میں سر سید احمد خاں اور شیخ محمد عبدہ نے نیچریت کی جو ابتدا کی تھی تو اس میں اچھے اچھے اہلِ علم بشمول علامہ اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین وغیرہ سب بہہ گئے ہیں، عنایت اللہ خاں مشرقی[۵۵] اور پرویز وغیرہ کا ذکر ہی کیا۔ تجدد یا انحراف کی یہ داستان بڑی ہی عبرتناک ہے۔ لہٰذا اس موقع پر اس کی تھوڑی سی تفصیل ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ تاکہ ہماری ملّت کے سامنے اس کا ایک خاکہ آجائے۔

سر سید اور اعتزالِ جدید

واقعہ یہ ہے کہ عصرِ جدید میں تجدد و انحراف کا آغاز غالباً سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ - ۱۸۹۸ء) کے ذریعہ ہوا ہے، جنہوں نے مسلمانوں کو علومِ جدیدہ سے روشناس کرانے کے سلسلے میں ہندوستان میں

---

[۵۴] معارف القرآن: ۵۲/۲، حوالۂ مذکور

[۵۵] دیکھئے موصوف کی کتاب "تذکرہ" مطبع وکیل امرتسر، ۱۹۲۴ء

مسلمانوں کا پہلا کالج قائم کر کے یقیناً ایک کارنامہ انجام دیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہیں اس بات کا بھی شدت کے ساتھ احساس تھا کہ ان علوم کی ترویج و اشاعت کے نتیجے میں اسلامی عقائد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا اس کے تدارک کے لئے اسلامی تعلیمات کی نئے انداز میں تشریح ضروری ہے۔ جیسا کہ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں اس کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ (تفصیل آگے آرہی ہے)۔ لہٰذا اس ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے خود ہی اُنھوں نے "تفسیر القرآن" کے نام سے اُردو میں ایک نا تمام تفسیر لکھی، جس میں اسلامی عقائد اور معجزاتِ انبیاء وغیرہ کو "قانونِ فطرت" کے مطابق ثابت کرنے کا بیڑا اٹھاتے ہوئے بہت سے حقائق و واقعات کا انکار کر ڈالا۔

قصہ مختصر موصوف نے اپنی تفسیر میں حضرت آدمؑ سے متعلق سارے قصّے کو ایک تمثیل قرار دیتے ہوئے اس قصے میں مذکور الفاظ اور کرداروں کی طرح طرح سے تاویلیں کی ہیں۔ مثلاً فرشتوں کو قوائے ملکوتی اور شیطان کو قوائے بہیمی قرار دیا ہے۔[۶]

"ابلیس اور ملائکہ سے کوئی خارجی وجود مراد نہیں لیا۔"[۷]

"آدم اور ملائکہ اور ابلیس کا قصّہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے یہ کسی واقعہ کی خبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے جس کے پیرایہ میں انسان کی فطرت اور اُس کے جذبات اور قوتِ بہیمیہ جو اُس میں ودیعت کی گئی اُس کی بُرائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کی اور بھی متعدد تمثیلیں قرآن میں موجود ہیں۔"[۸]

"شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اُس سے کوئی وجود خارج عن الانسان مُراد نہیں ہے۔ بلکہ خود انسان میں جو نفسِ امارہ یا قوتِ بہیمیہ ہے وہ مُراد ہے۔"[۹]

مولانا حالی جو سرسید کے بہت بڑے ہمنوا اور طرفدار تھے، سرسید کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ "وہ ملائکہ سے قوائے عالم اور شیطان سے انسان کی قوتِ بہیمیہ مراد لیتے ہیں۔ جن کے وجود سے جیسا کہ عموماً سمجھا

---

۶ دیکھئے مقالاتِ سرسید : ۱۴/۸، مجلسِ ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۵ء

۷ موجِ کوثر، از شیخ محمد اکرام، ص ۱۵۹، لاہور، ۱۹۷۹ء

۸ حیاتِ جاوید، مصنفہ مولانا الطاف حسین حالی، ص ۵۲۶، ترقی اُردو بورڈ نئی دلی، ۱۹۷۹ء

۹ ایضاً، ص ۵۲۵

جاتا ہے، انکار کرتے ہیں۔" [۱۰]

"ملائکہ کے الفاظ جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں اُن سے یہ مُراد نہیں ہے کہ وہ کوئی جُدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے۔ بلکہ خدائے تعالیٰ نے جو مختلف قویٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے مادّے میں ودیعت کیے ہیں، جیسے پہاڑوں کی صلابت، پانی کا سیلان، درختوں کا نمو، برق کی قوتِ جذب و دفع و امثال ذالک، انہیں کو ملائک یا ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔" [۱۱]

"قرآن سے جنّات کا ایسا وجود جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہوائی آگ کے شعلے سے پیدا ہوئے ہیں اور ان میں مرد و عورت دونوں ہوتے ہیں ...... ثابت نہیں ہوتا۔" [۱۲]

"خدائے تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسما و افعال سے متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان ہُوا ہے وہ سب بطریقِ مجاز و استعارہ و تمثیل کے بیان ہُوا ہے۔ اور اسی طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہُوا ہے، جیسے بعث و نشر، حساب و کتاب، میزان، صراط، جنّت، دوزخ وغیرہ وغیرہ، وہ بھی سب مجاز پر محمول ہے نہ حقیقت پر۔" [۱۳]

بقول شیخ محمد اکرام، سرسید نے آیاتِ قرآنی کی تاویل میں معتزلہ کا طرز اختیار کیا ہے۔ چنانچہ موصوف تحریر کرتے ہیں: "اس تفسیر میں سرسید نے قرآن کے تمام اندراجات کو عقل اور سائنس کے مطابق ثابت کیا ہے اور جہاں کہیں سائنس کی معلومات اور کلام مجید کے درمیان اختلاف معلوم ہوتا ہے، وہاں معتزلہ طریقے کے مطابق آیات کی نئی تاویل اور تشریح کر کے اس اختلاف کو دُور کیا ہے۔" [۱۴]

یہ بھی ایک مغالطہ ہے کہ سرسید کی تفسیر عقل اور سائنس کے مطابق ہے۔ جبکہ دُنیائے سائنس کو مافوق الطبیعی مظاہر کے اثبات یا نفی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ عقلی اعتبار سے ان مظاہر کا

---

[۱۰] حیاتِ جاوید، ص ۵۳۰

[۱۱] ایضاً، ص ۵۲۶

[۱۲] ایضاً، ص ۵۲۹

[۱۳] ایضاً، ص ۵۲۷

[۱۴] موجِ کوثر، ص ۱۵۹

وجود ناممکن نہیں ہے۔ انسان کے سامنے تو ابھی تک حقائق کی ایک دنیا باقی ہے، جس کا اسے کھوج لگانا ہے۔ اور خود مادے کی دنیا میں ایسے بہت سے "اسرار" موجود ہیں جن کی کُنہ و حقیقت تک اُس کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ مگر یہ ایک الگ بحث ہے۔

سر سید کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنی یہ ساری مُہم ایک جدید علمِ کلام کی ضرورت کے تحت چلا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ خود ۱۸۷۶ء میں "مدرسۃ العلوم" کے طلبہ سے مخاطب ہو کر اپنی ایک تقریر کے دوران فرماتے ہیں:

"اس لئے اس زمانے میں ایک جدید علمِ کلام کی حاجت ہے، جس سے یا تو ہم علومِ جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں، یا مشتبہ ٹھہرا دیں یا اسلامی مسائل کو اُن کے مُطابق کر دکھائیں۔" [۱۵]

مگر افسوس کہ موصوف اپنے دعوے کے مُطابق علومِ جدیدہ کے مسائل کو باطل یا مُشتبہ تو نہیں ٹھہرا سکے، مگر ہاں قرآن کو توڑ مروڑ کر افکارِ جدیدہ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ضرور کر ڈالی۔ حالانکہ کرنے کا کام اس کے برعکس یہ تھا کہ "نصوصِ قرآن" پر راسخ العقیدگی کے ساتھ ایمان رکھتے ہوئے افکارِ جدیدہ کو باطل یا مشتبہ ٹھہرا دیا جاتا۔ اور یہ ضرورت آج بھی باقی ہے۔ اور اس اعتبار سے آج ایک نئے غزالی، ایک نئے رازی اور ایک نئے ابنِ تیمیہ کی ضرورت ہے۔

سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو جدید علوم و فنون سے روشناس کرانے کے سلسلے میں بلاشبہ زبردست اور تاریخ ساز خدمات انجام دی ہیں، جن سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ موصوف نے مشنریوں کے مقابلے اور بعض مستشرقین کی سیرتِ نبوی پر رکیک اعتراضات کے جواب میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور اس اعتبار سے انہیں ایک مخلص مسلمان ہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اپنے حد درجہ اخلاص کے باوجود موصوف نے تفسیرِ قرآن کے سلسلے میں سخت ٹھوکر کھائی ہے اور جدید علمِ کلام کے نام سے "اعتزالِ جدید" کی بنیاد ڈالی ہے، جس کا اثر بعد والوں پر بہت دُور رس واقع ہوا ہے۔ درحقیقت وہ اس منصبِ بلند کے اہل ہی نہیں تھے۔ چنانچہ موصوف کے مُعتقد اور اُن کے سیرت نگار مولانا حالی تک نے صاف الفاظ میں اعتراف کر لیا ہے کہ

[۱۵] حیاتِ جاوید، ص ۲۱۶

"سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر اُن سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں"۔ [۱۶]

سرسید کی "تفسیر القرآن" کی اشاعت کا آغاز ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) سے ہوا ہے [۱۷] اور یہ غالباً عصرِ جدید کی پہلی "انحرافی" تفسیر تھی، جس نے خصوصیت کے ساتھ برِصغیر ہند و پاک کے اہلِ علم کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ اور بقول شیخ محمد اکرام "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں نے کئی اہم مسائل میں سرسید کی رائے اختیار کر لی ہے۔ مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ کی تفسیر قرآن بیشتر سرسید ہی کی ترجمانی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق سرسید کے جو عقائد تھے وہ مرزا غلام احمد نے اختیار کر لئے۔ اور جیسا کہ نظام المشائخ میں ڈاکٹر محمد اسماعیل کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے، اور بھی کئی مسلمان ان سے متفق ہو گئے ہیں"۔ [۱۸]

شیخ محمد عبدہ اور نظریۂ ارتقا

مصر کے مشہور عالم اور علامہ جمال الدین افغانی کے شاگرد شیخ محمد عبدہ (۱۸۴۹ - ۱۹۰۵ء) بھی سرسید سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ اور جیسا کہ اگلی سطور سے ظاہر ہو گا محمد عبدہ بھی سرسید کے خیالات سے واقف تھے۔ چنانچہ عصری اعتبار سے شیخ صاحب نہ صرف مؤخر تھے بلکہ قصۂ آدم کے سلسلے میں تقریباً سرسید ہی کے خوشہ چیں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو صرف اتنا کہ شیخ صاحب عربی زبان کے عالم ہونے کی بنا پر "تاویل" اور "تمثیل" ذرا "باقاعدگی" کے ساتھ کرتے ہیں۔ غرض موصوف نے پہلے تو تخلیقِ آدم سے متعلق آیات کو خواہ مخواہ متشابہات میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔ (وقد ذهب الأستاذ الى أن هذه الآيات من المتشابهات التي لا يمكن حملها على ظاهرها) [۱۹] پھر انھوں نے قصۂ آدم کو تمثیلی قرار دے کر اس کی دور از کار تاویلیں کی ہیں۔ (والقصة على مذهبهم وردت مورد

---

[۱۶] حیاتِ جاوید، ص ۲۲۰

[۱۷] ایضاً، ص ۴۸۷

[۱۸] موجِ کوثر، ص ۱۶۰

[۱۹] تفسیر المنار، مرتب شیخ رشید رضا: ۲۵۱/۱، مطبوعہ بیروت، طبع دوم۔

التمثیل لتقرب من أفهام الخلق ما تفیدھم معرفتہ من حال النشاۃ الآدمیۃ[۲۰]

عصرِ جدید کے انہی دو "پیشروانِ علم" کے خیالات کو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مرتبین نے پوری طرح اپنا لیا ہے۔ چنانچہ "آدم" کے عنوان پر اس میں جو مقالہ سپردِ قلم کیا گیا ہے وہ انہی دو بزرگوں کی تاویلات و تمثیلات سے بھرا ہوا ہے[۲۱]۔

مگر اس سلسلے میں ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ شیخ محمد عبدہ نے سرسید کے خیالات سے آگاہ ہو کر انہیں نیچری اور دہریہ قرار دیا تھا۔ اور اپنے رسالے میں جو "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے ۱۳۰۱ھ میں پیرس سے نکلنا شروع ہوا تھا' ایک مقالہ خاص اس موضوع پر "الدھریون فی الھند" کے عنوان سے سپردِ قلم کیا تھا' جس میں سرسید پر نہایت درجہ سخت اور تند لہجے میں تنقید کی تھی[۲۲]۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ وہ خود بھی اس الزام سے بری نہیں ہیں۔ بلکہ بعض مواقع پر تو سرسید سے زیادہ نیچری دکھائی دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو شیخ صاحب کا سرسید پر الزام ایک عجوبہ سا لگتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے سرسید نے قصۂ آدم کو ایک تمثیل قرار دے کر اس کے بعض الفاظ کی اجمالی طور پر تاویل کی ہے۔ جبکہ شیخ صاحب نے اس کی تمثیلی تفسیر میں پورے چار صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں[۲۳]۔ اس اعتبار سے ان دونوں میں صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ہے۔ چنانچہ شیخ صاحب کی اس تمثیلی تفسیر کے بعض اقتباسات اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ سے نقل کیے جاتے ہیں:

"جنّت سے مراد آرام و راحت کی حالت مراد لینا صحیح ہے، کیونکہ نعمتوں سے پُر باغات میں انسان کو راحت و سکون ملنا یقینی ہے۔ یا اس سے مُراد بے فکری اور خوشی کی کیفیت ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ آدم سے ایک شخص نہیں تمام نوعِ انسانی مراد لی جائے۔ جیسے قبیلے کے باپ کے نام سے سارا قبیلہ مراد ہوتا ہے۔ درختِ ممنوعہ سے مُراد بُرائی اور ہٹ دھرمی لی جا سکتی ہے۔۔۔۔ جنّت میں رہنے اور وہاں سے نکل

---

۲۰ تفسیر المنار: ۱/۲۵۵

۲۱ دیکھیے اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ: ۱/۲۴-۲۵، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۶۴ء

۲۲ العروۃ الوثقیٰ (مجموعۂ مقالات) ص ۴۷۱-۴۷۷، مطبوعہ مصر، ۱۹۲۸ء

۲۳ تفسیر المنار: ۱/۲۸۱-۲۸۵

جانے کے حکم سے مراد امر تکوینی ہو سکتا ہے، یعنی ایسی بات جس کا ہونا مقدر ہو چکا تھا۔ اس بنا پر جنّت میں رہنے کا اور پھر وہاں سے نکل جانے کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اپنی پیدائش میں بہت سی حالتوں، زمانوں اور کیفیتوں میں سے گزرتا ہے، جن میں سے پہلا زمانہ بچپن کا ہے، اس عمر میں رنج و غم پاس نہیں پھٹکتا اور کھیل کود کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا، بچہ گویا ایک ایسے باغ میں ہے جہاں گھنے درخت، پختہ میوے سے لدے ہوئے موجود ہیں، نہریں بہہ رہی ہیں، پرندے گا رہے ہیں۔ زوجہ کا ذکر اس لئے کیا کہ تمام نوعِ انسان اس حکم میں آجائے اور معلوم ہو جائے کہ بشریت کے اندر مذکر اور مؤنث سب برابر ہیں۔ آدم و حوا کو جنّت میں رہنے کے حکم کا مطلب یہ ہوا کہ نوع انسان میں مذکر و مؤنث سب ایک حالت میں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ شیطان کے وسوسے اور اس کے بہکانے کا مطلب یہ ہے کہ خبیث روح جو انسان کے پیچھے پڑی ہوئی ہے اُسے بُرائی کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ انسان بِالطبع خیر کی طرف مائل ہے۔ بُرائی کی طرف جاتا ہے تو دوسروں کے بہکانے سے جاتا ہے۔ جنّت سے نکلنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان فطرت کے قاعدے توڑ کر مشقت اور محنت میں پھنس جاتا ہے۔ آدم کی توبہ اور استغفار سے اشارہ اس طرف ہے کہ انسان اپنی فطرت سلیمہ کی بابت بُرے کاموں سے بُرے نتیجے پیدا ہونے کا خوف رکھتا ہے۔ اس لئے اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے کہ وہ ان بُرے نتائج سے اُسے بچالے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خلاصۂ کلام یہ کہ آدمی کی فطری حالتیں تین ہیں : اول بچپن کا زمانہ اور یہ خوشی اور راحت اور بے فکری کا زمانہ ہے۔ دوسرے بھلے بُرے میں کسی قدر تمیز کا زمانہ۔ اس زمانے میں وہ شیطان کے وسوسے سے خواہشوں کے جنجال میں پھنس سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک زمانہ عقل اور ہوش کے کامل ہونے کا زمانہ آتا ہے۔ اس میں وہ اپنے افعال کے نتائج کا خیال کرتا ہے اور بُرے کاموں سے بچنا چاہتا ہے اور جب اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے تو عالم الغیب والشہادۃ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہی حالتیں ہیں جو فرد پر گزرتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔[۲۴]"

اس طرح دونوں نے دُور از کار تاویلات کے سلسلے میں یکساں قسم کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور

---

[۲۴] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ : ۱/۲۴-۲۵، ۱۹۶۴ء

جس طرح سرسید نے فرشتوں کو "قوائے ملکوتی" اور "قوائے مادی" کہا ہے بالکل اسی طرح شیخ صاحب نے بھی انہیں "قوائے طبیعی" یعنی natural forces کے نام سے موسوم کرنے کی جسارت کر ڈالی ہے۔[۲۵]

اب نہیں معلوم کہ شیخ صاحب کے نزدیک "نیچریت" کا مفہوم آخر کیا تھا؟ محمد عبدہ کا دعوی تھا کہ وہ سلف وخلف دونوں کے مذاق کے مطابق تفسیر کرنا پسند کرتے ہیں۔[۲۶] چنانچہ اس مذاق کے مطابق واقعہ یہ ہے کہ وہ کبھی اِس طرف ہو جاتے ہیں اور کبھی اُس طرف۔ تاکہ دونوں طبقوں کو مطمئن اور راضی رکھا جاسکے۔ بالفاظِ دیگر ع

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

غرض ان دونوں کی تفسیر اور ان کے خیالات نے اُمتِ اسلامیہ میں "تاویل" اور "ارتیابیت" کا دروازہ چوپٹ کھول دیا ہے اور اس بنا پر اب جس کے جی میں جو آیا وہ لکھنے لگا ہے۔ خصوصاً مصری علماء شیخ محمد عبدہ کے خیالات سے بُری طرح متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ خاص کر اُن کے اس موقف سے کہ تخلیقِ آدم سے متعلق قرآن کی ظاہری آیات علم انسانی پر صرف اُسی وقت تک مقدم رہیں گی جب تک کہ علم انسانی قطعیت کا درجہ حاصل نہ کرلے۔ اُن کی اصل عبارت یہ ہے:

" فظواهر الآيات في خلق آدم مثلاً مقدم في الاعتقاد على النظريات المخالفة لها من أقوال الباحثين في أسرار الخلق وتعليل أطواره ونظامه مادامت ظنية لم تبلغ درجة القطع"۔[۲۷]

شیخ محمد عبدہ کی تاویلات کا اثر

چنانچہ شیخ فرید وجدی نے اپنی کتاب "دائرة معارف القرن العشرين" میں اور شیخ عبدالوہاب نجّار نے اپنی کتاب "قصص الأنبياء" میں یہی موقف اختیار کیا ہے کہ اگر نظریۂ

---

[۲۵] دیکھئے تفسیر المنار: ۱/۲۶۷ - ۲۶۸

[۲۶] ایضاً: ۱/۲۵۲

[۲۷] ایضاً: ۱/۲۵۳

ارتقا علمی اعتبار سے ثابت ہو جائے تو پھر قرآن میں مذکور قصۂ آدم کو اُس کے ظاہری نصوص سے پھیر دینا ممکن ہو جائے گا[28] جب کہ یہ دونوں حضرات تسلیم کرتے ہیں کہ قرآنی نصوص قطعی ہیں اور اس کی ظاہری آیات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ تو اس کا حاصل وہی قرآن کی قطعیت میں شک وشبہ پیدا کرنا اور ارتیابیت کی دعوت دینا ہے۔ ایک طرف قرآنی نصوص پر ایمان رکھنے کا بھی دعویٰ ہے اور دوسری طرف اس کی قطعیت کے بارے میں تردّد کا بھی اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس قصّے کے بارے میں عام طور پر مصری علماء کا موقف یہی ہے۔

یہ ہے وہ صورتِ حال جس میں اس وقت اُمتِ مُسلمہ گرفتار اور حیران وسرگردان ہے، کہ وہ کس کی بات مانے اور قرآن حکیم پر کس طرح ایمان لائے؟ سر سید احمد خاں مرحوم نے جب نیچریت کا دروازہ کھولا تو اس وقت کے بعض علماء نے اُن پر کفر کے فتوے لگائے اور ان کے خلاف ایک اچھا خاصہ لٹریچر تیار کر دیا[29] مگر اس کے برعکس شیخ محمد عبدہ کے خیالات کو قبولِ عام حاصل ہو گیا۔ محض اس لئے کہ وہ ایک عالمِ دین اور عالمِ عربیت تھے۔ لہٰذا کسی نے بھی اُن کے خلاف زبان نہیں کھولی۔ گویا کہ اُن کے علم اور اُن کی عربیت کی عبا نے اُن کے سارے عیوب چھپا دئے۔

بہر حال عالمِ اسلام میں ان دونوں حضرات کے خیالات کی بازگشت اکثر وبیشتر سُنائی دیتی ہے۔ اور ہند وپاک کے بہت سے اہلِ علم اور دانشور بھی ان سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لہٰذا اس موقع پر اس کا ایک مختصر سا تنقیدی جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

علامہ اقبال اور نظریۂ ارتقا

علامہ اقبال نے اپنے خطبات ....

Reconstruction of Religious Thought in Islam میں (تیسرے خطبے میں) جہاں پر قصۂ آدم سے بحث کی ہے تو وہ اسی تمثیلی انداز میں ہے جو ان دو پیشرؤوں کا انداز ہے۔ مگر اقبال چونکہ ایک فلسفی ہیں اس لئے اس قصّے کو بھی ایک مکمل فلسفے کی شکل دیتے ہُوئے اس پر

---

[28] دیکھئے دائرۃ معارف القرن العشرین : ۱/۱۲۷ اور قصص الانبیاء : ص ۱۴ -

[29] دیکھئے " اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں " ازمولانا سید عبدالحی، ص ۳۲۱، ۱۹۶۹ء

کئی صفحات سیاہ کردیئے ہیں اور اس کا حاصل بھی اُن کے نزدیک وہی ہے کہ اس سے مراد کوئی مخصوص انسان نہیں (بلکہ بحیثیت مجموعی نوع بشری کا تذکرہ ہے) [۳۰]

اقبال کے مجمل بیان کی تشریح کرتے ہوئے اقبال کے ایک شارح ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب "فکرِ اقبال" میں تحریر کرتے ہیں: "قرآن جس آدم کو پیش کرتا ہے وہ کوئی ایک فرد نہیں بلکہ انسانیت کا ایک تصور ہے۔ قرآن نے آدم کے لفظ کو انسانیت یا نوع انسان کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔" [۳۱]

علامہ اقبال کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ مگر جہاں تک اسلامی عقائد کا معاملہ ہے، تو اس میں اقبال تو کیا کسی بڑی سی بڑی شخصیت کو بھی بخشا نہیں جاسکتا، خواہ وہ کتنی ہی قدآور کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ہمیں محمد عبدہ اور اقبال سے زیادہ اسلام اور قرآن عزیز ہیں۔

واضح رہے کہ علامہ اقبال نے اس موقع پر اپنے اس قیاس کے لئے ایک قرآنی آیت کو بطور ثبوت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہتر ہے کہ اس موقع پر خود موصوف ہی کی عبارت پیش کردی جائے جو یہ ہے:

"..... آدم کا لفظ بیشک حذف نہیں ہُوا، لیکن یہاں اس کا اشارہ کسی مخصوص انسان کی طرف نہیں۔ اس کی حیثیت ایک تصوّر کی ہے جس کی تائید قرآن پاک ہی سے ہو جاتی ہے اور جس کا ذیل کی آیت ایک قطعی اور واضح ثبوت ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ" [۳۲]

ترجمہ: اور ہم نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تمہاری صورت گری کی۔ پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا۔ (اعراف: ۱۱)

اقبال کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ اس آیتِ کریمہ میں ضمیریں جمع مخاطب کی لائی گئی ہیں، اس لئے یہ کسی ایک انسان کا تذکرہ نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کا تذکرہ ہوسکتا ہے۔ تو یہ شبہ دراصل قرآنی

---

[۳۰] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ از سید نذیر نیازی، ص ۱۲۶، طبع جدید، دہلی، ۱۹۸۶ء

[۳۱] فکرِ اقبال، ص ۴۹۵، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۷۷ء

[۳۲] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۲۶

اسلوب اور اُس کی بلاغت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اس واقعہ سے قرآن درحقیقت پوری نوع انسانی کا شرف بڑھانا چاہتا ہے، اور کہہ یہ رہا ہے کہ ابوالبشر حضرت آدمؑ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، وہ مجموعی طور پر تمہاری سب کی تکریم کی غرض سے تھا، گویا کہ یہ واقعہ صرف آدم کے ساتھ نہیں بلکہ تمام انسانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ اور اس کی نظیر قوم یہود سے طرزِ تخاطب میں بھی ملتی ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ۴۰ تا ۴۷ میں مختلف آیات ملاحظہ فرمائیے، جن میں دورِ رسالت میں موجود یہودیوں کو مخاطب کرتے ہوئے ان کے تاریخی واقعات کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے کہ گویا وہ واقعات اُنہیں کے ساتھ پیش آئے تھے۔ ان واقعات میں اللہ کے احسانات کو بھی گنایا گیا ہے جو قوم یہود پر ہوئے تھے اور ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں کا تذکرہ بھی اس انداز سے کیا گیا ہے گویا کہ ان کا ارتکاب خود نزولِ قرآن کے دور میں موجود یہودیوں نے کیا تھا۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى : اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من وسلویٰ اُتارا۔ (بقرہ : ۵۷)

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ : اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کریں گے۔ (بقرہ : ۶۱)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ : اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر کوہِ طور بلند کیا۔ (بقرہ : ۶۳)

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ : پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ (بقرہ : ۷۴)

دیکھئے یہ اور اس قسم کی دیگر آیات میں کس طرح ماضی کے واقعات کے ذریعہ زمانۂ حال کے لوگوں سے خطاب کیا جا رہا ہے، گویا کہ یہ سب کچھ حال والوں کے ساتھ پیش آیا ہے! یہ قرآن کریم کا ایک معروف اور بہت بلیغ اسلوب ہے۔ امام رازی نے بھی تقریباً یہی توجیہ اختیار کی ہے۔[۴۳] اور علامہ زمخشری فرماتے ہیں: (وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ) یعنی خلقنا أباکم آدم طیناً غیر مصوّر

---

[۴۳] دیکھئے تفسیر کبیر: ۲۹/۱۴ - ۳۰، طبع جدید

ثم ثور ناہ بعد ذلک[۳۴]

ڈاکٹر رفیع الدین اور نظریۂ ارتقا

علامہ اقبال کے بعد انہی کے ایک نام لیوا دوسرے فلسفی ڈاکٹر محمد رفیع الدین میدان میں آئے اور اس سلسلے میں رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ڈاکٹر صاحب کی بعض کلامی تحریریں اگرچہ بہت وقیع اور فکر انگیز ضرور ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ اُن کی کتاب "قرآن اور علمِ جدید" تعارض و تضاد کا ایک عجیب و غریب شاہکار ہے، جس میں موصوف نے قصۂ آدم اور نظریۂ ارتقا پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ نظریۂ ارتقا کو غلط، ایک خلّاق ہستی کا منکر اور کافرانہ نظریہ وغیرہ وغیرہ ہی کہتے ہیں، مثلاً :

" ڈارون ارتقا کے اسباب کی تشریح اس طرح کرتا ہے کہ ان کو درست تسلیم کر لینے کے بعد ہمارے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ ہم کائنات کی تخلیق میں کسی قادرِ مطلق ہستی کے دخل یا عمل کو یا خود کائنات ہی کے کسی مقصد یا مدعا کو ذہن میں لا سکیں"۔[۳۵]

اور ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں : " ڈارون کا نظریۂ ارتقا مغرب کے تمام کافرانہ فلسفیانہ نظریات سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔۔۔۔۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مغرب کے فلسفیوں میں لامذہبیت اور دہریت کا جس قدر مواد اس وقت موجود ہے وہ ڈارون ہی کے نظریہ کی پیداوار ہے۔ یہ کُلّیہ بالخصوص کارل مارکس، میکڈوگل، فرائڈ، ایڈلر اور میکیاولی کے نظریات پر حاوی ہے۔۔۔۔۔۔ یہ فلسفے ڈارون کے نظریہ سے براہِ راست نہیں تو اس سے بالواسطہ طور پر گہری طرح سے متاثر ہیں۔ ان سب کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے"۔[۳۶]

مگر اس کے باوجود اس کو قرآن سے صحیح ثابت کرنے کے لئے اپنا سارا زور بھی صرف کر دیتے

---

[۳۴] تفسیر کشاف : ۶۸/۲، مطبوعہ طہران

[۳۵] قرآن اور علم جدید، ص ۳۷، طبع چہارم، ۱۹۸۱ء، لاہور۔

[۳۶] قرآن اور علم جدید، ص ۱۳۷ - ۱۳۸

ہیں۔ اور اس سلسلے میں بعض متشابہات یا مُبہم آیتوں کا سہارا لے کر محکمات تک کو متشابہات کے تابع کرتے ہُوئے من مانی اور رکیک قسم کی تاویلات کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا یہ اُلٹا رُخ ہے، اور صحیح رُخ یہ ہے کہ اُس کی متشابہات کو اُس کی محکمات کی روشنی میں دیکھا جائے۔ مگر مصنف چونکہ "ارتقا" کی عینک چڑھائے ہُوئے ہیں اس لئے اُنہیں قرآن کے ہر ہر لفظ میں ارتقا ہی ارتقا نظر آرہا ہے۔ میری نظر میں قرآنِ حکیم پر اپنے نظریات زبردستی لادنے کی یہ ایک بدترین مثال ہے، جس کے ذریعہ قرآن فہمی کے اُصولوں کا خون ہوتا ہے اور عقلِ سلیم اس سے اِباء کرتی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کے نظریات پر اس وقت تفصیلی بحث کی تو گنجائش نہیں ہے، مگر مجموعی طور پر عرض ہے کہ موصوف کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ارتقا اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے، مگر وہ غیر شعوری طور پر نہیں بلکہ شعوری طور پر ہوتا ہے۔ بس یہی ایک فرق نظر آتا ہے ان کے اور ڈارون کے نظریہ میں۔ مگر وہ اتنا کہہ کر ڈارون کے نظریات کو "مسلمان" نہیں بنا سکتے۔ اس کے لئے تو ضروری تھا کہ سب سے پہلے وہ ارتقا کو علمی اعتبار سے صحیح ثابت کرتے۔ اس کو مسلمان بنانے کا مرحلہ تو بعد میں آتا ہے۔ جب ارتقا ہی ثابت نہیں ہے تو پھر قرآنِ عظیم کو نہایت درجہ بھونڈے طریقے سے کھینچ تان کر مطابق ارتقا ثابت کرنے کا کیا مطلب ہے؟ بلکہ اب تو خود ماہرینِ حیاتیات ہی اس غلط اور نامعقول نظریہ سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے نظر آرہے ہیں، جیسا کہ پہلے باب میں ہم دیکھ آئے ہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث راقم سطور نے اپنی کتاب "قرآنِ حکیم اور نظریۂ ارتقا" میں کی ہے، جو زیرِ تکمیل ہے۔

احمد باشمیل اور اُن کا اُصول باطل

اسی طرح احمد باشمیل نامی ایک عربی داں نے ایک کتاب "الاسلام ونظریۃ دارون" کے نام سے لکھی ہے، جس میں حق و باطل کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ اور اس میں یہ عجیب بات بھی مذکور ہے کہ اگر کسی کو نظریۂ ارتقا کی تردید کرنی ہو تو وہ اس کو صرف اپنی طرف سے کرے، قرآن کو درمیان میں نہ لائے، مبادا کہ یہ نظریہ آئندہ چل کر صحیح ثابت ہو اور قرآن متّہم ہو جائے۔ مگر موصوف نے دوسری طرف خود ہی قرآن اور نظریۂ ارتقا میں تطبیق دیتے ہُوئے قرآن کے اُن قطعی نصوص میں بھی جو ارتقا کے خلاف ہیں، تاویل کرکے

ان کو مطابق ارتقا ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اللہ اللہ! ایک طرف تو احتیاط کا یہ عالم اور دوسری طرف مرعوبیت کی یہ انتہا!! مگر سوال یہ ہے کہ موصوف نے اس موقع پر یہ کیوں نہیں سوچا کہ اگر نظریۂ ارتقا غلط اور باطل ثابت ہو جائے تو پھر خود اپنی توجیہہ و تعلیل کا کیا ہوگا؟ کیا اس صورت میں بھی قرآن متّہم نہیں ہو جائے گا؟ آخر یہ "وَن وے ٹرافک" کیوں اور کس لئے؟

غرض اس غلط اور باطل اُصول کا مطلب یہ ہُوا کہ قرآن حکیم سے اس غیر ثابت شدہ نظریہ کی تائید تو کی جا سکتی ہے مگر اس کی تردید نہیں۔ گویا کہ قرآنِ عظیم مادہ پرستانہ نظریات کی تائید کے لئے نازل ہُوا ہے ان کی تردید کے لئے نہیں۔ گویا کہ قرآن عظیم انسانی نظریات و مفروضات کے تابع ہے اور انسانی نظریات جس طرف بھی جائیں گے قرآن کو بھی خواہی یا ناخواہی اُسی طرف جانا پڑے گا۔ یہ عجیب و غریب قسم کی قرآن دانی ہے، جو قرآنِ حکیم جیسی باطل شکن کتاب کے ساتھ ایک مذاق ہے۔

واضح رہے کہ اس موقع پر بحث محض نظریات و مفروضات کے سلسلے میں ہے۔ اس کے برعکس علومِ طبیعی natural sciences کے وہ ثابت شدہ حقائق جو مسلسل تجربے و مشاہدے کے باعث "قوانینِ فطرت" کا درجہ حاصل کر چکے ہوں، ان کا انکار مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے حقائق کی قرآنِ حکیم تصدیق و تائید کرتا ہے۔ بلکہ حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو خود علوم جدیدہ قرآن حکیم کی ابدی سچائیوں کی تصدیق و تائید کرتے ہیں۔ راقم سطور نے اس موضوع پر اپنی دیگر تصانیف میں تفصیلی بحث کی ہے۔

مولانا آزاد اور نظریۂ ارتقا

اس سلسلے میں دو اہم شخصیتوں کا تذکرہ کئے بغیر یہ جائزہ نامکمل رہے گا۔ ان میں سے ایک مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے علامہ سید سلیمان ندوی ہیں۔ چنانچہ اول الذکر نے اپنی تفسیر میں جہاں پر رُبوبیت کی تفصیل کی ہے تو وہاں پر انہوں نے نظریۂ ارتقا کا تذکرہ اس حیثیت سے کیا ہے گویا کہ وہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اگرچہ موصوف نے آدم کی شخصیت کو تمثیل قرار دینے سے احتراز کیا ہے، مگر ارتقا کی تشریح بالکل اسی انداز میں کی ہے جس طرح کہ مادہ پرست کرتے ہیں کہ زندگی کی ابتدا ایک اولین خلیہ یا بیج سے ہوئی جس کو پروٹوپلازم کہتے ہیں۔ پھر اس میں ایک مدتِ مدید کے ارتقا کے بعد ادنیٰ سے اعلیٰ درجے کی

کڑیاں ظہور میں آئیں۔ یہاں تک کہ لاکھوں سال کے ارتقا کے بعد انسان کا ظہور ہوا۔ پھر یہی نہیں بلکہ موجودہ انسان کے بعد بھی موصوف کے نزدیک ارتقا ممکن ہے۔[۳۷]

اور موصوف نے یہ سب دلیلِ آخرت کے ثبوت کے طور پر تحریر کیا ہے۔ مگر علمی اعتبار سے اس سے آخرت کا ثبوت تو کجا خود رُبوبیت بھی ثابت نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ جو چیز خود بخود ترقی کرتے کرتے آپ سے آپ ظاہر ہوتی جائے اُس میں بھلا رُبوبیت کا کیا دخل ہو سکتا ہے؟ اس اعتبار سے ارتقا رُبوبیت کی نقیض ہے اور رُبوبیت ارتقا کی۔ مادہ پرست نظریۂ ارتقا سے اسی لئے چمٹے ہوئے ہیں کہ انہیں ایک خالق یا برتر ہستی کے وجود کا اعتراف نہ کرنا پڑے۔ حالانکہ ارتقا علمی اعتبار سے بجائے خود ثابت نہیں ہے۔ مگر مادہ پرست اس نظریہ سے دست بردار ہونے کے لئے کسی بھی طرح تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ بصورتِ دیگر انہیں ایک خلّاق ہستی Creator کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا۔ مگر چونکہ انہیں خدا کے نام ہی سے ایک قسم کی چڑ سی ہوگئی ہے لہٰذا وہ اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اس پر تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔ لہٰذا ایک مادہ پرست کا اس نظریہ کو اپنانا اور اس سے چمٹے رہنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر ایک عالمِ دین کا اس سے اس حد تک متاثر ہو جانا گویا کہ وہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، بالکل ناقابلِ فہم ہے۔ اور پھر ایسی صورت میں جب کہ اس سے خالقِ ارض و سما کی ربوبیت و خلّاقیت پر حرف بھی آتا ہو۔

علامہ سید سلیمان ندوی اور نظریۂ ارتقا

اب رہا معاملہ علامہ سید سلیمان ندوی کا، تو مجھے ندوی برادری کا ایک فرد ہونے اور بیک واسطہ علامہ موصوف کا شاگرد ہونے بلکہ آپ کی متعدد تصنیفات سے تلمیذانہ طور پر مستفید ہونے کے باوجود اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی باک نہیں ہے کہ موصوف سے بھی اس مسئلے میں کچھ چوک اور بے احتیاطی ہوگئی ہے۔ چنانچہ موصوف کا ایک مضمون "مسئلہ ارتقا اور قرآن مجید" کے عنوان سے "الندوہ" کے جنوری ۱۹۰۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، جس میں موصوف نے بعض قرآنی آیات کو "مطابقِ ارتقا" دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس سلسلے میں دیگر علماء کی طرح موصوف کے بیانات میں ادّعائیت نہیں ہے، بلکہ اس کو

---

[۳۷] دیکھئے ترجمان القرآن: ۱/۳۷، مطبوعہ دفتر ترجمان دہلی، ۱۳۵۰ھ

ایک ممکنہ تاویل قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ اپنے مضمون کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں :

"علماء کی خدمت میں گزارش ہے کہ ہم نے مذکورۂ بالا آیتوں کے جو معنی قرار دئے ہیں ان کا مقصد صرف فلسفیانہ مذاق والوں کو خاموش کر دینا ہے، گو مفسّرین ان آیتوں کے اور معنی سمجھتے ہیں اور مجھے ان کی بھی صحت سے انکار نہیں۔ لیکن عقل و نقل کی تطبیق کی غرض سے ہم نے جو معنی لئے ہیں وہ بھی غلط نہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ دونوں معانی کے متحمل ہیں"۔ [۳۸]

اصل میں سید صاحب بھی ارتقائیوں کے پروپگنڈے سے متاثر نظر آتے ہیں اور "تاویل" کے سلسلے میں انہوں نے بھی تقریباً مصری علماء کا موقف اختیار کر لیا ہے۔

نظریۂ ارتقا کے سلسلے میں یہ ساری غلط فہمی اس بنیاد پر ہے کہ یورپ کے تمام سائنس دانوں نے اس مسئلے کو گویا کہ اجماعی طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ جیسا کہ علامہ شبلی نعمانی نے سید صاحب کے مذکورۂ بالا مضمون سے سات ماہ پہلے "الندوہ" ہی کے جون ۱۹۰۷ء کے شمارے میں "مسئلہ ارتقا اور ڈارون" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، اُس میں اس کی طرف اشارہ اس طرح کیا تھا :

"لیکن ایسا مسئلہ جس کو قریباً یورپ کے تمام حکما تسلیم کرتے جاتے ہیں، اس قابل نہیں کہ اس کو ہنسی میں اُڑا دیا جائے"۔ [۳۹]

واضح رہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے یہ مضمون محض فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تحریر کرتے ہوئے اس سلسلے میں بعض حکمائے اسلام کے نظریات بیان کئے ہیں۔ مگر اس میں قرآن مجید سے نفیاً یا اثباتاً کوئی استدلال نہیں کیا ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ ایک تاریخی نوعیت کا مضمون ہے۔

غرض خود سید صاحب نے بھی اپنی حسبِ ذیل عبارت کے ذریعہ کچھ اسی قسم کا تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ گویا یہ مسئلہ اجماعی طور پر طے شدہ ہے :

"مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا موجود ہے جو مسئلہ ارتقا کو نہ صرف صحیح سمجھتا ہے بلکہ اس مسئلہ کی

---

[۳۸] مقالاتِ سلیمان : ۳/۱۷۴، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ۱۹۷۱ء

[۳۹] مقالاتِ شبلی : ۷/۶۲، ۱۹۵۳ء

صحت کا اس کو اس درجہ اعتقاد ہے کہ وہ کہتا ہے کہ جب قرآن مجید مسئلہ ارتقا کا منکر ہے تو کون مانے گا کہ قرآن پاک جدید فلسفے کے بالکل مطابق ہے ؟ یورپ کے کُل علمائے طبیعیات بھی اس گروہ کے ہم زبان ہیں"۔[۴۰]

یہ ہے وہ پس منظر جس میں یہ مضامین اضطراری طور پر سپردِ قلم کئے گئے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ یورپ کے تمام حکما اور کُل علمائے طبیعیات اس نظریہ کو صحیح سمجھتے ہیں حالانکہ یہ محض ایک پروپگنڈہ ہے اور علمائے اسلام کی ایک خاصی تعداد مغرب کے اس پروپگنڈے سے متاثر نظر آتی ہے۔ جب کہ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ ماہرین حیاتیات biologists کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو اس کو محض ایک مفروضہ hypothesis سمجھتی ہے، حتیٰ کہ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اس نظریہ کے حامی ہیں، جب کہ متعدد سائنس داں اور ماہرین معقول دلائل کی بنا پر اس کو غلط بھی قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا یہ کوئی اجماعی یا طے شدہ مسئلہ نہیں ہے۔

بہرحال علامہ سید سلیمان ندوی کے مضمون میں مصری علماء کے خیالات کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور وہ ان کے خیالات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ آپ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ ارتقا بجائے خود ثابت نہیں ہے، کیونکہ اس سلسلے میں جو دلائل بیان کئے جاتے ہیں ان سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔[۴۱] مگر پھر فوراً ہی یہ کہتے ہوئے کہ "اگر مسئلہ ارتقا صحیح بھی ہو تو قرآن اس کا منکر نہیں" بعض قرآنی آیات کی تشریح اس انداز سے کرتے ہیں گویا کہ قرآن ارتقا کی تائید کر رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں امام راغب اصفہانی کی ایک مجمل عبارت کا حوالہ بھی دیا ہے۔[۴۲] اور میں سمجھتا ہوں کہ سید صاحب جیسے صائب اور راسخ العقیدہ صاحبِ علم کی نگارشات میں یہ اپنی نوعیت کی منفرد تحریر ہے جو ذرا "ڈھیلے ڈھالے" قسم کی ہے۔ مگر جیسا کہ موصوف کے لائق شاگرد مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے "مقالاتِ سلیمان" کے دیباچے میں تصریح کی ہے کہ یہ مضمون سید صاحب کے ابتدائی دور کا ہے جو بعد کے ذوق سے مختلف ہے۔ واضح رہے کہ اس ضمن میں سید صاحب کا تذکرہ محض علمی دیانت داری کے تحت کیا گیا ہے ورنہ سید صاحب کی تحریر میں دیگر اہلِ علم کی طرح ادّعائیت موجود نہیں ہے۔

---

[۴۰] مقالاتِ سلیمان : ۱۶۴/۳ [۴۱] و [۴۲] ایضاً ص ۱۶۷-۹۔

ارتقا کا جادو چل نہیں سکتا

واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل سے بعض علمی حلقوں ـــ خصوصاً مصری علماء کے نزدیک ـــ یہ ایک چلا ہُوا فقرہ بلکہ ایک فیشن سا بن گیا تھا کہ "نظریۂ ارتقا اول تو ثابت نہیں ہے، اور اگر ثابت ہے تو قرآن اس کا منکر نہیں ہے"۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب ارتقا بجائے خود ثابت نہیں ہے تو پھر اس کو صحیح ثابت کرنے کا بیڑا ہی کیوں اُٹھایا جائے اور اس کو مستقبل کے مفسّر کے حوالے کیوں نہ کر دیا جائے؟ ظاہر ہے کہ جو چیز بجائے خود ثابت نہیں ہے اس کو ثابت کرنے کے آخر ہم خود مکلّف کیوں ہوں؟ اور وہ بھی قرآنِ عظیم جیسی کتاب میں تاویل کرکے! فرض کیجئے زمانۂ مستقبل میں اگر تمام سائنس داں اس نظریہ سے اپنی دست برداری کا اعلان کر بیٹھیں، تو کیا اس غلط تاویل کا بُرا اثر نہیں پڑے گا؟ اور اس کی وجہ سے گمراہ فرقوں اور طبقوں کو اپنی من مانی تاویلات کے لئے بڑھاوا نہیں ملے گا؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک کمزور موقف ہے جس کی وجہ سے قرآنِ حکیم بجائے خود مشکوک ہوجائے گا اور اس کی قطعیت متاثر ہوجائے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید ایک "لاریب فیہ" صحیفہ ہے جس میں اس قسم کی چُناں وچُنیں کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی۔

قرآن سے کوئی بات ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بغیر کسی تاویل یا انحراف کے صرف اُس کے ثابت شدہ نُصوص یا واضح بیانات (جو اُصولِ فقہ کی زبان میں عبارۃ النص اور اشارۃ النص وغیرہ کہلاتے ہیں) سے استدلال کیا جائے۔ اور مُجمل ومُبہم آیات (متشابہات) کو مفصّل یا غیر مُبہم آیات (مُحکمات) کی روشنی میں سمجھا جائے۔ ان اُصولوں کی رُو سے بغیر کسی تاویل کے جو مفہوم ثابت ہوگا وہ قابلِ استدلال ہوگا اور اُس کو قرآن کا صحیح مفہوم ومنشا قرار دیا جائے گا۔ تمام علمائے حق کا طریقۂ کار یہی رہا ہے اور اسی میں سلامتی ہے۔

غرض خُدا کی شان دیکھئے جس نظریہ کے متعلق ایک "متفق علیہ" مسئلہ ہونے کا دعویٰ کیا جا رہا تھا وہ لگ بھگ ایک صدی گزر جانے کے باوجود اب تک نہ صرف ایک مفروضے سے آگے بڑھ نہیں سکا ہے، بلکہ اب تو محققین اور اہلِ بصیرت اس مفروضے سے اپنی بیزارگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ

علمی حیثیت سے ثابت نہیں ہے۔ اور اس کو ثابت کرنے کے لئے جتنے بھی طریقے اپنائے جا رہے ہیں، ان سب میں مسلسل ناکامی ہو رہی ہے۔ اور اس بے بنیاد نظریہ کو محض مادہ پرست ہی، مذہب کی ضد میں، اب تک سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ورنہ اس میں اب کوئی جان باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اور اس سلسلے میں محققین کے اعتراضات کا ایک دفتر سامنے آچکا ہے۔ انشاء اللہ اس موضوع پر تفصیلی بحث اپنی زیرِ تکمیل کتاب "قرآنِ حکیم اور نظریۂ ارتقا" میں پیش کی جائے گی۔ اگرچہ بعض شہادتیں باب اول میں بھی نقل کی جا چکی ہیں۔

قرآن مجید کی قطعیت اور چند اُصول اَوّلیہ

یہ تھا ہمارے مفکرین اور دانشوروں کے افکار و خیالات کا ایک تنقیدی جائزہ، جو نظریۂ ارتقا سے محض پروپگنڈے کے زور پر مرعوب و متاثر ہو کر قرآنِ عظیم جیسی قطعی اور بے مثال کتابِ حکمت کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے اور ان میں سے بیشتر نے آدم نام کی کسی شخصیت کے وجود سے انکار کرتے ہوئے اس کو محض ایک تمثیلی بیان قرار دے کر قرآن مجید کو نظریۂ ارتقا کے مطابق ثابت کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔ پھر قرآنی آیات اور اُس کے قطعی نصوص (واضح بیانات) میں بھی طرح طرح کی تاویلیں کرنے لگ گئے۔ حالانکہ قرآن کریم اپنے قطعی بیانات کی وجہ سے ان لغو تاویلات کا متحمل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اُس کے تمام بیانات روزِ روشن کی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو اولین بشر قرار دیتے ہیں اور ان ناقابلِ تردید بیانات کو صحیح احادیث مزید قطعیت عطا کرتی ہیں، جن کے ملاحظہ سے ان مہمل تاویلات کا دروازہ پوری طرح اور ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اگلے ابواب کے مباحث سے ظاہر ہوگا۔

اس موقع پر قرآنِ مجید کی قطعیت کے بارے میں چند اُصولِ اوّلیہ first principles بیان کرنے مقصود ہیں، جو قرآن اور جدید مسائل کو سمجھنے کے لئے فکر و نظر کے ہر موڑ پر انشاء اللہ ایک رہنما کا کام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلا اور بنیادی اُصول (جو شیخ الاسلام علامہ ابنِ تیمیہؒ کا قول ہے) یہ ہے کہ عقلِ صحیح (صحیح عقلی نتیجہ) اور نقلِ صحیح (نصوصِ شریعت) میں تعارض و تضاد کبھی نہیں ہو سکتا:

النصوص الثابتة فی الکتاب والسنة لا یعارضها معقول [بیّن] قط، ولا یعارضها الا ما فیہ اشتباہ واضطراب : وہ نصوص جو کتاب وسُنّت سے ثابت ہوں اُن کے خلاف کوئی عقلی چیز (جو صریح ہو) کبھی ثابت نہیں ہوسکتی، مگر ہاں جب کہ وہ بجائے خود مشتبہ اور گڈمڈ ہو۔[۴۳]

موصوف نے یہ بات اُس دور میں فرمائی تھی جب کہ منطق و فلسفہ کا غلبہ تھا۔ اور "معقول" یا "عقل" سے مراد یہی منطق و فلسفہ ہے۔ مگر آج چونکہ علم وسائنس کا دور ہے لہٰذا اب اس زرّین اُصول میں وسعت دے کر اس کے دائرہ کو تحقیقاتِ جدیدہ تک بھی لے جایا جاسکتا ہے۔ اور اس کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ "کتاب وسُنّت کے نصوص کے خلاف کوئی علمی حقیقت، جو واقعی حقیقت ہو، ہرگز ثابت نہیں ہوسکتی، اِلّا یہ کہ وہ خود ہی مشتبہ اور غیر واقعی ہو۔"

اور اس سلسلے میں دوسرا زرّین اُصول یہ ہے کہ جب کبھی عقل اور نقل (شرع) میں بظاہر تعارض نظر آئے تو نقل کو عقل پر مقدم کرنا واجب ہوگا، جیسا کہ علامہ موصوف فرماتے ہیں :

اذا تعارض الشرع والعقل وجب تقدیم الشرع۔ لأن العقل مصدّق للشرع فی کل ما أخبر بہ، والشرع لم یصدّق العقل فی کل ما أخبر بہ: جب کبھی شریعت اور معقولات میں تعارض ہو تو شریعت کو معقولات پر مقدم کرنا واجب ہوگا۔ کیونکہ معقولات شریعت کے مصدّق ہیں اُن تمام چیزوں میں جن کو شریعت بیان کرتی ہے۔ اس کے برعکس شریعت معقولات کی بیان کردہ تمام چیزوں کی مُصدّق نہیں ہے۔[۴۴]

ظاہر ہے کہ خُدائی علم قطعی اور انسانی علم ظنّی ہے۔ لہٰذا شریعت کے تمام بیانات و منصوصات اُس علیم وخبیر ہستی کی جانب سے ہیں جس کا علم ماضی، حال اور مستقبل کا یکساں طور پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔ لہٰذا وہ اپنے کلامِ برحق میں کسی ایسی چیز کی خبر دے ہی نہیں سکتا جو مستقبل میں

---

۴۳ موافقة صحیح المنقول لصریح المعقول، از ابن تیمیہ : ۱/۱۲۶، جدید ایڈیشن، ۱۹۸۵ء

غلط ثابت ہو سکتی ہو۔ اور قرآن حکیم کے نصوصِ ثابتہ (واضح بیانات) کو کسی بھی معقول دلیل سے (جو منطقِ صحیح کا درجہ رکھتی ہو) اب تک غلط ثابت نہیں کیا جاسکا ہے۔ اور اسی طرح زمانے کے سیکڑوں کروٹوں اور ہزاروں فکری انقلابات، حتّٰی کہ علم و سائنس کی جدید سے جدید تر تحقیقات کی بنا پر بھی اس کے کسی بھی بیان کو اب تک چیلنج نہیں کیا جاسکا ہے۔ بلکہ تحقیقاتِ جدیدہ کے باعث دن بدن اُس کے بیانات کی تصدیق و تائید ہی ہو رہی ہے اور اُس کے اشارات و کنایات تک کی حقیقت کھُل کر سامنے آرہی ہے۔ یہ اس بات کی قطعی و یقینی دلیل ہے کہ یہ کلامِ برحق اُسی عظیم اور لازوال ہستی کی جانب سے نازل ہوا ہے جس نے اس عالمِ آب و گِل اور اُس کے تمام مظاہر کی تخلیق کی ہے۔ اور اسی بنا پر اُس کا علم محکم بنیادوں پر قائم ہے، اور زمانے کے تغیّرات و انقلابات اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا کسی بھی مسئلے میں جلد بازی سے کام لے کر اور قرآن حکیم کے صریح الفاظ و بیانات (واضح نصوص) میں تاویل کر کے اُن کے اصل مفہومات سے ہٹانا ایک غلط اور باطل اُصول ہے۔

حاصل یہ کہ انسانی نظریات و مفروضات میں سے جو بھی چیز شریعت کے واضح نصوص (صریح بیانات) سے ٹکراتی ہو اُس کی حیثیت ایک فاسد قسم کے شبہ سے زیادہ نہیں ہے جس کو عقلاً باطل قرار دیا جاسکتا ہے، جیسا کہ علامہ ابنِ تیمیہ فرماتے ہیں:

وقد تأملت ذلك في عامة ما تنازع الناس فيه، فوجدت ما خالف النصوص الصحيحة الصريحة فاسدة يعلم بالعقل بطلانها بل يعلم بالعقل ثبوت نقيضها الموافق للشرع: میں نے اس مسئلے میں جس سے لوگ عام طور پر دوچار ہیں، کافی غور کیا تو میں نے پایا کہ جو چیز صحیح و صریح نصوص کے خلاف ہو وہ فاسد ہے، جس کا باطل ہونا عقل سے معلوم ہو سکتا ہے۔ بلکہ درحقیقت عقل کے ذریعہ اُس کی نقیض بھی معلوم کی جاسکتی ہے جو موافقِ شریعت ہو سکتی ہے۔[۴۵]

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ علامہ ابنِ تیمیہؒ نے اپنے دور (ساتویں اور

[۴۵] موافقة صحيح المنقول لصريح المعقول: ۱/۱۲۲

آٹھویں صدی ہجری) میں جو کچھ بھی تحریر فرمایا تھا وہ موجودہ دور کے احوال و کوائف پر بھی پوری طرح صادق آرہا ہے۔ اور موصوف کی یہ کتاب (موافقة صحیح المنقول لصریح المعقول) جو عقل و نقل یا شریعت و معقولات کی تطبیق میں ایک بے نظیر چیز ہے، اس قسم کے قیمتی اور زرین اُصولوں سے بھری ہوئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو نئے انداز میں ایڈٹ کیا جائے اور اس کے کار آمد اُصولوں سے علمی دُنیا کو رُوشناس کرایا جائے۔ عصرِ جدید کی رہنمائی کے لئے یہ ایک تریاق کا حکم رکھتی ہے۔

قرآن ہر دور کے لئے ایک فیصلہ کن کتاب

بہرحال اُوپر جو کچھ بیان کیا گیا اُس کی روشنی میں زیرِ بحث مسئلے میں غور کرنے پر اُس کا بُطلان بھی دو اور دو چار کی طرح ثابت ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے بودے پن پر جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں علمی دلائل قائم کئے جائیں، نہ کہ ایک باطل چیز کو حق قرار دے کر اس سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ قرآن حکیم کے متعلق خود رب العالمین کا ارشاد ہے کہ اس میں باطل یا نامعقول بات کبھی در آ نہیں سکتی:

وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ۝ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ : یہ وہ زبردست کتاب ہے جس میں باطل (غیر واقعی بات) نہ اُس کے آگے کی راہ سے (زمانۂ مستقبل میں) در آسکتی ہے اور نہ پیچھے کی راہ سے (ماضی میں)۔ کیونکہ یہ اُس ہستی کا اُتارا ہوا کلام ہے جو حکمت والا اور خوبیوں والا ہے۔ (حٰم سجدہ : ۴۱-۴۲)

ظاہر ہے کہ یہ کتابِ حکمت نوعِ انسانی کی ہدایت اور اُس کی تعمیرِ فکر کے لئے نازل کی گئی ہے، تاکہ اس کے ذریعہ باطل افکار و نظریات کا قلع قمع ہو سکے۔ نہ کہ اُلٹے وہ خود باطل افکار و نظریات کی تائید و حمایت کرنے لگ جائے۔ اگر بالفرض ایسا ہو تو پھر زمین و آسمان کا نظام ہی درہم برہم ہو جائے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ : اور اگر (دین) حق ان لوگوں (منکرینِ حق کے غلط خیالات و خواہشات) کی پیروی کرنے

لگ جائے تو پھر زمین و آسمانوں اور ان کی مخلوقات کا (نظام) ہی بگڑ جائے۔ (مؤمنون: ۷۱)

بلکہ یہ وہ زبردست کتاب ہے جو پورے عالمِ انسانی کو حق اور ناحق کے بارے میں متنبہ کرنے اور اُسے خدائی پیغام سنانے کے لئے نازل ہوئی ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا:

بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندے (محمدؐ) پر فرقان (حق و باطل میں تمیز کرنے والی کتاب) نازل کی تاکہ وہ سارے جہاں کو متنبہ کرسکے۔ (فرقان: ۱)

اس کتابِ حکمت میں ہر دور کے احوال و کوائف مذکور ہیں، جو باطل سے نبرد آزمائی کے سلسلے میں خدائی نشانات و دلائل کی حیثیت رکھتے ہیں:

لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْكُمْ كِتٰبًا فِیْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: ہم نے تمہارے پاس ایک ایسی کتاب بھیج دی ہے جس میں تمہارا تذکرہ موجود ہے، کیا تم نہیں سمجھتے؟ (انبیاء: ۱۰)

وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ: اور ہم نے تم پر وہ کتاب اُتاری ہے جو ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والی ہے۔ (نحل: ۸۹)

اس کتابِ حکمت کو نازل کرنے والا اس عالمِ رنگ و بو کی ہر چیز سے واقف اور باخبر ہے:

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: کہہ دو کہ اس کتاب کو اُس نے اُتارا ہے جو زمین اور آسمانوں کے (تمام) بھیدوں کا جاننے والا ہے۔ (فرقان: ۶)

اس کتابِ حکمت اور اُس کے مندرجات کی حیثیت ظن و تخمین کی سی نہیں ہے۔ بلکہ وہ خدائے علیم و خبیر کا کلام ہونے کی وجہ سے کسی بھی معاملے میں فیصلہ کُن سند ہونے کا درجہ رکھتے ہیں:

هٰذَا كِتٰبُنَا یَنْطِقُ عَلَیْكُمْ بِالْحَقِّ: یہ ہماری کتاب ہے جو تم پر ٹھیک ٹھیک بول رہی ہے۔ (جاثیہ: ۲۹)

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ۔ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ: یقیناً یہ ایک فیصلہ کُن کلام ہے، ہنسی مذاق کی کوئی بات نہیں۔ (طارق: ۱۳-۱۴)

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا : اور اسی طرح ہم نے اس قرآن کو ایک واضح فرمان بنا کر اتارا ہے۔ (رعد : ۳۷)

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ : اور یہ تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے۔ ہم نے سبق حاصل کرنے والوں کے لئے آیتیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔ (انعام : ۱۲۶)

اسی وجہ سے علماء اور مفکّرینِ اسلام کو اس کتابِ حکمت میں غور و فکر کرنے اور ہر دور کے حالات و مقتضیات کے مُطابق باطل پرستوں کی منطق کا رد کرنے کی پُر زور دعوت دی گئی ہے :

هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ : یہ وہ مُبارک کتاب ہے جو تمہارے پاس اس لئے بھیجی گئی ہے تاکہ وہ اس کی آیات میں غور کریں اور دانشمند چونک سکیں۔ (ص : ۲۹)

قرآنِ حکیم کا علمی امتیاز

قرآنِ حکیم دنیا کے تمام مذہبی صحیفوں کے مقابلے میں علمی اعتبار سے ایک امتیازی مقام رکھتا ہے، جس کی نظیر دنیا کا کوئی دوسرا مذہبی صحیفہ پیش نہیں کرسکتا۔ اور چونکہ وہ ایک علمی و عقلی صحیفہ ہے اس لئے وہ آباء پرستی، تقلیدِ جامد اور کسی بھی معاملے میں اندھی عقیدت کی مذمت کرتے ہُوئے لوگوں کو عقل و دانش کا واسطہ دیتا اور مسائلِ حیات میں غور و فکر پر اُبھارتا ہے۔ وہ کسی بھی چیز کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لینے کی دعوت نہیں دیتا، اور نہ وہ اپنے عقائد و نظریات کو دوسروں پر زبردستی مسلّط کرنے ہی کا قائل ہے۔ لہٰذا وہ کسی بھی مسئلے میں چاہے وہ شرعی ہو یا عقلی و فکری، ہمیشہ علم کی دُہائی دیتا ہے، اور انکار کرنے والوں سے حُجّت و بُرہان یا علمی سند طلب کرتے ہُوئے کٹ حجّتی کی مذمّت کرتا ہے، جو نفسانی خواہشات پر چلنے اور حقائق سے مُنہ موڑنے کا دوسرا نام ہے۔ اس اعتبار سے قرآنِ عظیم دُنیا کا پہلا اور آخری صحیفہ ہے جس نے جذباتیت کے بجائے عقلی استدلال کو اپنایا ہے۔ چنانچہ وہ دلیل و حجّت کے بارے میں منکرینِ حق سے مطالبہ کرتا ہے :

اِیۡتُوۡنِیۡ بِکِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ ھٰذَاۤ اَوۡ اَثٰرَۃٍ مِّنۡ عِلۡمٍ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ :
(کہہ دو کہ) اگر تم سچے ہو تو میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ یا کوئی علمی دستاویز پیش کرو۔
(احقاف : ۴)

نَبِّـُٔوۡنِیۡ بِعِلۡمٍ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ : اگر تم (اس معاملے میں) سچے ہو تو مجھے اس کی علمی سند بتاؤ۔ (انعام : ۱۴۳)

قُلۡ ھَلۡ عِنۡدَکُمۡ مِّنۡ عِلۡمٍ فَتُخۡرِجُوۡہُ لَنَا ؕ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا تَخۡرُصُوۡنَ : کہہ دو کہ اگر تمہارے پاس کوئی علمی ثبوت ہو تو اُسے ہمارے سامنے لے آؤ۔ تم تو بس خیالی باتوں پر چلتے اور ٹامک ٹوئیاں مارا کرتے ہو۔ (انعام : ۱۴۸)

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَھۡوَآءَھُمۡ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ : بلکہ یہ بے انصاف لوگ کسی علم کے بغیر محض اپنی خواہشات پر چلتے ہیں۔ (روم : ۲۹)

لہٰذا یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ علمی حقائق یا آفاقی صداقتوں کے مقابلے کی تاب نہ رکھتا ہو۔ بلکہ علمی حقائق (نہ کہ محض نظریات و مفروضات) تو ابدی سچائیوں کا روپ دھار کر اُس کے "نصوصِ ابدی" کا جزو بننے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں مگر چونکہ بے دین لوگ یا باطل پرست ان "حقائق" کے ساتھ ساتھ اپنی خواہشاتِ نفس (اَھواء) کو بھی شامل کر کے حق اور باطل کو گڈمڈ کر دیتے ہیں، تاکہ وہ عوام کو غلط راہ پر ڈال سکیں۔ لہٰذا ایسے باطل پرستوں سے قرآنِ حکیم کا مطالبہ (ہر دور میں) یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفس یا مادہ پرستانہ رجحانات سے ہٹ کر خالص "علمی ثبوت" پیش کریں، جس کو قرآن اپنی اصطلاح میں "علم" کہتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ شرک اور مظاہر پرستی کے حق میں جس طرح کوئی "علمی" دلیل نہیں مل سکتی، اسی طرح الحاد و مادہ پرستی کے حق میں بھی کوئی سائنسی ثبوت فراہم نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ حکیم چونکہ ایک ابدی و سرمدی صحیفہ ہے، اس لئے اس کا یہ مطالبہ بھی ہمیشہ اور ہر دور کے لئے تازہ اور ہر قسم کے منکرینِ خدا کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔

غرض قرآنِ حکیم سراپا علم اور سراپا دلیل ہے۔ کیونکہ وہ مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے

"علم" کے معیار پر پورا اترتا ہے:

وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ : اور ہم نے اُن کے پاس ایک ایسی کتاب بھیج دی ہے جسے ہم نے (اپنے کامل) علم سے وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ (اعراف : ۵۲)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا: اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے دلیل آچکی ہے، اور ہم نے تمہارے پاس ایک نورِ روشن (قرآن) بھیج دیا ہے۔ (نساء : ۱۷۴)

حقیقت یہ ہے کہ اس مادی کائنات میں اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی چیز نہیں رکھی ہے جو اُس کے کلامِ برحق کی نقیض یا مخالف بن سکتی ہو۔ لہٰذا دلیل و استدلال کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی بات ہی سب پر غالب رہے گی:

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ : کہہ دو کہ اللہ ہی کی حجت غالب رہے گی۔ (انعام : ۱۴۹)

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا : جو لوگ (نظامِ فطرت میں موجود) اللہ کی نشانیوں میں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس پہنچی ہو (خواہ مخواہ) جھگڑتے ہیں تو یہ اللہ اور اہلِ ایمان کے نزدیک بڑی نازیبا حرکت ہے۔ (مؤمن : ۳۵)

أَمْ أَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوا بِهِ يُشْرِكُونَ : کیا ہم نے اُن پر ایسی کوئی دلیل اُتار دی ہے جو اُن کے شرک کی وکالت کر رہی ہو؟ (روم : ۳۵)

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهِ عِلْمٌ : اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی پرستش کرتے ہیں جس کی کوئی سند اُس نے نہیں اُتاری، اور نہ اُن کے پاس اُس کا کوئی علم ہے۔ (حج : ۷۱)

مادیت اور اُس کے نظریات شرک ہی کا روپ

واضح رہے کہ شرک کا مطلب یہی نہیں ہے کہ کسی مظہرِ فطرت کو پوجا جائے اور اُس کے سامنے

سرِ نیاز جھکا دیا جائے۔ بلکہ حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مادہ پرستی یا نیچریت بھی شرک ہی کی ایک قسم نظر آئے گی۔ کیونکہ مادہ پرستوں نے خدا کی جگہ مادہ کو بٹھا دیا ہے اور اُس کی طرف وہی ساری صفات منسوب کر رہے ہیں جو خدا کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ اور اس اعتبار سے نظریۂ ارتقا پر اعتقاد رکھنا شرک ہی کا ارتکاب کرنا ہے۔ گویا کہ ارتقا پسند لوگوں نے ایک خلّاق ہستی کا وجود تسلیم نہ کر کے عملاً لاکھوں "انواعِ حیات" کو الٰہ اور معبود تسلیم کر لیا ہے۔ اگرچہ وہ ان کو اپنی زبان سے خدا نہ کہیں، مگر خلّاقِ ازل کے انکار کے بعد عملاً انہیں انواع یا مظاہرِ فطرت کو خدا قرار دینے کے برابر ہے۔ ظاہر ہے کہ جب بغیر خدائی مداخلت کے ایک نوع کسی دوسری نوع کو جنم دیتی ہے تو گویا کہ وہ ایک "الٰہ" کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اور اس اعتبار سے جتنے انواعِ حیات ہیں گویا کہ اتنے ہی الٰہ اور معبود بھی ہیں۔

اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اس مادی کائنات میں شرک یا الحاد کی کوئی دلیل نہیں رکھ چھوڑی ہے۔ لہٰذا خلّاقِ فطرت کا چیلنج ہے کہ اس پورے صحیفۂ فطرت میں ایسا کوئی علمی ثبوت جو اُس کی وحدتِ خدائی کے خلاف یا متعدد "خداؤں" کے اثبات میں موجود ہو تو پیش کیا جائے:

ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ : کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔ (نمل: ۶۴)

خلاصہ یہ کہ قرآنِ حکیم دنیا کے تمام صحیفوں میں ایک ممتاز اور بے نظیر کتاب ہے جو تقلید جامد اور اندھی عقیدت کی مذمت کرتا ہے۔ لہٰذا اسلام اور قرآن پر کسی بھی حیثیت سے غیر عقلی اور غیر منطقی ہونے کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ حقیقت کی رُو سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ آج رُوئے زمین پر علمی محفلوں میں صحیح عقل و منطق کے جو بھی چرچے ہو رہے ہیں، وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اسلام اور قرآن ہی کا صدقہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں علم اور عقل پر سیکڑوں آیات موجود ہیں، جس سے اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

غرض قرآن کسی بھی حیثیت سے علم و عقل کا انکار نہیں کرتا، بلکہ درحقیقت علمِ صحیح اور عقلِ صحیح کو پروان چڑھاتا ہے۔ مگر اس کے برعکس وہ اندھی عقیدت، علمی تعصّب اور کسی بھی قسم کے

غیر منطقی رجحان کی سخت مذمت کرتا ہے اور صحیح نتائج حاصل کرنے کے لئے مظاہرِ عالم اور ان کے نظاموں میں غور و فکر کرکے استقرائی حیثیت سے صحیح مشاہدہ و تجربہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور اس اعتبار سے جدید سائنس کی تدوین کی بنیاد در حقیقت قرآنِ عظیم ہی نے رکھی ہے۔ اس کی انقلابی دعوت اور انوکھے طرزِ فکر کو اپنا کر ہی مسلمانوں نے اپنے دور میں شاندار علمی ترقیاں کیں اور جدید سائنس کی بنیاد رکھی۔ لہٰذا ایسی انقلابی اور بے مثال کتابِ حکمت پر رجعت پسندی کا الزام کبھی عائد نہیں ہو سکتا۔

قرآن اور نظامِ کائنات میں کوئی تعارض نہیں ہے

قرآنِ عظیم کے مضامین و مندرجات کے سلسلے میں کسی بھی حیثیت سے شک و شبہ کرنا گویا کہ علمِ الٰہی کی قطعیت کے بارے میں تردد یا ارتیابیت پیدا کرنا ہے۔ گویا یوں فرض کر لینا ہے کہ قرآن میں بعض غیر واقعی امور و واقعات بھی مذکور ہو گئے ہوں گے۔ اور اس طرح فرض کر لینا قرآن کی صداقت کو مشکوک قرار دینا ہے، جو ایمان کی کمزوری اور بعض صورتوں میں اس کی محرومی پر دلالت کرتا ہے۔ حالانکہ خود باری تعالیٰ اپنے کلامِ ابدی کی صداقت و حقانیت کے بارے میں صاف صاف ارشاد فرماتا ہے:

الٓمّٓ۔ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ : اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب رب العالمین کی جانب سے نازل ہوئی ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمدؐ نے اس کو خود سے بنا لیا ہے؟ بلکہ وہ تو تیرے رب کی جانب سے برحق کتاب ہے۔ (سجدہ : ۱-۳)

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۔ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ : اور یہ قرآن رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔ اسے امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔ تیرے دل پر تاکہ تو متنبہ کرنے والا بن سکے۔ یہ کتاب واضح عربی زبان میں ہے۔ (شعراء : ۱۹۲-۱۹۵)

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ : یہ کتاب اللہ کی جانب سے اتاری گئی ہے جو غالب اور حکمت والا ہے۔ بے شک یہ کتاب ہم نے (پوری)

سچائی کے ساتھ آپ کے پاس پہنچی ہے۔ (زمر: ۱-۲)

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ : حق بات تیرے رب کی جانب سے ہے۔ لہٰذا تو شک کرنے والا ہرگز مت بن۔ (بقرہ: ۱۴۷)

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِيْنَ : اور جو کچھ تجھے بذریعہ وحی بتایا گیا ہے اُس کی پیروی کر اور اُس پر ثابت قدم رہ، یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کردے۔ کیونکہ وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ (یونس: ۱۰۹)

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ : اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حقانیت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس باب میں اہلِ ایمان کے لئے ایک بڑی نشانی موجود ہے۔ (عنکبوت: ۴۴)

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ : اور اللہ باطل (بے سروپا بات) کو مٹا دیتا اور حق (صحیح و سچی بات) کو اپنے کلمات (کلامِ برحق) کے ذریعہ ثابت کردیتا ہے۔ (شوریٰ: ۲۴)

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ : یہ ہماری کتاب ہے جو تم کو کھری کھری سنا رہی ہے۔ (جاثیہ: ۲۹)

ان آیات بیّنات کے ذریعہ یہ حقیقت واشگاف ہوجاتی ہے کہ قرآن کریم اور مظاہر کائنات اور ان کے نظاموں کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے مؤیّد و مصدّق ہوں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارض و سماوات اور اُن میں موجود شدہ اشیاء کو جس طرح "حقانیت" کے ساتھ پیدا کیا ہے، بالکل اسی طرح اُس نے اپنے کلامِ پاک کو بھی "حقانیت" کے ساتھ اُتارا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف ہو ہی نہیں سکتے۔ اور زمین و آسمانوں میں ایسی کوئی چیز کبھی نہیں پائی جاسکتی جو اس کلامِ برحق کو جھٹلا سکتی ہو۔ حسبِ ذیل آیاتِ کریمہ اس پہلو کی بھی نشاندہی کرتی ہیں، جن میں ان دونوں کی صداقت و سچائی کے لئے لفظ "حق" کو یکساں طور پر استعمال کیا گیا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ : وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حقانیت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ (انعام: ۷۳)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ : اور ہم نے آسمانوں، زمین اور ان دونوں کے درمیان موجود شدہ اشیاء کو حقانیت (سچائی، حکمت اور مطابقت) ہی کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ (روم : ۸)

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ : بے شک ہم نے یہ کتاب تیرے پاس حقانیت کے ساتھ بھیجی ہے، تاکہ تو اللہ کی فہمائش کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کر سکے۔ (نساء : ۱۰۵)

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ : تم کہہ دو کہ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے حق بات آ چکی ہے۔ (یونس : ۱۰۸)

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ : اللہ وہ ہے جس نے اس کتاب اور میزان کو حقانیت کے ساتھ اُتارا ہے۔ (شوریٰ : ۱۷)

یعنی اس کتابِ حکمت کے ساتھ اُس نے ایک میزانِ عدل بھی اُتاری ہے، جس کے مطابق حق و باطل کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے اس مادی کائنات کے تمام مظاہر اس میزانِ عدل کا نمونہ ہیں جو ہمیشہ اس کلام برحق کی تصدیق و تائید کر کے اپنی نیاز مندی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ نزولِ قرآن سے لے کر آج تک اس عالمِ رنگ و بو کی ایسی کوئی علمی صداقت دریافت نہ ہو سکی جو اس کلامِ پاک کو جھٹلا سکتی اور اُس کے ساتھ معارضہ کر سکتی ہو۔ بلکہ جتنے بھی علمی و آفاقی حقائق دریافت ہو رہے ہیں، وہ سب کے سب برابر اس کی حقانیت پر مُہرِ تصدیق ثبت کرتے جا رہے ہیں اور قیامت تک یہی حال رہے گا۔

باطل پرستوں کی خواہشات اور فیصلۂ جاہلیت

لہٰذا باطل پرستوں کی خواہشات اور اُن کے انحرافات سے کسی بھی درجے میں متاثر ہو کر اس کلامِ برحق کی "اصلاح" کرنے بیٹھ جانا بڑی ہی عبرت اور محرومی کی بات ہے۔ قرآنِ حکیم تو اس سلسلے میں صاف صاف کہتا ہے :

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ : اور تمہارے پاس (صحیح) علم آچکنے کے بعد بھی اگر تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو تمہارے لئے اللہ کی طرف سے کوئی دوست اور مددگار نہیں ہوگا۔ (بقرہ : ۱۲۰)

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ : اور تم اُن لوگوں کی خواہشات کی پیروی مت کرو جنہوں نے ہمارے نشانات و دلائل کو جھٹلایا ہے اور جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے بلکہ وہ اپنے رب کے ساتھ اوروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں۔ (انعام : ۱۵۰)

اس لحاظ سے یہ اور اس قسم کی آیتیں بالکل تازہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور حسبِ ذیل آیات سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ آج ہی کے لئے نازل ہوئی ہیں، جو اُوپر مرقوم ایک آیت (جاثیہ : ۲۹) کے مطابق گویا کہ ہم کو بطورِ نصیحت "کھری کھری" سنا رہی ہیں :

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ۔ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ : اور ہم حکم دیتے ہیں کہ تم ان کے باہمی معاملات میں اللہ کے بھیجے ہوئے کلام کے مطابق فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ان سے بچتے رہو (ایسا نہ ہو) کہ وہ کسی ایسے حکم سے تم کو بہکا دیں جو اللہ نے تم پر نازل فرمایا ہے۔ اگر یہ نہ مانیں تو جان لو کہ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں کے سبب سے ان پر مصیبت نازل کرے، اور اکثر لوگ تو نافرمان ہیں۔ تو کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ یقین رکھنے والوں کے لئے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ (مائدہ : ۴۹-۵۰)

ان آیاتِ کریمہ میں موجودہ دور اور اُس کی نفسیات کی صحیح اور سچی تصویر کشی نظر آتی ہے۔ یہ بھی اس کلامِ برحق کا ایک اعجاز ہے جو ہر دور کے احوال و کوائف پر منطبق ہو کر اس کی صحیح صحیح رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو کتابِ ہدایت کہا گیا ہے۔

چوتھا باب

قرآن تمثیل نہیں واقعہ ہے

حقیقتِ تمثیل

واقعہ یہ ہے کہ قصۂ آدم کو ایک تمثیل قرار دینے والوں نے کبھی اس کے عواقب و نتائج پر سیدھی طرح غور ہی نہیں کیا ہے کہ اس رجحان کی زد کہاں کہاں جاکر پڑتی ہے۔ اور نہ اُنہوں نے تمثیل یا مثال کی حقیقت و ماہیت پر غور کرنے کی زحمت ہی گوارا کی ہے۔ مثل یا مثال درحقیقت ایک چیز کو دوسری پر قیاس یا اعتبار کرنے کو کہتے ہیں، جیساکہ علامہ ابنِ تیمیہؒ اور علامہ ابنِ قیمؒ نے تصریح کی ہے: مثل یا مثال کے ذریعہ ایک چیز کو کسی دوسری چیز سے کسی مناسبت کی بنا پر تشبیہ دینا مقصود ہوتا ہے۔ (تتضمن تشبیہ شئ بنظیرہ، والتسویۃ بینھما بحکم)[1]

الأصل فی المثل قائم علی تمثیل شئ بشئ لوجود عنصر أو أكثر من عناصر التشابہ بینھا۔[2]

علامہ ابنِ قیم نے امثالِ قرآنی پر بحث کرتے ہوئے ان کی اقسام اور نوعیت پر اس طرح روشنی

---

[1] اعلام الموقّعین، ابن قیم: ۱/۱٤۱، مطبوعہ مصر، ۱۹۶۹ء

[2] الأمثال القرآنیۃ، عبدالرحمان حسن حبنکہ المیدانی، ص ۱۰، بیروت، ۱۹۸۰ء

ڈالی ہے کہ " مثل (یا تمثیل) کی حقیقت کسی حکم میں ایک چیز کو دوسری سے تشبیہ دینا اور محسوس چیز کے ذریعہ معقول (غیر محسوس) کو قریب کرنا یا دو محسوس چیزوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کے قریب لانا اور ایک کا دوسرے پر اعتبار کرنا ہے۔ (فانها تشبيه شئ بشئ فی حکمه، وتقريب المعقول من المحسوس، أو أحد المحسوسين من الآخر، واعتبار أحدهما بالآخر)۔[۳]

المثل فی الأصل هو التشبيه۔[۴]

اور یہ مثل یا مثال قیاس ہی کا دوسرا نام ہے: ان ضرب المثل هو القياس[۵]۔ والمثل يقال على المفرد ويقال على الجملة التی هی القياس۔[۶]

تمثیل کس چیز کی؟

ان تصریحات واقتباسات سے بخوبی واضح ہوگیا کہ مثال یا تمثیل سے مراد ایک چیز کو دوسری چیز پر قیاس کرنا یا کسی مناسبت کی بنا پر ایک کو دوسری کے مشابہ قرار دینا ہے۔ لہٰذا اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قصۂ آدم میں تمثیل سے کیا مراد ہے؟ اور قیاس یا تشبیہ کس چیز میں ہے؟ نیز اس میں مُشبّہ اور مُشبّہ بہ (تشبیہ کے دو بنیادی ارکان) کون ہیں اور ان کا مقصود کیا ہے؟ پھر اگر یہ قصّہ بطور تمثیل ہے تو اس کو تمثیلی انداز (ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلاً وغیرہ قسم کے الفاظ کے ساتھ) کیوں نہیں بیان کیا گیا؟ بلکہ اس کے برعکس ایک متعین شخص (آدم) کا نام لینے کی کیا ضرورت تھی؟ اور یہ تمثیل یا تشبیہ کی کونسی قسم ہے؟ یہ اور اس قسم کے بیسیوں سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دئے بغیر محض اتنا کہہ دینا کہ "یہ ایک تمثیل ہے" ایک ہوائی اُڑانے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ قصّہ تمثیل کے اسلوب سے قطعاً مختلف نہ صرف ایک واقعہ کے طور پر بیان ہُوا ہے بلکہ جگہ جگہ اس کی اہمیت کی بنا پر بار بار دہرایا بھی گیا ہے۔ جب کہ پورے قرآن میں کوئی

---

[۳] اعلام الموقّعین، ۱/۱۶۳

[۴] فتاویٰ ابنِ تیمیہ، ۱۴/۵۴، مطبوعہ دارالافتاء ریاض

[۵] و [۶] ایضاً، ۱۶/۴۱

تمثیل ایک سے زیادہ بار دہرائی نہیں گئی ہے ۔ یہ ایک قطعی دلیل ہے کہ یہ واقعہ تمثیل یا خیال آفرینی نہیں ہے ۔

قصۂ آدم تمثیل نہیں واقعہ

نیز اس کے علاوہ تمثیل اور واقعہ کا ایک فرق اور بھی ہے کہ قرآنِ حکیم میں جہاں پر کسی سچّے واقعہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے، تو وہاں پر بطور تاکید کبھی "نبأ" (خبر) کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے ۔ مثلاً :

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ : تم انھیں ابراہیم کی خبر سنا دو ۔ (شعراء : ۶۹)

نَتْلُوا عَلَيْكَ مِنْ نَبَإِ مُوسَىٰ : ہم تم کو موسیٰ کی خبر سناتے ہیں ۔ (قصص : ۳)

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ : اور تم اُنہیں نوح کی خبر دے دو ۔ (یونس : ۷۱)

وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَبَإِ الْمُرْسَلِينَ : اور تمہارے پاس رسولوں کی خبر آچکی ہے ۔ (انعام : ۳۴)

ٹھیک یہی اسلوب حضرت آدم علیہ السلام کے سلسلے میں دو جگہ استعمال کیا گیا ہے ۔ پہلی جگہ آپ کے دو فرزندوں ہابیل اور قابیل کے واقعہ میں :

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ : اور تم ان کو آدم کے دو بیٹوں کی خبر ٹھیک ٹھیک سنا دو ۔ (مائدہ : ۲۷)

اور دوسری جگہ حضرت آدمؑ کے تذکرہ کے بعد ایک علمی پیش گوئی کے طور پر کہ قصۂ آدم کی حقیقت تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گی :

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ : اور تم اس کی خبر (کی صداقت) کچھ عرصے بعد ضرور جان لوگے ۔ (ص : ۸۸)

اس اعتبار سے بھی حضرت آدم علیہ السلام کی متعین شخصیت اور آپ کی عظمت پر بھرپور روشنی پڑجاتی ہے کہ یہ کسی غیر متعین شخص کی تمثیل نہیں بلکہ حقیقی واقعہ ہے ۔

ایک پُرزور اُسلوبِ بیان

اس واقعے کی صداقت وسچائی کا مزید ثبوت یہ ہے کہ اس واقعے کو قرآن مجید میں نہ صرف مختلف اسالیب میں بار بار بیان کیا گیا ہے، بلکہ متعدّد حیثیتوں سے اس کی اہمیت بھی بیان کی گئی ہے۔ اور یہ اندازِ بیان مثال اور تمثیل سے قطعاً میل نہیں کھاتا۔ چنانچہ اس موقع پر قرآنی بلاغت کا ایک پہلو ملاحظہ ہو، جس سے ظاہر ہوگا کہ وہ مختلف حیثیتوں سے اس قصّے کی اہمیت کس طرح ذہن نشین کرانا چاہتا ہے!

سورۂ بقرہ میں جہاں پر قصّۂ آدم کا آغاز ہوتا ہے، وہاں پر اس کی حکایت صیغۂ غائب سے اس طرح شروع ہوتی ہے:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ .... اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا .... اور اُس نے آدم کو تمام چیزوں کے نام بتا دئے۔

قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ .... کہا کہ اے آدم تم ان کو اُن کے نام بتا دو۔

پھر اچانک صیغہ بدل کر جمع متکلّم کے صیغے کے ساتھ یوں کہا جاتا ہے:

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ ..... اور ہم نے فرشتوں سے کہا کہ .....

عربی ادب وبلاغت کی اصطلاح میں اس طرح صیغہ بدل کر خطاب کرنے کو "التفات" کہا جاتا ہے، جو عربی کا ایک معروف اسلوبِ کلام ہے[۵] اور اس اسلوب کے ذریعہ اس واقعہ کی اہمیت جتانا اور اُس کے اِس خاص پہلو کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا اس موقع پر اپنے لئے جمع متکلم کا صیغہ اختیار کرنا یہ ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ اول تو اللہ تعالیٰ نے ضرور اس کا حکم دیا تھا، اور دوسرے یہ کہ یہ بات حقیقت واقعہ ہے، کوئی خیالی قصّہ یا کہانی نہیں۔ بقول استاذ مناع القطان "حقیقی مسلمان وہ ہے جو قرآن کے کلام اللہ ہونے پر ایمان رکھتا ہو اور اس کو ایسی تصویر کشی سے پاک سمجھتا ہو جو تاریخی صداقت کی حامل نہ ہو۔ اور اس لحاظ سے قرآنی قصّے تاریخی حقائق سے بھرپور ہیں جو

---

[۵] اس قسم کی مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو علامہ ابنِ قیم کی کتاب "الفوائد المشوّق الی علوم القرآن وعلم البیان" ص ۹۸-۱۰۴، دار الکتب العلمیہ بیروت۔

بہترین الفاظ اور دلکش اسالیب سے مزین ہیں"۔ [۳۵]

تکریمِ آدم اور ردِّ عیسائیت

اسی طرح اس قصّہ میں قرآنِ حکیم کے دیگر مقامات میں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے، جس سے اس کی انتہائی اہمیت و عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً :

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ : اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ تم آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے اُن (سب) نے سجدہ کیا۔ (اسراء : ۶۱)

یہ آیت انہی الفاظ کے ساتھ سورۂ کہف آیت ۵۰ اور سورۂ طٰہٰ ۱۱۶ میں بھی مذکور ہے۔ اور کچھ ردّوبدل کے ساتھ اعراف ۱۱ میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تاکید کے ذریعہ حضرت آدمؑ کی عظمت و بزرگی کا اظہار مقصود ہے کہ وہ کوئی معمولی ہستی نہیں، بلکہ وہ اس بزمِ کائنات کا دولہا ہے۔ تبھی تو اس کو فرشتوں سے افضل قرار دیتے ہوئے ان کے ذریعہ سجدۂ تعظیمی کرایا گیا۔ اور اس تاکید کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ توریت (موجودہ بائبل کے عہد نامۂ عتیق، جس کو Old testament کہا جاتا ہے) میں جہاں پر قصۂ آدم مذکور ہے وہاں پر حضرت آدمؑ کے لئے فرشتوں کے ذریعہ سجدہ کرانے کے اس واقعہ کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ بائبل کے اس نقص کو ظاہر کرنے کے لئے اس واقعہ کو زیادہ اہمیت دی جاتی۔ نیز اس لئے بھی کہ عیسائیوں نے حضرت آدمؑ کی لغزش کو پوری نوعِ انسانی کے لئے ایک موروثی گناہ قرار دے کر اس کی بنیاد پر ایک دوسرا عقیدہ گڑھ لیا، جو پوری نوعِ انسانی کی توہین و تذلیل کے مترادف ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو گمراہ کرنے کا بھی باعث ہے۔ میری مراد عیسائیوں کے خود ساختہ عقیدۂ کفارہ (atonement) سے ہے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ حضرت آدمؑ کے شرف و عظمت کا اظہار پوری صراحت و اہمیت کے ساتھ کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ اسلام کا ایک اہم ترین مقصد بگڑے ہوئے عقائد کی درستی اور اصلاحِ مذاہب بھی ہے۔ اس لحاظ سے قرآنِ حکیم کے ان بیانات کے ذریعہ جہاں ایک طرف بائبل کا نقص دکھانا مقصود ہے، تو دوسری طرف عیسائیوں کے خود ساختہ عقائد کو غلط ثابت کرنا بھی

---

[۳۵] مباحث فی علوم القرآن، ص ۳۰۹ -

پیش نظر ہے۔ لہٰذا اس نقطۂ نظر سے بھی صاف ظاہر ہے کہ حضرت آدم کی شخصیت حقیقی و واقعی ہے، نہ کہ فرضی یا خیالی۔

تخیّل آرائی اور افترا پردازی

تجدّد پسندوں کا کہنا ہے قرآن میں پوری نوعِ انسانی کو آدم کہا گیا ہے، نہ کہ کسی متعین فرد کو۔ مگر یہ ایک ایسی خیال آرائی اور تخیّل آفرینی ہے جس سے قرآن مجید کا ایک ایک بیان کھلے عام انکار کر رہا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر دو آیتیں بطورِ مثال پیش کی جاتی ہیں، جن میں پوری نوعِ انسانی کو "اولادِ آدم" کہا گیا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزّت بخشی ہے۔ (بنی اسرائیل: ۷۰)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ: پیغمبروں میں سے یہ وہ لوگ جن پر اللہ نے انعام کیا ہے، (یہ سب) آدم کی اولاد ہیں۔ (مریم: ۵۸)

ظاہر ہے کہ ان آیات کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ حضرت آدمؑ تمام انسانوں اور کُل انبیاء علیہم السلام کے باپ ہیں۔ لہٰذا قرآنی حقائق سے مُنہ موڑتے ہُوئے من مانی تاویلات کا سہارا لینا اتنا آسان نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کی غلط تاویلات کی وجہ سے قرآنِ مجید ایک متناقض کلام بن کر رہ جائے گا۔ اور اُس کی ہدایت و رہنمائی کے دیگر تمام مقاصد فوت ہو کر رہ جائیں گے۔ بلکہ وہ انسانی خواہشات کو بروئے کار لانے کے لئے ایک کھلونا بن کر رہ جائے گا۔ لہٰذا اس قسم کی خیال آرائیاں درحقیقت قرآن پر افترا پردازیاں ہیں۔

نظریۂ تمثیل اخوان الصفا کی ایجاد

کسی تاریخی واقعہ یا کسی پیغمبر کے قصے کو بطورِ تمثیل بیان کرنے میں کیا حکمت ہو سکتی ہے اور پھر اس کو جگہ جگہ دُہرانے کا آخر فائدہ ہی کیا ہے؟ کیا بے مقصد قصہ گوئی یا داستان سرائی کے طور پر؟

اصل میں قرآن کے تمثیل ہونے کا خیال "اخوان الصفا" (چوتھی صدی ہجری کے چند

حکما اور فلسفیوں کی ایک جماعت) کی ایجاد ہے، جیساکہ شیخ الاسلام علامہ ابنِ تیمیہؒ نے وضاحت کی ہے۔ یہ چوتھی صدی ہجری کی ایک مذہبی اور سیاسی تحریک تھی، جس پر فلسفے کا غلبہ تھا۔ اور یہ غالی شیعہ، قرامطہ باطنیہ اور فلسفہ زدہ لوگوں کے زیرِ اثر تھی۔ یہ لوگ مجوسیوں اور صابیوں سے اخذ واستفادہ کر کے قرآن اور حدیث کے الفاظ کی تاویل کیا کرتے تھے۔[۹]

یہ ہے اسلام میں تمثیل کے تخیّل کا آغاز اور اس کی ابتدا۔ پھر شدہ شدہ اس تخیّل کا دائرہ وسیع ہونے لگا اور مسلمان "روشن فکروں" نے ہمیشہ باطل فلسفوں اور اُن کے تخیّلات سے متاثر ہو کر "مخالفِ اسلام" نظریات کو موافقِ اسلام ثابت کرنے کے لئے "تمثیل" کا حربہ بڑی "کامیابی" کے ساتھ استعمال کرنا شروع کر دیا، تاکہ باطل سے سمجھوتہ کرنے کے لئے سادہ لوح مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح راضی کیا جاسکے۔ کیونکہ مسلمان قرآن اور حدیث کے علاوہ اور کسی بات کی سند کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا انہیں مطمئن کرنے کے لئے ضروری تھا کہ باطل فلسفوں کو قرآن اور حدیث کے موافق دکھایا جائے۔

خطاب العین

"قرآنی علوم" کے ذیل میں ایک بحث "قرآنی خطابات" کی بھی آتی ہے۔ اس بحث کے مطابق قرآن مجید میں مختلف لوگوں سے خطاب کی نوعیت مختلف ہے۔ اور علامہ بدرالدین زرکشی نے اپنی قابلِ قدر کتاب میں اس کی چالیس قسمیں گنائی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم "خطاب العین" کہلاتی ہے۔[۱۰] اس کا مطلب ہے کسی متعیّن شخص کو مخاطب کرنا، جیسے:

يَاآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ : اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنّت میں رہو۔ (بقرہ : ۳۵)

---

[۹] فتاویٰ ابنِ تیمیہ: ۴/۱۴۳، نیز ملاحظہ ہو اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، مقالہ اخوان الصفا ۲/۱۹۸-۱۹۹ لاہور، ۱۹۶۴ء

[۱۰] البرہان فی علوم القرآن، ۲/۲۲۸، نیز دیکھئے الاتقان فی علوم القرآن : ۳/۹۹، قاہرہ

یَا نُوحُ اھْبِطْ بِسَلَامٍ : اے نوح سلامتی کے ساتھ اُتر جاؤ۔ (ھود : ۴۸)

یَا اِبْرَاھِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا : اے ابراہیم تُونے خواب کو سچ کر دکھایا۔ (صافات : ۱۰۵)

یَا مُوْسٰی اِنِّی اصْطَفَیْتُکَ : اے موسیٰ میں نے تجھے منتخب کر لیا ہے۔ (اعراف : ۱۴۴)

اس لحاظ سے جس طرح حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ وغیرہ ایک متعیّن شخصیت ہیں، اسی طرح حضرت آدمؑ بھی ایک متعیّن شخصیت ہیں، اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اب اگر حضرت آدمؑ کی شخصیت کو مشتبہ قرار دے کر آپ کے وجود کا انکار کیا جا سکتا ہے، تو پھر کل حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کی شخصیتوں کا بھی اسی طرح انکار کیا جا سکتا ہے۔

قرآنِ مجید چونکہ مختلف قسم کے دلائل و براہین سے بھرپور ایک علمی صحیفہ ہے اس لئے اُس کے حقائق و واقعات کا انکار اس قدر آسان نہیں ہے۔ بلکہ اگر کسی ایک حقیقت کا انکار، بدقت تمام کسی نہ کسی طرح، کر بھی دیا جائے تو دس نئی حقیقتیں اس طرح سامنے آجاتی ہیں، جو کہ اس انحرافی رجحان کی صاف صاف تردید کرنے والی ہوتی ہیں، اور جن کا جواب انحراف کرنے والوں سے بن نہیں پڑسکتا چنانچہ دیکھئے ایک دوسرے موقع پر قرآنِ مجید نے حضرت آدم علیہ السلام کے "محبوبِ الٰہی" یا برگزیدہ بندے (نبی) ہونے پر کس طرح روشنی ڈالی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرَاھِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرَانَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ :

اللہ نے یقیناً آدم، نوح، اولادِ ابراہیم اور اولادِ عمران کو تمام جہان کے لوگوں میں منتخب فرمایا ہے۔ (آل عمران: ۳۳)

کیا اس موقع پر حضرت آدمؑ کی متعیّن شخصیت ہونے کا انکار کیا جا سکتا ہے یا اس کی کوئی تاویل ہو سکتی ہے؟ ذرا سوچیے تو سہی حضرت آدم کا تذکرہ اس موقع پر ان جلیل القدر ہستیوں کے سیاق میں آیا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے سارے جہاں سے منتخب کر کے انہیں فضیلت اور بزرگی عطا کی تھی۔ اس لحاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم کی شخصیت کوئی معمولی شخصیت نہیں تھی بلکہ اللہ کے نزدیک آپ کی انتہائی عظمت و اہمیت تھی۔

تمثیل اور واقعہ کا فرق

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی مثال یا تمثیل بیان کرنا ہوتا ہے تو کسی متعین فرد کا نام نہیں لیا جاتا، بلکہ اس کو ایک عمومی کلیہ کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ جیسے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۔ سَاۗءَ مَثَلَاۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ : اور تو انہیں اُس شخص کا حال[۱] سُنا دے جسے ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں، پھر وہ ان سے بالکل ہی نکل گیا تو شیطان اُس کے پیچھے لگ گیا، لہٰذا وہ گمراہوں میں داخل ہوگیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کی بدولت اُس کا مرتبہ بلند کر دیتے، لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہوگیا اور اپنے نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے لگا۔ اس طرح اُس کی مثال کُتّے کی سی ہوگئی کہ اگر تو اُس پر کچھ بوجھ رکھے گا تب بھی وہ ہانپے گا یا اُس کو چھوڑ دے گا تب بھی وہ (برابر) ہانپتا رہے گا۔ یہ مثال ہے اُن لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، لہٰذا تو یہ حالات بیان کر دے تاکہ وہ کچھ بچار کر سکیں۔ اُن لوگوں کی مثال (بہت) بُری ہے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ (اعراف: ۱۷۵ - ۱۷۷)

ان آیات کی تفسیر میں اگرچہ بعض مفسّرین نے بنی اسرائیل کے ایک شخص بلعم بن باعور کا قصہ بیان کیا ہے، جو بڑا عالم و زاہد ہونے کے باوجود محض دنیا کی محبّت اور بیوی کے فریب میں آکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف بددُعا کی تھی جس کی پاداش میں اُس کی ساری دینداری چھن گئی اور لعنتی بن گیا۔ مگر یہ مثال ہر اُس شخص پر صادق آسکتی ہے جو دنیوی مقاصد کے لئے دنیاداروں سے

---

[۱] اس موقع پر "نبأ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی خبر کے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی متعین شخص کا واقعہ تھا۔ مگر چونکہ قرآن حکیم نے اس کا نام نہیں بتایا، اس لئے یہ مثال ہر شخص پر صادق آسکتی ہے۔

سازباز کر کے یا ان کے فریب میں آکر دینی تقاضوں کے خلاف کام کرتے ہوں۔ گویا کہ وہ اس طرح آیاتِ الٰہی کو جھٹلانے کے مرتکب ہوں گے، جیسا کہ اس موقع پر " ذٰلِكَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا " کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔ اور پھر مزید تاکید کے طور پر بعد والی آیت میں بھی اسی بات کو دُہرایا گیا ہے۔

یہ مثال درحقیقت ان مسلمانوں کے لئے ایک تازیانۂ عبرت ہے جو قرآن پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود کسی بھی دنیوی غرض و غایت کے لئے باطل پرستوں کے دامِ تزویر میں آکر یا باطل فلسفوں کے پروپگنڈوں سے متاثر ہو کر آیاتِ الٰہی سے صاف "نکل بھاگنے" کی کوشش کرتے ہیں۔ تو ایسے ہی لوگوں پر یہ مثال پوری طرح صادق آتی ہے۔ گویا کہ وہ ایک عبث کام کر رہے ہیں۔ اور اس قسم کا عبث کام کرنے والوں کی مثال ایک دوسرے موقع پر اُس عورت کے مانند قرار دی گئی ہے جو محنت و مشقّت سے سُوت کاتنے کے بعد، جب کہ وہ کپڑا بُننے کے لائق بن جاتا ہے، اُس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا : اور تم اس عورت کی طرح مت بن جانا، جس نے اپنے محنت سے کاتے ہوئے سوت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئیے۔ (نحل: ۹۲)

غرض اسی طرح کسی شخص کا نام لئے بغیر سورۂ کہف میں دو افراد کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے، جن میں سے ایک خُداپرست اور دوسرا مُنکرِ خُدا تھا۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ ...... اور انہیں دو شخصوں کی مثال سنا دو، جن میں سے ایک کے لئے ہم نے دو باغ تیار کر دئیے تھے۔ (کہف: ۳۲)

اس طرح کی بہت سی مثالیں ناموں کے تعیّن کے بغیر قرآن میں مذکور ہیں۔ اور انہی میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی خائن عورتوں کی مثال بھی بغیر ناموں کی تصریح کے مذکور ہے۔ جس طرح کہ فرعون کی مؤمن بیوی کی مثال بھی نام کی صراحت کے بغیر مذکور ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ....

اللہ نے کافروں کے لئے نوح کی عورت اور لوط کی عورت کی ایک مثال بیان کی ہے۔ (تحریم: ۱۰)

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ : اور اللہ نے ایمان والوں کے لئے فرعون کی بیوی کی مثال بیان کی ہے۔ (تحریم: ۱۱)

ان دونوں آیتوں میں اگرچہ شخصیتیں بالکل متعین ہیں، مگر ناموں کی تصریح کے بغیر محض اُن کی بدسیرتی یا نیک سیرتی کو بطور عبرت و مثال بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ صحابۂ کرام اور اُمّتِ محمدیہ کی سیرت و کردار کی خصوصیات پر بطورِ تمثیل تورات و انجیل میں اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ : ...... یہ اُن کی مثال ہے تورات میں اور اُن کی مثال ہے انجیل میں۔ (فتح: ۲۹)

اس قسم کی مثالیں بیان کرنے کا مقصد کیا ہے؟ تو سورۂ روم میں اس قسم کی ایک مثال بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ : اسی طرح ہم سمجھ داروں کے لئے آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں۔ (روم: ۲۸)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ : اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر قسم کی مثال بیان کر دی ہے تاکہ وہ سبق حاصل کر سکیں۔ (زمر: ۲۷)

اب دیکھئے اس کے برعکس انبیائے کرام کے واقعات کو مثال یا تمثیل کے روپ میں پیش نہیں کیا گیا۔ چنانچہ قرآن میں کسی نبی کا کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے جس کو محض تمثیلی یا غیر واقعی انداز میں بیان کیا گیا ہو۔ ہاں البتہ ایک موقع پر حضرت عیسیٰؑ کی انوکھی پیدائش کے سلسلے میں لفظ "مَثَل" کے ذریعہ حضرت آدم علیہ السلام کی انوکھی تخلیق سے تشبیہہ ضرور دی گئی ہے۔ مگر یہ تشبیہہ ان دونوں کی انوکھی تخلیق سے متعلق ہونے کی بنا پر ان دونوں کی شخصیتوں پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا، بلکہ اس تشبیہہ کی وجہ سے درحقیقت ان دونوں کی شخصیتیں مزید مُسلّم اور ناقابلِ تردید بن جاتی ہیں۔ اس کی

مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

حضرت آدم اور صحفِ سماوی

واقعہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نہ صرف اولین بشر تھے، بلکہ ایک نبی اور جلیل القدر پیغمبر بھی تھے۔ لہٰذا آپ کی شان میں اس قسم کی گستاخی نہ صرف سُوئے ادب ہے، بلکہ باعثِ خطرۂ ایمان بھی ہے۔ چنانچہ حضرت آدم کی نبوّت و رسالت نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر سے مسلّم ہے، بلکہ اہلِ کتاب کے نزدیک کم از کم آپ کے اوّلین بشر ہونے کی حیثیت مُسلّم ہے، جیساکہ تورات و انجیل (موجودہ بائبل) کے متعدّد بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر دورِ رسالت میں جب نجرانی عیسائیوں سے حضرت عیسیٰ کی شخصیت کے بارے میں مباحثہ و مناظرہ ہُوا تو عیسائیوں نے آپ کی خارقِ عادت پیدائش کے ذریعہ آپ کی اُلوہیت پر استدلال کیا۔ لہٰذا اُنہیں یہ مُسکت جواب دیا گیا کہ اس خارقِ عادت یا فوق الطبیعی پیدائش کے معاملے میں تو حضرت عیسیٰ حضرت آدم جیسے ہیں:

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ آدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنَ : عیسیٰ کی (پیدائش) کی مثال اللہ کے نزدیک یقیناً آدم جیسی ہے، (جس طرح کہ) اُس نے آدم کو مٹی سے بنایا۔ پھر اُس سے کہا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا۔ (آل عمران : ۵۹)

یہاں پر قابلِ غور بات یہ ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک اگر حضرت آدم کی شخصیت مشتبہ ہوتی، یا اُن کے اولین بشر ہونے کی حیثیت سے مسلّم نہ ہوتی تو پھر وہ اس جواب سے کبھی مبہوت و ششدر نہ ہو جاتے، بلکہ اس کو ناقابلِ اعتبار قرار دے کر مسترد کر دیتے۔ لہٰذا معلوم ہُوا کہ مذاہبِ عالم میں دورِ قدیم سے حضرت آدم کی شخصیت مسلّم تھی اور وہ کبھی متنازعہ فیہ نہیں رہی اور یہ سب صحفِ سماوی کی تعلیمات کا نتیجہ تھا۔ اگر اس واقعہ میں صداقت نہ ہوتی تو وہ صحفِ سماوی کا مشترکہ جزو نہ بن سکتا۔ اگرچہ بائبل میں حضرت آدم کے کردار کو مسخ کرنے والے بعض واقعات بھی موجود ہیں، جو بائبل کی تحریفات کا نتیجہ ہیں، (اس موضوع پر تفصیلی بحث پھر کبھی کی جائے گی اور مستشرقین نیز عیسائی فاضلوں کی افترا پردازیوں کا معقول جواب دیا جائے گا) مگر جہاں تک آپ کی مُسلّمہ شخصیت کا سوال ہے، تو

اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔

جس طرح اس آیت میں عیسائیوں کا ردّ ہے، اسی طرح اس میں ارتقائیوں ... (evolutionists) کا بھی بھرپور ردّ و ابطال ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حضرت آدمؑ کا ظہور کسی نچلی نوع (species) سے ارتقائی طور پر ہوا ہوتا تو پھر اس وجہِ استدلال کی گنجائش نہ ہوتی۔ ان دونوں میں مناسبت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی تخلیق بِن باپ کے صرف حضرت مریم علیہا السلام کے ذریعہ عمل میں آئی تھی۔ جبکہ حضرت آدمؑ کی تخلیق بغیر ماں باپ کے محض ایک خدائی معجزے کے طور پر ظاہر ہوئی تھی۔ ورنہ یہ استدلال کسی بھی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ حاصلِ بحث یہ نکلا کہ یہ "مثلیت" آدم کی شخصیت میں نہیں بلکہ اُن کی نوعیتِ تخلیق میں ہے۔ لہٰذا آدم کی شخصیت بالکل مُسلّم ہے۔

آدم ایک تاریخی شخصیت

بہرحال قصۂ آدم کو محض ایک تمثیلی واقعہ یا افسانہ کہہ کر اس کی قطعیت کو متاثر نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس قسم کی حرکت قرآنِ عظیم اور اُس کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ یہ ایک بے سروپا خیال ہے، جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم نے آدم و ابلیس کے واقعہ کو محض ایک ہی جگہ بیان کر دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ متعدد مقامات پر اس کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ اور حضرت آدمؑ کا نامِ نامی قرآن میں پچیس مرتبہ آیا ہے۔ متعدد آیات میں پوری نوعِ انسانی کو "بنی آدم" (آدم کی اولاد) کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ ایک موقع پر آدم کے دو بیٹوں (اِبْنَیْ آدَم) کا تذکرہ آیا ہے۔ قرآن کے ان تمام واقعات و تصورات کی شرح حدیثِ شریف میں پورے بسط و تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اور یہ روایات مجموعی اعتبار سے حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔ ان پر تفصیلی بحث اس کتاب کے آخری باب میں کی گئی ہے۔ لہٰذا ان تمام محکمات اور روایاتِ متواترہ کا انکار کر کے محض چند متشابہات سے استدلال کرنا ایک مکابرہ ہے، جو چاند پر خاک ڈالنے کے مترادف ہے۔ اور اس قسم کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

تخلیقِ آدم کائنات کا ایک اہم ترین واقعہ

حاصل یہ کہ قصۂ آدم محض ایک داستان یا افسانہ نہیں بلکہ تاریخِ تخلیق و تاریخِ انسانیت کا

ایک عظیم ترین واقعہ ہے، جو حق و صداقت پر مبنی ہے۔ بلکہ یہ درحقیقت تخلیقاتِ الٰہیہ کی ایک ایمان افروز داستان ہے، جو تذکیر و انتباہ کے اچھوتے پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ انسان چونکہ اس چمن زارِ حیات کا حاصل اور کائناتِ مادّی کا گُلِ سرسبد ہے، جو تخلیقاتِ الٰہیہ میں بے انتہاء اہمیت رکھتا ہے، اس لئے اس واقعہ کو ایک ولولہ انگیز اُسلوب میں بیان کیا گیا ہے، تاکہ نوعِ انسانی میں جذباتِ انسانیت و آدمیت پوری طرح اُبھالے جاسکیں اور اُن کے دلوں میں ایمان کے بیج بوئے جاسکیں۔

اس لحاظ سے قصّۂ آدم محض ایک قصّہ نہیں بلکہ وہ اسباق و بصائر کا ایک لامتناہی مجموعہ ہے، جس کے رموز و اسرار کی انتہا نہیں ہے۔ یہ درحقیقت خیر و شر کی ایک عجیب و غریب داستان ہے، جہاں سے دین و شریعت کی ابتدا ہوتی ہے۔ بعض لوگوں (مادّہ پرستوں) کا خیال ہے کہ انسان کی ابتدا جہالت کے ماحول سے ہُوئی اور خُدا کا تصوّر بعد میں پیدا ہُوا۔ مگر اس کے برعکس قصّۂ آدم سے نہ صرف اس خیالِ خام کی تردید ہوتی ہے، بلکہ دین و شریعت کے عجیب و غریب اسرار بھی کُھلتے نظر آتے ہیں۔ اور خصوصاً عقائد و ایمانیات کی بعض وہ گرہیں، جن کو کھولنے سے دورِ قدیم سے لے کر اب تک تمام فلاسفہ اور فلسفہ زدہ علماء عاجز نظر آتے ہیں، پوری طرح کُھلتی دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح اس واقعہ سے "شریعتِ آدم" کے بعض وہ احکام بھی منظرِ عام پر آتے ہیں، جن پر آج شریعتِ اسلامیہ میں عمل ہو رہا ہے۔

ان تمام اُمور و مسائل پر تفصیلی بحث — جو تجدیدِ ایمان کی ایک عجیب و غریب داستان ہے — راقم سطور نے مکمل کرلی ہے، جو انشاء اللہ آپ کی خدمت میں سلسلہ وار (متعدد کتابوں کی شکل میں) پیش کی جائے گی۔ یہ داستان عصرِ حاضر کے لئے ایک ولولہ انگیز پیامِ عمل اور صورتِ سرمدی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی بنا پر سورۂ ص میں جہاں پر آدم و ابلیس کا واقعہ بالتفصیل مذکور ہے وہاں پر بطور پیشین گوئی یہ بھی مذکور ہے:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ : یہ تو سارے جہان کے لئے

ایک درس ہے۔ اور تم اس کی (سچائی کی) خبر ضرور جان لوگے۔ (ص: ۸۷-۸۸)

قرآنِ حکیم اگرچہ ہر حیثیت سے نوعِ انسانی کے لئے ایک ذکر و تذکرہ اور تنبیہہ و انتباہ ہے۔ مگر یہاں پر خصوصیت کے ساتھ حضرت آدم علیہ السّلام کے واقعہ کے بعد اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے۔ لہٰذا جب ہم اس عظیم واقعہ کا قرآنِ حکیم اور حدیثِ نبوی میں مذکور حقائق کے ذریعہ بائبل اور اہلِ کتاب کے تصوّرات، اور خصوصاً عیسائیوں کے خود ساختہ عقائد (عقیدۂ موروثی گنہگاری اور عقیدۂ فدیہ وغیرہ) اور مُلحد فلاسفہ اور مادّہ پرستوں کے باطل افکار وغیرہ تمام چیزوں کا جب جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں، تو ہمارے سامنے عجیب و غریب حقائق آتے ہیں، جن کے ذریعہ نہ صرف اہلِ مذاہب کی باطل پرستیوں کا پردہ چاک ہو جاتا ہے، بلکہ الحاد و مادّیت کے تار پود بھی بکھر جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تخلیقِ آدم تاریخ تخلیقات کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے، جس کو خلاّقِ فطرت نے بڑے اہتمام اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ ایک ناقابلِ فراموش صداقت کے رُوپ میں بیان کیا ہے، جس میں اتنے اسباق و بصائر و دیعت کر دئے گئے ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا مُشکل نظر آتا ہے۔

پانچواں باب

آدم کی تخلیقِ خصوصی

پچھلے ابواب کے تمام مباحث سے بخوبی ثابت ہو گیا کہ نظریۂ ارتقا عقلی و شرعی دونوں حیثیتوں سے ایک بے بنیاد قیاس و مفروضہ ہے، جو سائنٹفک دلائل پر مبنی نہیں بلکہ الحاد و مادیت کے رجحانات کا آئنہ دار اور مغالطوں کا مجموعہ ہے۔ اور آج اس نظریہ کو مذہب کی ضد میں ایک اچھے خاصے عقیدے کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ لہٰذا ایسے الحاد پرور نظریہ کی تائید قرآنِ حکیم کس طرح کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک صریح تناقض ہے۔ اور جن لوگوں نے قرآنِ حکیم سے نظریۂ ارتقا کی تائید نکالنے کی کوشش کی ہے، اُنھوں نے نہ تو قرآن میں غور کیا ہے اور نہ ہی اس باطل عقیدے کے مضمرات کو سمجھنے ہی کی زحمت گوارا کی ہے۔ وہ اس نظریہ و عقیدے کی تائید محض اس لئے کرنے بیٹھ گئے تاکہ نام نہاد اہلِ علم کی مخالفت نہ ہو۔ لہٰذا آئیے اب دیکھیں کہ قرآنِ حکیم اس سلسلے میں کیا کہتا ہے اور آدم کے بارے میں اس کا صحیح عقیدہ کیا ہے؟

چنانچہ قرآنِ حکیم میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ بہت سے مقامات پر حضرت آدم علیہ السلام کا تذکرہ اس حیثیت سے آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے زمین میں ایک خلیفہ بنانے اور مٹی سے ایک فردِ بشر بنانے کا ذکر کیا ہے۔ پھر حضرت آدم کو پیدا کر کے فرشتوں کے ذریعہ آپ کو سجدہ کرایا

اور آپ کا درجہ و مرتبہ بڑھایا۔

تفسیر بالرائے کی حرمت

یہ تذکرہ متعدّد مرتبہ اتنے صاف اور واضح الفاظ میں مذکور ہے کہ اس کو نہ تو تمثیل یا افسانہ کہا جا سکتا ہے اور نہ اس حقیقت واقعہ کا انکار کیا جا سکتا ہے کہ آدم ایک متعیّن فرد کا نام تھا جو ابوالبشر تھے۔ اگر اس حقیقت کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآنِ مجید کا کوئی بھی بیان قطعی ویقینی نہیں ہے۔ بلکہ پورا قرآن مشکوک و مُشتبہ قرار پائے گا کہ جس کا جی چاہے اس کے کسی بھی بیان اور کسی بھی "نصِّ قطعی" کو ایک تمثیل کہہ کر رد کر دے۔ اور اس طرح قرآنِ مجید کے تمام مُحکمات (واضح اور مفصّل بیانات) مُتشابہات (غیر واضح اور مُبہم بیانات) بن کر رہ جائیں گے۔ اور اس طرح قرآن ایک مُعمّہ اور چیستان بن جائے گا۔ اسی وجہ سے حدیث شریف میں محض اپنی رائے سے (صحیح اصول اور شرعی دلائل سے ہٹ کر) قرآن کی تفسیر کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے:

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهٖ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ: جو شخص قرآن میں (مجرد) اپنی رائے سے کوئی بات کہے تو اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔[1]

آدم کے ظہور میں منصوبہ بندی

قرآنِ حکیم کے وہ تمام بیانات جو حضرت آدم علیہ السّلام کی تخلیق سے متعلق اس کتابِ حکمت میں مذکور ہیں، ان کے ملاحظہ سے نظر آئے گا کہ وہ اپنے معانی و مطالب میں اس قدر صاف و صریح ہیں کہ ان میں کسی قسم کی تاویل ممکن نہیں ہو سکتی۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً: اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ ضرور بنانے والا ہوں۔ (بقرہ: ۳۰)

اس آیتِ کریمہ میں لفظ خلیفہ واحد کا صیغہ ہے، جس کا مطلب ہے: ایک خلیفہ یا ایک جانشین۔ کیونکہ نحوی اعتبار سے یہ لفظ یہاں پر "نکرہ" واقع ہو رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس موقع

---

[1] جامع ترمذی، أبواب التفسیر: ۲۶۸/۴، مطبوعہ بیروت۔

پر فرشتوں سے زمین میں ایک خلیفہ بنانے کا ارادہ ظاہر کر رہا ہے، اور اس کو تاکیدی طور پر بیان فرما رہا ہے کہ "مَیں ضرور ایسا کرنے والا ہُوں"۔ جیساکہ یہاں پر "اِنِّی جَاعِلٌ" کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں۔ یعنی ایک تو اس میں لفظ "اِنَّ" کے ذریعہ تاکید پیدا ہو گئی ہے، اور دوسرے "جَاعِلٌ" "اسمِ فاعل" کا صیغہ ہونے کی بنا پر اس کے معنی میں "اَجْعَلُ" سے زیادہ زور پیدا ہو گیا ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ پوری منصوبہ بندی اور منظم تدبیر (planning) کے تحت ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہ رواروی میں کوئی بات ہو رہی ہو۔ اس حقیقت کا اظہار دیگر مواقع پر ایک عمومی اُصول کے رُوپ میں کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بھی فعل بغیر منصوبے یا تدبیر کے ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ جیساکہ ارشادِ باری ہے :

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيراً : اور اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کے لئے ایک اندازہ (منصوبہ) بنایا۔ (فرقان : ۲)

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ : بلاشبہ ہم نے ہر چیز ایک متعیّن اندازے سے پیدا کی ہے۔ (قمر : ۴۹)

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْراً : اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ (پہلے ہی سے) بنا دیا ہے۔ (طلاق : ۳)

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ : اور اُس کے نزدیک ہر چیز ایک متعیّن مقدار کے ساتھ ہے۔ (رعد : ۸)

قدر اور تقدیر ہم معنی الفاظ ہیں، جو مظاہرِ کائنات کی تخلیق و آفرینش، اُن کی تنظیم و نگرانی اور اُن کی ہدایت و رہنمائی وغیرہ ہر چیز سے متعلق ربانی منصوبہ بندی کی تعبیر کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ تمام مظاہرِ عالم اور کُل انواعِ حیات (biological species) کا خالق، رب، کارساز، ہادی اور نگرانِ اعلیٰ ہے۔

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ : اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا

ہے اور وہی ہر چیز کا کارساز ہے۔ (زمر: ۶۲)

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی (مخصوص) ساخت عطا کی۔ پھر اُس کی رہنمائی کی۔ (طٰہٰ: ۵۰)

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى۔ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی۔ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی: گُن گاؤ اپنے ربِّ برتر کے، جس نے (تمام مخلوقات کو) پیدا کیا اور (ہر ایک کا) جسمانی نظام ٹھیک ٹھاک کیا۔ وہی جس نے (تمام مظاہر کے لئے ایک طبیعی) ضابطہ بنایا اور (ہر ایک کو اُس ضابطے کے مُطابق چلنے کی) توفیق بخشی۔ (اعلیٰ: ۱-۳)

غرض آیت زیرِ بحث میں جو الفاظ و معانی مذکور ہیں، اُن کی رُو سے پہلی ہی نظر میں نظریۂ ارتقا کا ردّ و ابطال ہو جاتا ہے۔ یہ آیتِ کریمہ تخلیقِ آدم اور اُس کی خلافت کے سلسلے میں بنیادی نصّ ہے، جو خُدائی منصوبہ بندی کو ظاہر و نمایاں کر رہی ہے۔ اور اس سلسلے میں دیگر جتنی بھی آیات قرآنِ حکیم کے مختلف مقامات میں مذکور ہیں وہ سب کی سب اس اجمال کی شرح و تفسیر ہیں۔

انسان اور تحت الانسان

غرض اس موقع پر "ایک خلیفہ" بنانے کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اور اس کے ذریعہ نظریۂ ارتقا اور اُس کے قائلین و مؤیّدین کی تردید ہو رہی ہے۔ کیونکہ نظریۂ ارتقا کی رُو سے یہ ناممکن ہے کہ ہزاروں لاکھوں انواعِ حیات مل کر ارتقائی طور پر صرف ایک فردِ واحد ہی کو جنم دیں۔ جب کہ اس نظریہ کی رُو سے بہت سے افراد کا بیک وقت جنم لینا ممکن تصوّر کیا جاتا ہے، اور یہ بات واقعتاً بھی بہت ضروری ہے۔ پھر ارتقا پسند لوگ (evolutionists) اس بات کے بھی قائل ہیں کہ انسان ابتدا ہی میں مکمل طور پر انسانی شکل میں ظاہر نہیں ہُوا۔ بلکہ موجودہ انسان سے قبل انسانی شکل و صورت کے بہت سے "نامکمل انسان" بھی ظاہر ہو چکے ہیں، جن کو "تحت الانسان" یا "اُحفوری انسان" (fossil man) وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اور قیاس کیا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض ابتدائی انواع گونگے، جنگلی اور غیر مہذّب بھی رہے ہیں۔ جب کہ عقل و شعور اور ذہانت وغیرہ بتدریج ظاہر

ہوسکے ہیں اور اس کے لئے لاکھوں سال کا عرصہ لگا ہے ۔ اور اس کے ثبوت میں اُن اُحفوری آثار (fossil remains) کو پیش کیا جاتا ہے جو زمین کی کھُدائی سے گزشتہ صدی سے برآمد ہونے لگے ہیں۔ چنانچہ دوسرے باب میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی جا چکی ہے اور مادہ پرستوں کے شُبہات کا جواب دیتے ہُوئے ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس سے نظریۂ ارتقا کی تائید نہیں بلکہ اس کی تردید اور اسلامی عقائد کا اثبات ہوتا ہے۔

غرض اس ظن و قیاس کی بنا پر وہ لوگ، جو اس نظریہ سے متاثر ہو کر اس کو قرآن کے مطابق ثابت کرنا چاہتے تھے، جب اُنھوں نے دیکھا کہ ایسی صورت میں کسی ایک متعیّن فرد کو "آدم" قرار دینا مشکل ہے تو جھٹ سے کہہ دیا کہ آدم نہ تو کوئی تاریخی شخصیت ہے اور نہ ایسا کوئی فرد نوعِ انسانی کے اولین نمائندے کی حیثیت سے ظاہر ہُوا ہے۔ اور قرآن میں جس آدم کا ذکر ہُوا ہے وہ محض نوعِ انسانی کا ایک تمثیلی نمائندہ تھا اور بس ۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ کو اس مفہوم کے اظہار کے لئے صحیح الفاظ بھی نہیں مل سکے ۔ بلکہ اُس نے اپنے پیروؤں کو اُلجھن میں ڈالنے کے لئے خواہ مخواہ ایک متعیّن شخص کا نام لے لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ خُدا اور اُس کی کتاب پر ایک بہتان ہے، جو اس کلامِ پاک کی تکذیب کے برابر ہے ۔

نوعِ انسانی کا ظہور ایک فردِ واحد سے

قرآنِ مجید نہایت واضح انداز میں کہتا ہے کہ نوعِ انسانی کا ظہور ایک فردِ واحد سے ہُوا ہے، نہ کہ بہت سے افراد سے ۔ اور یہ قرآن کی ایک "نصِّ قطعی" (واضح بیان) ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے "ایک ہستی" یا "واحد نفس" کو پیدا کیا، پھر اُس سے اُس کی زوجہ کی تخلیق کی، پھر ان دونوں سے تمام انسانوں کو پیدا کیا۔

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً : اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے مرد اور عورتیں پھیلائے ۔ (نساء : ۱)

یہ بیان کسی بھی حیثیت سے نظریۂ ارتقا پر صادق نہیں آتا، بلکہ صاف صاف اس کی تردید کرتا ہے۔ "نفسِ واحدہ" سے مراد ظاہر ہے کہ ایک فردِ واحد ہے۔ اور یہ بیان امیبا (amoeba) یا ابتدائی جرثومۂ حیات پر کسی طرح صادق نہیں آسکتا، جیساکہ بعض لوگوں نے اس قسم کی تاویل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس قسم کے لوگوں نے نہ صرف قرآن سے بلکہ خود سائنسی حقائق سے بھی اپنی جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ کیونکہ قرآنِ حکیم تو یہ کہہ رہا ہے کہ جس نفسِ واحدہ سے باریٔ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کو چلایا ہے، اُسی سے اُس کے جنسِ مقابل (زوجہ) کو بھی پیدا کیا تھا۔ یعنی پہلے آدم کی تخلیق ہُوئی پھر حوا کی، جیساکہ دیگر نصوص سے پتہ چلتا ہے۔ یہ مفہوم امیبا اور دیگر یک خلوی (unicellular) جانداروں پر اس لئے منطبق نہیں ہوسکتا کیونکہ ان یک خلوی جانداروں میں "قانونِ زوجیت" نہیں پایا جاتا[۱] لہٰذا "خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا" اس صورت میں ایک معمّہ بن جاتا ہے۔ حیات کے ان ابتدائی نمونوں میں بڑھوتری کا جو قانون پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ یک خلوی جاندار بغیر کسی جنسی عمل کے خود بخود دو حصّوں میں بٹ جاتے ہیں۔ اور یہ قانونِ فطرت ہزاروں لاکھوں سال سے آج تک اسی طرح جاری ہے اور ان کی حالت میں اب تک کوئی "ترقی" نہیں ہُوئی ہے۔ اس لحاظ سے ان میں نہ کوئی نر ہے اور نہ مادہ۔ اسی لئے مختلف انواعِ حیات اور ان کے احوال و کوائف میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہُوئے فرمایا گیا ہے کہ ان سب مظاہر میں اہلِ دانش کے لئے نشانات و دلائل موجود ہیں۔

وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ: تمہاری خلقت اور (زمین پر) جانداروں کے پھیلاؤ میں یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں موجود ہیں۔ (جاثیہ: ۴)

انکارِ آدم باعثِ خطرۂ ایمان

قرآن مجید میں اس قسم کے بے شمار "سائنسی دلائل" مذکور ہیں، جن کے ذریعہ اس بے بنیاد نظریہ کا ردّ و ابطال ہوتا ہے۔ مگر اس قسم کے قرآنی دلائل یا معارف صرف اُسی وقت جلوہ افروز ہوسکتے

---

[۱] ملاحظہ ہو مشہور فرنچ محقق کی کتاب "مقدرِ انسانی" ص ۱۴۳، مطبوعہ کراچی۔

ہیں، جب کہ کھلے ذہن کے ساتھ جدید حقائق کی روشنی میں ان کا مطالعہ کیا جائے۔ اور راقم سطور اس قسم کے قرآنی معارف سائنسی حقائق کے رُوپ میں (جو نظریۂ ارتقا کے ردّ میں ہیں) ایک الگ تصنیف کے طور پر مرتب کر رہا ہے۔ جب کہ زیرِ نظر کتاب میں زیادہ تر شرعی نقطۂ نظر سے بحث کرنے اور آدم سے متعلق قرآن اور حدیث کے بیانات کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ سائنٹفک نقطۂ نظر سے بحث کرنے سے پہلے آدم کی شرعی حیثیت سامنے آجائے۔ اس اعتبار سے اس کتاب کو اس سلسلے کی اگلی کتابوں کا محض ایک مقدمہ سمجھنا چاہیئے۔

الغرض آدم سے متعلق قرآن اور حدیث میں مذکور تمام بیانات کو اگر اکٹھا کر دیا جائے تو "سیرتِ آدم" ایک مکمل شکل میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کوئی افسانوی یا دیومالائی نہیں بلکہ ایک تاریخی شخصیت کے حامل ہیں۔ اور آپ ابوالبشر ہونے کے علاوہ اللہ کے برگزیدہ بندے اور روئے زمین پر اولین نبی و رسول بھی تھے، جیسا کہ قرآن اور حدیث دونوں اس سلسلے میں ناطق ہیں۔ لہٰذا آپ کی شخصیت کا انکار نہ صرف ایک جلیل القدر پیغمبر کا انکار ہے بلکہ درحقیقت قرآن اور حدیث کا بھی انکار ہے، جس کی وجہ سے ہمارا ایمان خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ آدم کی شخصیت کا انکار کرنے والوں کے نزدیک کلام الٰہی (جس میں جھوٹ یا خلافِ واقعہ بات کا گزر نہیں ہو سکتا) کی بہ نسبت چند الحاد پرور لوگوں کے نظریات کی زیادہ اہمیت ہے۔ اس سے بڑھ کر محرومی اور بدنصیبی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور اس وقت میرا روئے سخن اسلام کے نام لیواؤں سے ہے، جو اپنے کسی بھی معاملے میں قرآن اور حدیث کو سند مانتے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قرآن اور حدیث ہی ہمارے لئے اولین ماخذ علم کی حیثیت رکھتے ہیں، جو نہ صرف ہماری شرعی اور معاشرتی زندگی میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں، بلکہ ہمارے فکری و نظریاتی اُمور و مسائل میں بھی ہماری بھرپور مدد اور رہبری کر سکتے ہیں۔ اسی لئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا، كِتَابُ اللهِ وَسُنَّةُ نَبِيِّهِ : میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم انہیں تھامے رہو گے، ہرگز

گمراہ نہ ہوگے، ایک کتاب اللہ اور دوسرے اس کی نبی کی سُنّت ہے[۳]

حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور حدیث ہمارے لئے صحیح ترین میزان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور دُنیا کے ہر نظریہ اور ہر فکر کو اس میزان میں تول کر کھرے اور کھوٹے کو الگ الگ کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کو سمجھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اُس کی قطعیت پر یقین رکھتے ہُوئے اُس کے ابدی نصوص میں غور کیا جائے۔ پھر ان کی روشنی میں تمام انسانی افکار و نظریات کی جانچ کی جائے، اور جو حقیقت بغیر کسی تاویل کے اُس کے قطعی نصوص سے ثابت ہو جائے اس کو اختیار کیا جائے، جو درحقیقت اُس کے معارف میں شمار کرنے کے قابل ہوگی اور جو چیز اُس کے نصوص سے ٹکراتی ہو، اُس کو ردّ کر دیا جائے۔ نہ کہ زبردستی اس کی مطابقت ظاہر کرنے کے لئے اُس کے نصوص کو من مانی معانی پہنانے کی کوشش کی جائے۔ ظاہر ہے کہ خُدائی علم قطعی و یقینی اور انسانی علم ظنّی و قیاسی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ نام نہاد نظریہ ابھی تک ظن و تخمین اور وہم و خیال کی دُنیا سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ لہٰذا اس کو قطعی قرار دے کر کلامِ الٰہی کو اُس کے تابع کر دینا ایک غلط موقف ہے، جس کی وجہ سے تشکیک و لادینیت کو تقویت پہنچتی ہے۔

بعض ناقابلِ تردید حقائق

بات چل رہی تھی مشیتِ الٰہی کے اس اظہار کی کہ "مَیں زمین میں ایک خلیفہ ضرور بنانے والا ہوں"۔ تو یہ بیان نظریۂ ارتقا پر کسی بھی حیثیت سے صادق نہیں آتا، بلکہ اس کے خلاف جاتا ہے۔ اور قرآن مجید کے دیگر مقامات میں اس بیان کی جو مزید شرح و تفصیل مذکور ہے، اُس کی رُو سے یہ مقدمہ اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ حجر میں فرمایا گیا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ: اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ مَیں بسے ہُوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہُوں۔ (حجر: ۲۸)

---

[۳] مؤطا امام مالک، ۹۳/۳، مطبوعہ مکہ مکرمہ۔

دیکھئے یہاں پر " اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً " کی تفسیر کس طرح "اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا " کے الفاظ سے کرتے ہوئے اس حقیقت پر مزید روشنی ڈالی جا رہی ہے کہ اس مجوزہ خلیفہ یا بشر کی تخلیق کس طرح عمل میں آئی !

بشر کا لفظ اگرچہ واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے، جیسا کہ خود قرآن مجید میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً جمع کے لئے فرمایا گیا :

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ : بلکہ تم اور مخلوقات کی طرح آدمی ہو۔ (مائدہ : ۱۸)

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ : اُن کے رسولوں نے اُن سے کہا کہ ہم تو تمہارے ہی جیسے آدمی ہیں۔ (ابراہیم : ۱۱)

اور واحد کے لئے کہا گیا ہے :

وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا : ان عورتوں نے کہا : سُبحان اللہ یہ شخص تو آدمی نہیں ہے۔ (یوسف : ۳۱)

فَقَالُوْا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ : اُنھوں نے کہا کہ کیا ہم اپنے ہی ایک آدمی کے کہنے پر چلیں گے ؟ (قمر : ۲۴)

لہٰذا اس اعتبار سے یہاں پر " اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا " میں فردِ واحد مُراد ہے۔ اور اس کی دلیل مابعد کی یہ آیت ہے :

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ : پھر جب مَیں اُسے ٹھیک بنا لوں اور اُس میں اپنی رُوح میں سے کچھ پھونک دُوں تو تم اُس کے آگے سجدے میں گر پڑو۔ (حجر : ۲۹)

دیکھئے یہاں پر " سَوَّيْتُهٗ " اور " نَفَخْتُ فِيْهِ " میں دونوں جگہ ضمیریں واحد مذکّر کی لائی گئی ہیں۔ لہٰذا یہ فردِ واحد کا تذکرہ ہو رہا ہے، نہ کہ کسی جماعت یا بہت سے افراد کا۔ یہی حقیقت سُورۂ ص میں بھی اس طرح دُہرائی گئی ہے :

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ۔ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ

فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِينَ : جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک انسان مٹی سے بنانے والا ہوں ۔ لہٰذا جب میں اُسے پُورے طور پر بنالوں اور اُس میں اپنی رُوح میں سے کچھ پھُونک دُوں تو تم اُس کے لئے سجدہ میں گر پڑنا ۔ (ص: ۷۱-۷۲)

اس موقع پر ایک سائنسی حقیقت کا اظہار کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو نظریۂ ارتقا کا مطالعہ کرنے والوں کے علم میں آئی ہے اور جس سے ایک رازِ ملکوتی یا معجزۂ ربوبیت پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے، بالفاظِ دیگر "رُوحِ خداوندی" کا جلوہ نمایاں ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ ماہرینِ حیاتیات "انواعِ حیات" اور اُن کے "تغیّرات" میں ۔ جن کو اُنھوں نے غلطی سے "ارتقا" کا نام دے دیا ہے ۔ جتنا بھی غور کرتے ہیں، اُن کی حیرتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ اور بجائے عُقدے کھُلنے کے اور زیادہ پیچیدہ ہونے لگتے ہیں ۔ چنانچہ اَدنا حیوانات میں "حیات کے کرشموں" کی توجیہہ ایک دشوار تر مسئلہ تو تھی ہی، مگر وہ انسانی مرحلے میں آ کر ایک دوہری مشکل کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔ وہ اس طرح کہ انسانی مرحلے میں اچانک اور ناگہانی طور پر "شعور وادراک" کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ "حیاتیاتی ارتقا" بالکل رک جاتا ہے ۔ اس طرح اب نوعِ انسانی میں جو عمل جاری ہے وہ حیاتیاتی نہیں بلکہ وہ شعوری اور تہذیبی ہے ۔ چنانچہ ایک ماہرِ حیاتیات اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہُوئے تحریر کرتا ہے کہ "انسانی مرحلے میں حیاتیاتی ارتقا رُک چکا ہے، اور اس کی جگہ اب شعور کی کارفرمائی نظر آ رہی ہے، جس نے غیر شعوری اور "بے معنی عمل" کی جگہ لے لی ہے ۔ مگر ایسا کیوں ہے ؟ یہ بات انسان کے علم میں نہیں آسکی ہے "۔

The 'Interiorization' of the evolutionary process at the stage of man, whereby conscious intelligence succeeded an apparently unconscious and "meaningless" process. In short, cultural evolution succeeded biological evolution, but how it did so remained obscure.[4]

ظاہر ہے کہ یہ ایک خُدائی عمل ہے، جو آدم میں "نفخِ روح" سے ظاہر ہُوا ہے ۔ اور جب تک ایک خُدائے برتر کا وجود تسلیم نہیں کیا جاتا اس قسم کے معمے کبھی حل نہیں ہو سکتے ۔ اس سے ایک اور نتیجہ یہ

۴ے دی انسائیکلوپیڈیا آف اِگنورنس، ص ۲۲۸، آکسفورڈ، ۱۹۷۸ء

بھی نکلتا ہے کہ حیات اور اُس کے مختلف مظاہر، مثلاً شعور وادراک وغیرہ، چونکہ ربانی صفات کے مظہر ہیں، اس لئے اِن کی مکمّل حقیقت سے انسان واقف نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس قسم کے مسائل میں مذہب کی تلقین جن الفاظ وکلمات کے ذریعہ کی جاتی ہے، ان کے ظاہری مفہوم پر ایمان لانا واجب ہوتا ہے۔ کیونکہ انسانی علم محدود ہے، جو مادّہ اور اُس کے اسرار ہی کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا، تو پھر وہ خالقِ کائنات اور اُس کی صفاتِ عالی کی حقیقت و ماہیت کا بھلا کیا خاک ادراک کرسکتا ہے!

نیز اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ نصِ قرآنی "اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ" (میں مٹی سے ایک آدمی ضرور بناؤں گا) کی رُو سے نظریۂ ارتقا کا صاف طور پر رد نکل رہا ہے۔ کیونکہ یہ بیان براہِ راست مٹی سے تخلیق پر دلالت کر رہا ہے، نہ کہ بالواسطہ طور پر۔ یعنی یہ بیان دیگر حیوانات یا کمتر انواع سے ارتقائی طور پر وجود میں آنے والی کسی مخلوق پر ہرگز صادق نہیں آسکتا۔ ورنہ اس موقع پر لفظ "طین" کے بجائے "دابّۃ" یا "دَوَابّ" وغیرہ قسم کا کوئی دوسرا لفظ ہوتا۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ فرشتوں سے مکالمے کے وقت ظہورِ آدم کے موقع کا ہے اور اُس وقت تمام انواعِ حیات (نباتات وحیوانات) ظہور پذیر ہوچکے تھے۔ جیسا کہ آیۂ کریمہ "وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا" (اور اُس نے آدم کو تمام چیزوں کے نام بتادیئے) سے صاف ظاہر ہورہا ہے۔ لہٰذا ایک ایسے موقع پر جب کہ ہر قسم کے نباتات وحیوانات کا ظہور عمل میں آچکا تھا، یہ کہنا کہ "مَیں مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں" کیا معنی رکھتا ہے؟ لہٰذا اس موقع پر براہِ راست مٹی سے پیدا کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی بھی مفہوم صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس کی مزید تفصیل اگلے باب میں آئے گی۔

آدم کا تذکرہ قرآن میں

اس اعتبار سے آدم وہ اولین بشر ہے جس کی تخلیق خصوصی طور پر ایک نشانِ رُبوبیت کی حیثیت سے عمل میں آئی۔ انسان اس تخلیقِ خصوصی کی صحیح کیفیت سمجھ نہیں سکتا۔ مگر وہ اس ذاتِ برتر کے وجود کا انکار بھی نہیں کرسکتا۔ جس کا وجود دو اور دو چار کی طرح بالکل سامنے کی بات ہے۔ قرآن اور کائنات کی اس تطبیق کی بنا پر ایک ایسی برتر ہستی کے وجود پر ایمان لانا اب ناگزیر ہوگیا ہے۔ اور اس اعتبار سے

خُدا کا وجود دَورِ جہالت کی نشانی یا فرسودگی کی علامت نہیں، بلکہ موجودہ علمی دور کی ایک اہم ترین حقیقت وضرورت ہے، جس کا انکار بہت بڑی محرومی کی بات ہے۔

غرض قصۂ آدم میں ہمارے لئے جو اسباق و بصائر ودیعت کر دئے گئے ہیں، ان میں سے ایک اولین سبق یہ ملتا ہے کہ یہ کائنات یُونہیں خود بخود نہیں بن گئی، بلکہ اس کا ایک خالق و مالک بھی ہے، جس نے اس بزمِ کائنات کو سجانے اور اُس کی رونق بڑھانے کے لئے آدم نامی ایک ہستی کو پیدا کیا، تاکہ اس کے ذریعہ ابتلا و آزمائش کا ایک نیا سلسلہ چلایا جائے۔ اور اس حقیقت واقعہ کو جُھٹلانے والی کوئی چیز اس کائناتِ مادّی میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ سارے آثار و قرائن یا طبیعی نشانات (natural signs) جن کو قرآن کی زبان میں "آیات اللہ" (اللہ کی نشانیاں) کہا گیا ہے، سب کی سب اس کی مسلسل تصدیق و تائید کرتی نظر آرہی ہیں تفصیل کے لئے تو ایک دفتر چاہیئے۔

غرض جس اولین فردِ بشر کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کے ذریعہ پیدا کیا، اُس کا نام نامی آدم تھا۔ چنانچہ آدمؑ کے نام کی تصریح کے ساتھ قرآن میں آپ کا تذکرہ حسبِ ذیل ۲۵ مقامات میں آیا ہے:

۱۔ سورۂ بقرہ : آیات ۳۱، ۳۳، ۳۴، ۳۵ اور ۳۷۔
۲۔ آل عمران : آیات ۳۳ اور ۵۹۔
۳۔ مائدہ : آیت ۲۷۔
۴۔ اعراف : آیات ۱۱، ۱۹، ۲۶، ۲۷، ۳۱، ۳۵ اور ۱۷۲۔
۵۔ اسراء : آیات ۶۱ اور ۷۰۔
۶۔ کہف : آیت ۵۰
۷۔ مریم : آیت ۵۸
۸۔ طٰہٰ : آیات ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۲۰ اور ۱۲۱۔
۹۔ یٰس : آیت ۶۰ ؎

؎ ان تمام آیات اور ان کی شرح میں وارد مختلف احادیث میں جو کچھ مذکور ہے ان سب کی تفصیل و تشریح بعض جدید حقائق و معارف کی روشنی میں "سیرتِ آدم" کے نام سے ایک علیحدہ کتاب زیرِ تصنیف ہے۔

ان تمام مقامات میں مختلف اندازوں سے آپ کا تذکرہ (جس میں آپ کی فوق الطبیعی پیدائش، فرشتوں سے مکالمہ اور مقابلہ آرائی میں آپ کی فضیلت کا اثبات، جنّت میں سکونت اور زمین پر ہبوط وغیرہ) صاف و صریح الفاظ میں کرنا اس بات کی روشن اور ناقابلِ تردید دلیل ہے کہ "آدم" کوئی فرضی یا افسانوی شخصیت نہیں بلکہ وہ ابوالبشر، ہمارے جدِ اعلیٰ اور اللہ کے برگزیدہ بندے و رسول تھے، جو تمام کتبِ سماویہ کی رُو سے ایک تاریخی شخصیت کے حامل ہیں۔ اور آپ کی شخصیت کے بارے میں قرآنِ حکیم کی رُو سے حسبِ ذیل اہم حقائق ثابت ہوتے ہیں:

۱۔ آپ کی تخلیق خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذاتی نگرانی میں کی ہے۔ اور یہ حضرت آدمؑ کا ذاتی شرف ہے۔

۲۔ آپ کو مختلف قسم کی مٹی سے گوندھ کر اور اُس پر مختلف مراحل گزار کر اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ مبارک سے پیدا کیا۔ جیسا کہ متعدد قرآنی آیات سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً:

قَالَ يَآ اِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ : فرمایا کہ اے ابلیس! اُس کو سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا، جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے؟ (ص: ۷۵)

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ .... پس جب میں اُس کو پورے طور پر بنالوں اور اُس میں اپنی رُوح میں سے کچھ پھونک دُوں .... (ص: ۷۲)

دیلمی کی ایک روایت کے مطابق حق تعالیٰ نے تین چیزوں کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے: قلم، آدم اور فردوس۔ اور بقیہ چیزوں کو کُن سے پیدا کیا۔[۹]

اس موقع پر یہ بات خوب سمجھ لینی چاہئے کہ یہ سب عالَمِ غیب کے واقعات ہیں، جن کی صحیح حقیقت و ماہیت صرف خداوندِ عالم ہی جانتا ہے۔ اور ایک مُسلمان کے ایمان کا صحیح تقاضا یہ ہے کہ وہ ان آیات کے ظاہری مفہوم پر یقین کرتے ہوئے اس کی کُنہ و حقیقت کو خدائے عز و جل کے سپرد کر دے۔ کیونکہ انسان کا علم بہت تھوڑا سا ہے، اور اس بنا پر وہ ہر چیز کی حقیقت و ماہیت کو صحیح طور پر سمجھ

---

[۹] کنز العمال: ۶۵/۶، مطبوعہ حیدر آباد۔

نہیں سکتا ۔ خود عالمِ طبیعی (nature) ہی کی بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن کے صحیح ادراک سے انسان عاجز و بے بس ہے، تو پھر وہ فوق الطبیعی عالم کے حقائق کا کس طرح احاطہ و ادراک کر سکتا ہے ؟

خداوندِ جلّ وعَلاَ کی ذات وصفات کی حقیقت کیا ہے ؟ یہ مسئلہ زمانۂ قدیم سے فلسفہ و کلام کا ایک عُقدۂ لاینحل بنا ہُوا ہے اور عقلِ انسانی اس کی عُقدہ کشائی میں عاجز و بے بس دکھائی دیتی ہے ۔ مگر بعض علماء نے فلسفہ سے متاثر ہو کر اس سلسلے میں جو بے معنی کلامی تاویلات کی ہیں وہ بالکل مردود ہیں، جن سے ذاتِ الٰہی ایک مُشتبہ چیز بن جاتی ہے ۔ لہٰذا ہمارے ایمان کی سلامتی اسی میں ہے کہ قرآن اور حدیث میں باریٔ تعالیٰ کے لئے جن جن صفات کا اظہار کیا گیا ہے، ان سب پر بغیر کسی تاویل کے ایمان رکھا جائے ۔ اور ان کی حقیقت سمجھنے کے پیچھے پڑ کر خواہ مخواہ اپنی توانائی ضائع نہ کی جائے ۔

۳ ۔ حضرت آدم علیہ السلام چونکہ اس خاکدانِ عالم کے گُلِ سَرسَبد تھے، جن کی خاطر بزمِ کائنات سجائی گئی تھی، اس لئے آپ کے شرف وفضیلت کے اظہار کی خاطر فرشتوں سے آپ کو سجدہ کروایا گیا، جس کا تذکرہ متعدد آیات میں صراحتاً مذکور ہے ۔

۴ ۔ خدائی منصوبے کے مطابق حضرت آدمؑ کو زمین کی خلافت سے نوازا گیا اور اُس کی ذمہ داریاں سونپی گئیں ۔

۵ ۔ خلافتِ ارض اور اُس کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لئے چونکہ موجوداتِ عالَم کا علم اور اُن کی معرفت ضروری تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی تخلیق کے فوری بعد آپ کو لَدُنّی طور پر اس علم سے مشرّف فرما دیا ۔ (وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا : اور اُس نے آدم کو تمام چیزوں کے نام بتا دئے) ۔ پھر ایک مقابلہ منعقد کر کے ایک امتحان کے ذریعہ فرشتوں پر آپ کی فضیلت ثابت کر دی ۔ گویا آپ اس عالمِ مظاہر کے دُولہا تھے ۔

۶ ۔ اس مقابلہ وامتحان کے موقع پر ابلیس بھی چونکہ فرشتوں کی صف میں شامل تھا اُس لئے وہ اس تعظیمی سجدے سے انکار کر کے ہمیشہ کے لئے مردود اور لعنتی بن گیا ۔

۷ ۔ پھر بطورِ اعزاز واکرام حضرت آدمؑ اور آپ کی زوجۂ محترمہ اُمّ البشر حضرت حوّا

(علیہما السلام) دونوں کو جنّت میں رکھا گیا۔ مگر انہیں حکم دیا گیا کہ وہ ایک خاص درخت کے قریب نہ جائیں۔

۸۔ مگر شیطان جو حضرت آدمؑ کی وجہ سے مردود و ملعون قرار پاکر حسد کی آگ میں جل رہا تھا، انہیں بہلا پھسلا کر اس شجرِ ممنوعہ کو چکھنے پر آمادہ کر ہی دیا۔

۹۔ معصیتِ الٰہی کے نتیجے میں آدم و حوا کا اعزاز چھن گیا اور دونوں بارگاہِ ربانی میں معتوب ہو گئے۔ مگر فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس کر کے بارگاہِ الٰہی میں رجوع ہوئے اور توبہ کی تو دونوں کا گناہ معاف کر دیا گیا۔

۱۰۔ چونکہ حضرت آدم کو خلیفہ بنا کر پیدا کیا گیا تھا، اور اس لحاظ سے آپ کا زمین پر پہنچنا ایک امرِ مقدّر تھا۔ (جنّت میں شجرِ ممنوعہ کو چکھنا تو محض ایک بہانہ تھا)۔ اس لئے منصوبے کے مطابق آپ کو زمین پر بھیجا گیا اور پھر آپ کو اپنی اولاد کے لئے نبی و رسول بھی بنایا گیا۔ نیز جتا دیا گیا کہ ایک مدت تک یہی زمین نوعِ انسانی کا "مستقر و متاع" رہے گی۔ اور اب اس کے بعد نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لئے وقتاً فوقتاً چند منتخب افراد (انبیاء) مبعوث کئے جاتے رہیں گے، جن کی اتباع نوعِ انسانی کو کرنی ہے اور شیطان کی اطاعت سے گریز کرنا ہے، جس کی وجہ سے آدم و حوا کو جنّت سے نکالا گیا، اور اب اُسی کی اتباع سے دوبارہ اولادِ آدم جنّت میں داخلے سے محروم رہے گی۔

۱۱۔ خُدائی منصوبے کے مطابق نوعِ بشری کے دو اولین نمائندوں کو جنّت کی ایک جھلک محض اس لئے دکھائی گئی تاکہ وہ اور اُن کی اولاد حیاتِ ارضی میں جنّت کو کوئی خیالی یا وہمی چیز، یا ایک "حسین وعدہ" تصوّر نہ کرلیں، بلکہ اس کو ایک حقیقت واقعہ سمجھ کر اس کے حصول کے لئے دل و جان سے جدوجہد کریں اور اپنے "وطنِ اصلی" کو کبھی فراموش نہ کریں، جو ہمارے والدین آدم و حوا (علیہما السلام) کی میراث ہے۔

بے دلیل و سند جھگڑنے والوں کا انجام

یہ تمام اُمور و مسائل اس قدر واضح اور مفصل انداز میں مذکور ہیں کہ ان پر نظریۂ ارتقا کا

اطلاق کسی بھی طرح نہیں ہوسکتا۔ قرآنِ حکیم کا ایک ایک لفظ اور اُس کا ایک ایک بیان صراحتاً اس غلط نظریہ کی نفی کر رہا ہے۔ اور ان دونوں میں تطبیق کسی بھی طرح نہیں ہوسکتی۔ ان واضح ارشادات کے ملاحظہ کے بعد بھی اس بات کی رٹ لگانا کہ قرآنِ حکیم نظریۂ ارتقا کی تردید نہیں بلکہ تائید کر رہا ہے، یا بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ قرآن کو تو اس نظریہ کی نفی یا اثبات سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے، حقیقت کا مُنہ چڑانا اور قرآنِ عظیم کے اصل منصب سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے :

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ : اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے معاملے میں بغیر علم (صحیح) اور ہدایت اور روشن کتاب کے جھگڑنے لگ جاتے ہیں۔ (لقمان : ۲۰)

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ : کہہ دو کہ کیا تمہارے پاس کوئی علم (معقول یا منقول) موجود ہے جس کو تم ہمارے سامنے پیش کرسکو؟ تم لوگ تو محض گمان کے پیچھے چلتے اور ٹامک ٹوئیاں مارا کرتے ہو۔ (انعام : ۱۵۹)

ان دونوں آیتوں میں ہر قسم کے معقول و منقول علوم و معارف کو پیش کرنے پر اُبھارا گیا ہے، جو خدا پرستی کو چیلنج کرنے والے ہوں، یا کلامِ الٰہی کا معارضہ کرنے والے ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ خُدا کی باتوں کو جھٹلانے والی کوئی چیز جس کو "علمی حقیقت" کہا جائے اس پوری کائنات میں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا "عِلمِ صحیح" کے میدان میں ناکامی کے باوجود خُدائی دلائل و بیّنات کو جھٹلانا بڑی ہی بدنصیبی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ : جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ ضرور ذلیل کیے جائیں گے، جس طرح ان سے پہلے کے لوگوں کو ذلیل کیا گیا، حالانکہ ہم نے تو واضح آیتیں اُتار دی ہیں اور انکار کرنے والوں کے لئے ذلّت کا عذاب ہے۔ (مجادلہ : ۵)

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا : اور جو کوئی صحیح راستہ واضح ہوجانے کے بعد بھی، رسول کی مخالفت کرے گا، اور اہلِ ایمان کے طریقے کے خلاف چلے گا، تو ہم اُس کو اُدھر ہی پھیریں گے جدھر وہ (خود) پھر گیا ہے، اور اُس کو جہنّم میں داخل کریں گے، جو بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔ (نساء : ۱۱۵)

چھٹا باب

آدم کی ابوالبشریت پر

قرآن اور حدیث کی گواہی

یہ تھا نظریۂ ارتقا کی تردید اور حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیقِ خصوصی کا حال اور اس سلسلے میں بعض قرآنی تصورات و تعلیمات کی وضاحت۔ اب آئیے دیکھیں کہ حضرت آدم کے اولین بشر ہونے کے بارے میں قرآن اور حدیث میں مزید کیا کیا حقائق و معارف مذکور ہیں۔ اور وہ کتنی قطعیت کے ساتھ مختلف اسالیب میں اس ناقابلِ تردید حقیقت کا اثبات کرتے ہیں۔ تاکہ مسلمان کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اس حقیقت سے چشم پوشی نہ کرسکیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن میں ایسی کوئی آیت موجود نہیں ہے جو حضرت آدم کے اولین انسان ہونے پر دلالت کرتی ہو، جیسا کہ ایک مصری عالم محمد توفیق صدقی اور بعض دیگر لوگوں کا دعویٰ ہے۔ مگر ایسے لوگوں نے نہ تو قرآنِ حکیم میں غور کیا ہے، اور نہ حدیث شریف پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارا کی ہے جو قرآنی مجملات ہی کی شرح و تفصیل ہے، اور جس میں پوری صراحت کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کے ابوالبشر ہونے کا تذکرہ صاف صاف موجود ہے۔ اور اس کے علاوہ تمام کتبِ مقدسہ اس پر متفق ہیں

کہ حضرت آدمؑ ہی اولین بشر تھے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے محض مٹی کے ذریعہ پیدا کیا۔ لہٰذا حضرت آدمؑ کے اولین بشر ہونے کا انکار اسلام کے ایک بنیادی عقیدے کا انکار ہے۔ اور ایک مسلمان کو ہزار بار سوچ لینا چاہیئے کہ سلسلۂ ایمانیات کے ایک اہم عقیدے سے انکار کی زد کہاں کہاں پڑتی ہے۔

اب ذیل میں حضرت آدم علیہ السلام کے ابوالبشر ہونے کے تعلق سے قرآن، حدیث اور بعض کتبِ مقدسہ سے کچھ دلائل و براہین پیش کئے جاتے ہیں۔

پہلی دلیل: آدم اولین بشر

پچھلے صفحات میں یہ آیات گزر چکی ہیں:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ۔ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ : اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر کھنکھناتی مٹی سے جو بسے ہوئے گارے کی ہوگی، پیدا کرنے والا ہوں۔ پس جب میں اُس کو پورے طور پر بنالوں اور اُس میں اپنی رُوح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اُس کے لئے سجدہ میں گر پڑنا۔ (حجر: ۲۸-۲۹)

یہ دو آیات سورۂ ص میں بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ مذکور ہیں۔ اور جیسا کہ پچھلے مباحث میں بدلائل گزر چکا، یہ ایک فردِ واحد کے پیدا کئے جانے کا تذکرہ ہے۔ اگرچہ ان دونوں مقامات میں حضرت آدمؑ کا نام نامی مذکور نہیں ہے، بلکہ یہ تذکرہ کسی کا نام لئے بغیر مبہم انداز میں ہے۔ مگر جو تفصیلات ان دونوں مقامات پر مذکور ہیں وہ صرف حضرتِ آدم علیہ السلام ہی کے واقعہ پر صادق آتی ہیں جیسا کہ سورۂ بقرہ میں مذکور واقعہ سے دلالت ہوتی ہے۔ لہٰذا ان دو مواقع پر جس اولین بشر کے پیدا کئے جانے کا تذکرہ ہو رہا ہے، وہ سوائے آدم کے اور کوئی نہیں ہے۔ پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آدم دُنیا کا پہلا انسان نہیں تھا؟

غور فرمایئے، باریٔ تعالیٰ اور ملائکہ کے درمیان ایک مکالمہ ہو رہا ہے، جس کے مطابق اعلان یہ کیا جا رہا ہے کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں"۔ (بقرہ) اور پھر دیگر مقامات میں مزید تشریح

کے طور پر کہا جا رہا ہے کہ "میں ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں"۔ (حجر و ص) چونکہ ان تمام مقامات میں فرشتوں کے ذریعہ آدم کو سجدہ کرانا اور ابلیس کو نافرمانی کی بنا پر مردود قرار دینا مشترکہ طور پر مذکور ہے۔ لہٰذا یہ دونوں بیانات ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں۔ لہٰذا جس اولین "بشر" کو فرشتوں نے سجدہ کیا وہ آدم ہی تھا:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ: اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو اُنہوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے۔ (بقرہ: ۳۴)

کیا ان آیاتِ بیّنات کے ملاحظہ کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ آدم اوّلین بشر نہیں تھا؟

دوسری دلیل: تمام انسان اولادِ آدم

قرآنِ مجید میں متعدد مواقع پر پوری نوعِ انسانی کو "یَا بَنِیْٓ آدَمَ" (اے آدم کی اولاد) کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے، جو اس بات کی صاف دلیل ہے کہ تمام انسان حقیقتاً حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں۔ مثلاً:

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا: اے آدم کی اولاد! ہم نے تم پر پوشاک اُتاری، جو تُمہاری شرمگاہوں کو ڈھانپتی ہے، اور آرائش کے کپڑے بھی اُتارے (اعراف: ۲۶)

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس موقع پر یعنی سورۂ اعراف میں آیت ۱۱ سے ۲۵ تک قصۂ آدم اور اُس کی تفصیلات مذکور ہیں۔ پھر اس کے فوراً بعد یہ آیتِ کریمہ وارد ہوئی ہے، جو اس بات کا ایک مزید قرینہ اور دلیل ہے کہ آدم کوئی فرضی شخص یا تمثیلی نمائندہ نہیں بلکہ وہی حقیقی فرد تھا، جس کو اللہ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا کر کے ایک امتحان کی خاطر جنّت میں بسایا تھا۔ اور پھر امتحان پُورا ہونے کے بعد منصوبے کے مطابق اُس کو کرۂ ارض میں بود و باش اختیار کرنے کی غرض سے بھیجا تھا، تاکہ جس امتحان کی غرض سے آدم و حوا (علیہما السلام) کو جنّت میں بھیجا گیا تھا اُس کا سلسلہ ارضی زندگانی میں بھی جاری و ساری رہے۔

تیسری دلیل: آدم ایک حقیقت

اُوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے، دیکھئے اس کی مزید شرح و تفصیل اس کے بعد والی ایک اور

آیت میں کس طرح کی گئی ہے :

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ کَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْکُمْ مِّنَ الْجَنَّۃِ یَنْزِعُ عَنْھُمَا لِبَاسَھُمَا لِیُرِیَھُمَا سَوْاٰتِھِمَا : اے آدم کی اولاد ! دیکھو تمہیں شیطان بہکا نہ دے، جیسا کہ اُس نے تمہارے ماں باپ کو (بہکا کر) جنت سے نکال دیا تھا (اس طرح کہ) اُن سے اُن کے کپڑے اُتروا دئے تاکہ وہ انہیں ان کی شرمگاہیں دکھائے ۔ (اعراف : ۲۷)

دیکھیئے اس آیتِ کریمہ میں کس طرح اسلوب بدل کر چند مزید ایسے الفاظ لائے گئے ہیں جو اس حقیقت کو اور زیادہ مؤکد کر دیتے ہیں ۔ چنانچہ پہلے تو آیتِ سابقہ ہی کی طرح پوری نوعِ انسانی کو "آدم کی اولاد" کہا، پھر اس کے بعد آدم و حوا کو تمام انسانوں کے ماں باپ کہا، جیسا کہ اس موقع پر "اَبَوَیْکُمْ" (تمہارے والدین) کے الفاظ سے ظاہر ہے ۔ یہ لفظ " اَبٌ " (باپ) کا تثنیہ ہے، جس سے ماں باپ مراد ہوتے ہیں ۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں مذکور ہے :

وَرَفَعَ اَبَوَیْہِ عَلَی الْعَرْشِ : اور یوسف نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا ۔ (یوسف: ۱۰۰)

غرض اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ پوری نوعِ انسانی ایک متعین باپ اور متعین ماں کی اولاد ہیں، جو جنت سے زمین پر وارد ہوئے تھے ۔ اور یہ تصوّر کوئی ہوائی نہیں، بلکہ ایک حقیقتِ واقعہ ہے ۔ جبھی تو قرآنِ کریم اس واقعہ کو اتنی قطعیت کے ساتھ بیان کر رہا ہے، جس میں کسی بھی قسم کی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔

چوتھی دلیل : اولادِ آدم کا تکرار

اُوپر مذکور شدہ آیتوں میں پوری نوعِ انسانی کو جس طرح "بنی آدم" کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے، اسی طرح کچھ مزید آیات میں بطورِ تاکید یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے ۔ جس کے باعث ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کی نظر میں حضرت آدم کی شخصیت مُسلّم اور قطعی ہے، جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی ۔

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ وَّکُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ : اے آدم کی اولاد ! تم مسجد کی ہر حاضری کے لئے اپنی زینت اختیار

کرو، کھاؤ پیو مگر حد سے نہ بڑھو، کیونکہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (اعراف : ۳۱)

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ : اے آدم کی اولاد! اگر تم میں سے تمہارے پاس رسول آئیں، جو تم کو میری آیتیں سنائیں، تو جو لوگ ڈریں گے اور اصلاح کریں گے، ان کے لئے تو کوئی خوف نہیں ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا تو وہ دوزخی ہیں، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ (اعراف : ۳۵ - ۳۶)

پانچویں دلیل : نوعِ انسانی کی تخلیق فردِ واحد سے

ان تمام آیات کا حاصل یہ کہ نوعِ انسانی کی تخلیق کا آغاز ایک "فردِ واحد" سے ہوا ہے، نہ کہ بہت سے "تحت الانسانوں" یا بوزنہ (ape) خاندان کے "انسان نما بندروں" یا "بندر نما انسانوں" سے۔ اور اس فردِ واحد کی شخصیت بالکل متعین ہے، جو کوئی جنگلی یا گونگا بہرا نہیں، بلکہ انتہائی مہذب، خداشناس اور برگزیدہ انسان تھا، جس کو قرآن آدم کہتا ہے۔ اور قرآنِ حکیم کے بعض دیگر مقامات میں آدم کی تصریح کے بغیر آیا ہے کہ تمام انسانوں کی تخلیق اسی "نفسِ واحدہ" سے عمل میں آئی ہے۔

یَآ اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً : اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔ اور پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دئے۔ (نساء : ۱)

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ : اور وہی (تمہارا اللہ) ہے جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا، پھر (تمہارے لئے) ایک (عارضی) قرارگاہ ہے اور ایک سپرد کئے جانے کی جگہ (مستقل ٹھکانہ آخرت)۔

ہم نے سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لئے اپنے دلائل کھول کھول کر بیان کر دئے ہیں۔ (انعام: ۹۸)

جیساکہ پچھلے باب میں بدلائل گزر چکا ہے، قرآن مجید کا یہ بیان امیبا (amoeba) یا یک خلوی (unicellular) جاندار پر ہرگز صادق نہیں آسکتا۔ بلکہ مفسّرین کے قول کے مطابق یہ بیان صرف حضرت آدم علیہ السلام ہی پر صادق آسکتا ہے، چنانچہ علامہ ابنِ کثیر تحریر کرتے ہیں کہ "نفسِ واحدہ" سے مراد حضرت آدم اور "زوجھا" سے مراد حضرت حوا ہیں"۔[۱]

صاحبِ کشاف علامہ زمخشری تحریر کرتے ہیں: "اللہ نے تم کو آدم کی ہستی سے پیدا کیا.... اور اُسی سے تمہاری ماں حوا کو بھی پیدا کیا۔ اور ان دونوں سے تمام اُمَم سابقہ کو پیدا کیا"۔[۲]

اور امام رازی تحریر کرتے ہیں: "اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نفسِ واحدہ سے مُراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اور حوا ان کی پسلی سے پیدا کی گئیں۔ اس اعتبار سے تمام لوگ ایک فردِ واحد سے ہیں، جو آدم ہے"۔[۳]

اُمّ البشر حضرت حوا علیہا السلام کی تخلیق کے بارے میں قرآنِ مجید کا یہ بیان (وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا) ایک مجمل بیان ہے، جس کی تشریح و تفسیر بعض صحیح حدیثوں کے ذریعہ اس طرح ہوتی ہے:

اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ، فَإِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ، وَإِنَّ أَعْوَجَ الشَّيْءِ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ۔ فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ۔ وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ۔ فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ: عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ کیونکہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی (کی ہڈی) میں سب سے زیادہ ٹیڑھا پن اُس کے اُوپری حصّے میں ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر تم اُس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو اُس کو توڑ دو گے۔ اور اگر اس ٹیڑھے پن کو رہنے دو گے تو وہ یُونہیں رہے گا۔ لہٰذا تم عورتوں سے

---

[۱] تفسیر ابنِ کثیر، ۴۴۸/۱، مطبوعہ عیسی البابی الحلبی وشرکاہ، مصر۔

[۲] تفسیر کشاف، ۴۹۲/۱، مطبوعہ ایران۔

[۳] تفسیر کبیر، ۱۰۲/۱۳، طبع جدید۔

حُسنِ سلوک کرو۔[۴]

سائنسی نقطۂ نظر سے یہ ایک عجوبہ ہے کہ بغیر کسی مرد اور عورت کے حضرت آدم کی تخلیق عمل میں آئی اور اس سے بھی زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ ایک مرد سے ایک عورت کی تخلیق کی گئی۔ طبیعی نقطۂ نظر سے یہ دونوں اُمور حیرت انگیز تو ضرور ہو سکتے ہیں، مگر خلافِ عقل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ایک خلّاق اور قادرِ مطلق ہستی کا وجود تسلیم کر لینے کے بعد اس قسم کے "معجزاتِ رُبوبیت" کو تسلیم کئے بِنا چارہ نہیں ہے۔ چنانچہ خود ہماری طبیعی (natural) اور حیاتیاتی (biological) دنیا میں اس قسم کے بے شمار "معجزاتِ ربوبیت" آج بھی ہمارے سامنے موجود ہیں، جن کو سمجھنے سے پُوری دُنیائے سائنس قاصر بلکہ بے بس نظر آتی ہے اور نظامِ فطرت کے یہ "اسرارِ سربستہ" انسانی عقل و دانش کے لئے یقیناً ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا انسان کو "راہِ راست" پر لانے کے لئے اس قسم کے "اسرار" کا وجود بہت ضروری ہے۔

اس موقع پر ضمناً عرض ہے کہ اُوپر سورۂ انعام کی آیت میں "مُستقر" اور "مُستودع" کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، ان کی تفسیر میں اگرچہ کئی اقوال منقول ہیں، مگر میرے نزدیک حضرت ابنِ مسعودؓ کا یہ قول زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مستقر سے مراد دُنیا اور مستودع سے مُراد موت کے بعد کی زندگی ہے[۵] اور امام رازی نے بھی اصم سے ایک قول اسی معنی کا نقل کیا ہے[۶] اور قرآن مجید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جہاں پر وہ ہمارے کُرۂ ارض کو دوامی نہیں بلکہ ایک عارضی اور غیر مستقل ٹھکانہ قرار دیتا ہے:

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ : اور تمہارے لئے زمین میں ایک وقفہ تک ٹھکانہ اور سامانِ (زندگی) ہے۔ (بقرہ: ۳۶ نیز اعراف: ۲۴)

---

[۴] صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب ۱، ۱۰۳/۴، مطبوعہ استانبول۔

[۵] تفسیر ابنِ کثیر، ۱۵۹/۲، مطبوعہ مصر۔

[۶] تفسیر کبیر، ۱۰۳/۱۳

مطلب یہ ہُوا کہ کچھ مدت کے بعد نوعِ انسانی کو یہ عارضی ٹھکانہ چھوڑ کر اپنے وطنِ اصلی کی طرف مراجعت کرنی ہے۔ اور اس صورت میں نیکو کاروں کا وطن اصلی وہی جنّت الخُلد یا جنّت الماویٰ ہے، جہاں سے اُتر کر حضرت آدمؑ تکمیلِ امتحان کی غرض سے زمین پر بھیجے گئے تھے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ : اے بنی آدم! دیکھو تمہیں شیطان اس طرح نہ بہکائے جس طرح کہ اُس نے تمہارے والدین کو بہکا کر جنّت سے نکالا تھا، اس طرح کہ اُن سے اُن کے کپڑے اُتروا دئے تاکہ وہ اُنہیں اُن کی شرمگاہیں دکھائے۔ وہ اور اُس کا کُنبہ تمہیں اس طور سے دیکھتا ہے کہ تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ ہم نے شیطانوں کو اُن لوگوں کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔ (اعراف: ۲۷)

۶۔ آدم کی اولین اولاد اور کُنبہ داری

اُوپر سورۂ نساء کی جو آیت پیش کی گئی ہے وہ اس بیان میں "نصِ قطعی" ہے کہ نوعِ انسانی کا آغاز اِسی ایک "فردِ واحد" سے ہُوا ہے۔ اس کا صاف و صریح مطلب یہ ہُوا کہ دُنیا کے اس اوّلین انسان کے بیوی اور بچّے یا اُس کی باقاعدہ کُنبہ داری بھی تھی۔ آپ کی زوجۂ محترمہ یعنی حضرت حوا کا تذکرہ، آپ کے نام کی تصریح کے بغیر قرآن مجید میں متعدّد موقعوں پر آیا ہے۔ مثلاً:

يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ : اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنّت میں رہو۔ (بقرہ: ۳۵، اعراف: ۱۹)

اب رہا آپ کی حقیقی اولاد یا کُنبہ داری کا معاملہ، تو اس حقیقت پر حسبِ ذیل آیتِ کریمہ پوری صراحت کے ساتھ روشنی ڈال رہی ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ : تم ان کو آدم کے دو بیٹوں کا قصہ ٹھیک ٹھیک سُنا دو۔ جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی تو قبول ہوگئی اور دوسرے کی نہ ہُوئی۔ (مائدہ: ۲۷)

دیکھئے یہاں پر اس آیت کے پہلے فقرے میں مختصر اور گنے چنے الفاظ کے ذریعہ کتنے حقائق کا اثبات ہورہا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو "آدم کے دو بیٹے" کہہ کر اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ آدم ایک مُتاہّل یعنی اہل وعیال والے شخص تھے اور آپ کا کُنبہ وقبیلہ بھی تھا۔ پھر یہاں پر "نبأ" کا لفظ لایا گیا ہے، جو کسی واقعہ کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور پھر لفظ "الحق" کے ذریعہ یہاں پر مزید تاکید بھی پیدا کی جارہی ہے۔ گویا کہ یہ ایک بالکل صحیح اور سچا واقعہ تھا، جو حقیقت واقعہ کے عین مُطابق تھا، نہ کہ کوئی افواہ یا گھری پڑی بات۔ اس لحاظ سے اس واقعہ میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش کے گویا کہ تمام راستے بند کردئے گئے ہیں۔

اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی بارگاہِ ربّانی میں قبولِ ہوگئی۔ مگر دوسرے کی قبول نہ ہُوئی تو اُس نے محض حسد کی وجہ سے پہلے کو قتل کردیا اور دُنیائے انسانیت کا سب سے پہلا شقی القلب اور بدبخت انسان قرار پایا۔ اس اولین قتلِ ناحق کی بنا پر حدیثِ شریف کی تصریح کے مُطابق اب دُنیا میں جو بھی قتلِ ناحق ہوگا اُس کے گناہ میں آدم کا یہ شقی القلب بیٹا بھی شامل ہوگا:

لَا تُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْمًا إِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ آدَمَ الْأَوَّلِ كِفْلٌ مِنْ دَمِهَا۔ لِأَنَّهُ كَانَ أَوَّلَ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ: دُنیا میں جو بھی شخص ناحق قتل کیا جائے گا تو اُس کے خون کا ایک حصّہ آدم کے پہلے بیٹے پر بھی ہوگا۔ کیونکہ اُسی نے قتل کو رائج کیا تھا۔[۱]

یہاں پر نوٹ کرنے کے قابل الفاظ "ابن آدم الأول" ہیں، جن کے ذریعہ یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ آدم کے یہ دونوں بیٹے آپ کی اولین اولاد میں سے تھے۔ یہ قرآنِ کریم کے الفاظ کی مزید تشریح ہے۔ ورنہ "اِبْنَیْ آدَمَ" کی رُو سے یہ امکان تھا کہ آدم کے یہ دو بیٹے حقیقی واولین بھی ہوسکتے ہیں اور مجازی طور پر بعد کی کسی نسل کے بھی۔ مگر اس حدیث کی ذراسی قید نے اس اشتباہ کو

---

[۱] صحیح بخاری، کتاب الأنبیاء، باب ۱، ۱۰۴/۴، استانبول، نیز صحیح مسلم، کتاب القسامہ، حدیث ۲۷، ۱۳۰۴/۳، مطبوعہ ریاض۔

بالکل دُور کر کے اس کا صحیح مفہوم واضح کر دیا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلعم کا اصل منصب ہے :

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ

اور ہم نے یہ تذکرہ (قرآن) تیرے پاس اس لئے بھیجا ہے تاکہ تو کلامِ الٰہی (کی گرہوں) کو کھول دے، اور وہ اس میں غور وفکر کر سکیں۔ (نحل : ۴۴)

۷۔ آدم دُنیا کا پہلا ہمہ داں شخص

اللہ نے چونکہ حضرت آدم کو زمین کا خلیفہ اور جانشین بنا کر پیدا کیا تھا، اور خلافتِ ارض کے تقاضوں کے تحت آپ کو تمام تکوینی علوم سے نواز دیا تھا، تاکہ وہ اور اُن کی اولاد مخلوقاتِ الٰہی کی صحیح معرفت حاصل کر کے ہر ایک سے اُس کے مناسبِ حال برتاؤ کر سکیں۔ چنانچہ یہ داستان بھی قرآنِ حکیم میں ایک اعجازی انداز میں مذکور ہے :

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا : اور اُس نے آدم کو تمام چیزوں کے نام بتا دئے۔ (بقرہ : ۳۱)

اس کی تفسیر میں اکثر وبیشتر مفسّرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد دُنیا بھر کی تمام اشیاء اور اُن کے آثار وخواص (طبیعی خصائص) کا علم ہے، جو حضرت آدم کو بطورِ عطیۂ خُداوندی عطا کیا گیا تھا۔[۳] آدم کا یہ اعزاز واکرام اس بات کی دلیل ہے کہ وہی دُنیائے بشریت کا اولین نمائندہ تھا۔ ورنہ اگر پہلا نمائندہ کوئی دوسرا فرد ہوتا تو قرآن میں اس کا تذکرہ ضرور کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی نیا فرد کوئی منصب سنبھالتا ہے تو اس کو اس منصب کے تعلق سے تمام اُونچ نیچ پوری طرح سمجھا دئے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے فرائضِ منصبی بخوبی ادا کر سکے۔ اسی لئے حضرت آدم کو زمین پر تشریف لانے سے پہلے ہی دُنیا بھر کی تمام چیزوں کے ناموں اور اُن کے خصائص سے آگاہ کر دیا گیا، تاکہ وہ ان کے فوائد سے مستفید ہوں اور اُن کے نقصانات سے بچ سکیں۔ گویا کہ آدم کی یہ رہنمائی رُبوبیت کے فرائض میں داخل تھی۔ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز یا ہستی کو پیدا کر کے اس کو بالکل آزاد چھوڑ دیتا ہو۔

---

[۳] تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر ابنِ جریر طبری : ۱/۱۷۰، تفسیر ابنِ کثیر : ۱/۷۳، تفسیر ابنِ جوزی : ۱/۶۲-۶۳، دمشق، روح المعانی : ۱/۲۲۴، بیروت، تفسیر کشاف : ۱/۲۷۲، تفسیر کبیر : ۱/۲۵۸، مصر، تفسیر بیضاوی وغیرہ۔

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی : ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی (مخصوص طبیعی و نوعی) خلقت عطا کی، پھر اُس کی رہنمائی کی۔ (طٰہٰ : ۵۰)

۸۔ آدم ایک نبی اور جلیل القدر ہستی

اُوپر کی آیت (وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا) ایک نصِ قطعی ہے اس باب میں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تعلیم دینے والا خود خدائے تعالیٰ تھا۔ مگر اس کی نوعیت کیا تھی؟ تو یہ ایک خارج از بحث مسئلہ ہے۔ کیونکہ انسان بہت سی چیزوں کی کُنہ وحقیقت سے ناواقف ہے۔ مگر اس کی عدم واقفیت سے کسی واقعہ کا انکار لازم نہیں آتا۔ اب ظاہر ہے کہ جس ہستی کی تعلیم و تربیت خود ذاتِ باری نے کی ہو اس کی عظمت کے کیا کہنے! اس اعتبار سے حضرت آدم علیہ السلام ایک جلیل القدر شخصیت کے مالک قرار پاتے ہیں۔ اور حسبِ ذیل آیتِ کریمہ میں اسی حقیقتِ عظمیٰ کا اظہار کیا گیا ہے، جہاں پر حضرت آدم کو انبیائے کرام کی صف میں شامل کرکے ان کی عظمت پر مُہرِ تصدیق ثبت کی گئی ہے :

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ : یقیناً اللہ نے، آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو سارے جہاں سے منتخب فرمایا۔ (آل عمران : ۳۳)

اس موقع پر "اصطفا" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنی "انتخاب کرنے" کے ہیں۔ اور یہ لفظ قرآن مجید میں عموماً "انتخابِ نبوت" کے لئے بولا گیا ہے۔ مثلاً :

اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ : اللہ فرشتوں اور انسانوں کو رسالت کے لئے منتخب کرتا ہے۔ (مریم : ۷۵)

اس اعتبار سے حضرت آدم بھی اس "خدائی اعزاز و انتخاب" یا انبیائے کرام کی صف میں داخل ہیں اور اس "عالمی انتخاب" میں سب سے پہلا نمبر حضرت آدم علیہ السلام کا ہے۔ اگر آدم سے پہلے کوئی اس اعزاز سے سرفراز کیا گیا ہوتا تو قرآن میں اُس کا نام ضرور درج ہوتا۔ کیونکہ قرآن مجید ایک واقعیت پسند صحیفہ ہے اور اس میں کوئی غیر واقعی بات درج نہیں ہوسکتی۔

۹۔ تمام انبیاء ذُرّیّتِ آدم

جب آدم کی اولیت، آپ کی عظمت و بزرگی اور آپ کی نبوت و رسالت سب کچھ ثابت ہے تو اسی اعتبار سے ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا ہے کہ اس بلند مقام و مرتبہ کی بنا پر گویا آپ ہی اس قابل تھے کہ نوعِ انسانی کے مُورثِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے تمام انبیائے کرام کی نسبت آپ کی طرف صحیح ہو۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کوئی جنگلی آدمی یا انسان نما بندر hominid کے خاندان کا کوئی بھی تحت الانسان) انبیائے کرام کا جدِّ امجد یا مورثِ اعلیٰ نہیں ہوسکتا، جو انبیائے کرام ہی کی نہیں بلکہ پوری نوعِ بشری کی بھی توہین و تذلیل کے مترادف ہے۔ چنانچہ سورۂ مریم میں جہاں پر بالترتیب حضرت زکریا، حضرت عیسیٰ، حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت اسماعیل اور حضرت اِدریس علیہم السلام، جیسے جلیل القدر انبیائے کرام کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۙ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا: یہ وہ اللہ کے انعام یافتہ لوگ ہیں، جو پیغمبروں میں سے، آدم کی ذُرّیّت سے، نوح کے ساتھ سوار کیے گئے لوگوں میں سے، ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد میں سے، اور اُن لوگوں میں سے ہیں جن کو ہم نے ہدایت سے نوازا اور انہیں پسند کیا۔ (مریم: ۵۸)

یہ ان انبیائے کرام کی خصوصیات کی ایک فہرست ہے، اور اس فہرست میں ان سب کا "ذریتِ آدم" ہونا ایک اولین اور نمایاں تر وصف ہے۔ اور یہ بیان انبیائے کرام کا عالی نسب ہونا ثابت کرنے کے لئے ایک ربانی سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس حقیقت پر کچھ مزید روشنی بعض احادیث سے پڑتی ہے، جن کا تذکرہ اگلے صفحات میں آرہا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں لفظ "ذُرِّيَّت" استعمال کیا گیا ہے، جب کہ پچھلی آیات میں "بَنِیْ" (ابن کی جمع) کا لفظ لایا گیا تھا۔ ان دونوں میں معنوی اعتبار سے کچھ فرق ہے۔ ابن صرف

لڑکے کو کہا جاتا ہے[۹]، جب کہ ذریت کے مفہوم میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں[۱۰]۔ اس طرح اس لفظ کے ذریعہ اس حقیقت پر بھی بخوبی روشنی پڑ گئی کہ حضرت آدم کے صرف لڑکے ہی نہیں بلکہ لڑکیاں بھی تھیں۔ دیکھئے ذرا ذرا سے اشاروں میں کتنے بڑے بڑے حقائق پوشیدہ ہیں۔

۱۰۔ آدم کی ازلیت

حضرت آدم کا ابوالبشر ہونا ایک خدائی منصوبے کے تحت ابتدائے آفرینش سے پہلے ہی مقدّر ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب "عالمِ ارواح" میں رب العالمین نے تمام انسانی ارواح سے "میثاق" لیا تو اس وقت بھی نوعِ انسانی "بنی آدم" ہی کے مقام میں تھی۔ گویا کہ یہ ایک ازلی فیصلہ تھا، جس میں کسی قسم کی چناں و چنیں کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ دیکھئے یہ داستانِ ازل کس طرح سنائی جا رہی ہے:

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا : اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے اُن کی اولاد کو نکالا اور اُن سے اُن کی جانوں پر اقرار کروایا۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ اُنہوں نے کہا: کیوں نہیں! ہم اقرار کرتے ہیں۔ (اعراف: ۱۷۲)

۱۱۔ آدم کی ابدیت

جس طرح آدم ازل ہی سے ابوالبشر تھا، اسی طرح وہ ابد تک بھی ابوالبشر ہی رہے گا۔ بالفاظِ دیگر اللہ کے نزدیک آدم کی شخصیت جس طرح ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک مُسلّم ہے، اسی طرح وہ تاقیامت بھی مُسلّم رہے گی۔ چنانچہ حشر و نشر کے موقع پر اللہ تعالیٰ اپنے گنہگار بندوں سے خطاب کرتے ہوئے ان پر اپنی حجت اس طرح قائم کرے گا:

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ : اے آدم کی اولاد! کیا میں نے تمہیں جتا نہ دیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت مت کرو؟ کیونکہ

---

[۹] ملاحظہ ہو معجم الفاظ القرآن الکریم: ۱/۱۲۹، مطبوعہ مصر، ۱۳۹۰ھ

[۱۰] ایضاً، ۱/۴۳۵

وہ تمہارا کھلا ہُوا دشمن ہے ۔ (یٰسٓ : ۶۰)

ظاہر ہے کہ قیامت کے دن جب کہ پوری نوعِ انسانی یا ابتدا سے انتہا تک کے سارے افرادِ بشری، ایک جگہ جمع ہوں گے، تو اُس موقع پر ان سب کو "اے آدم کی اولاد" کہنا کیا معنی رکھتا ہے، سوائے اس کے کہ وہ سب کے سب اسی ایک فردِ واحد کی صلب سے نکلے ہُوئے ہیں ؟

۱۲۔ آدم تکریمِ انسانیت کی علامت

حاصل یہ کہ ان تمام قرآنی بیانات و منصوصات کی روشنی میں پوری طرح واضح ہوگیا کہ خُدا کے نزدیک عالمِ ارواح میں بھی ابوالبشر ہونے کی حیثیت سے ایک ہی آدم تھا، اس عالمِ آب و گِل میں بھی ایک ہی آدم رہا، اور یومِ آخرت میں بھی ایک ہی آدم رہے گا۔ ان روشن ترین حقائق کے خلاف کہی جانے والی کوئی بھی بات خلافِ قرآن ہے جو بالکل مردود اور ناقابلِ التفات ہے ۔

آدم درحقیقت انسانیت کے شرف و وقار کی علامت ہے ۔ اور نوعِ انسانی کو جو اشرف المخلوقات کا درجہ ملا ہے، وہ محض آدم کی عظمت و بزرگی کی بنا پر ہے ۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں نوعِ بشری کی تکریم کے موقع پر بجائے نوعِ بشری یا نوعِ انسانی کہنے کے "بنی آدم" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، جو اس بات کی علامت ہے کہ بنی آدم کو یہ شرف محض آدم علیہ السلام کی بدولت مل سکا ہے :

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا : اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزّت بخشی، اور انہیں خشکی و سمندر میں سواریاں عطا کیں، اور انہیں ستھری چیزیں بطورِ رزق مہیا کیں، اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انہیں پوری طرح فضیلت عطا کی ۔ (بنی اسرائیل : ۷۰)

کلامِ رسول کلامِ الٰہی کا شارح

یہ تھے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں قرآنی بیانات و تصورات، جو محکماتِ قرآن کا درجہ رکھتے ہیں۔ اب حدیثِ نبوی کی طرف آئیے تو دکھائی دے گا کہ قرآنی مجید نے حضرت آدم کے بارے میں جن

بنیادی تصورات کا اظہار کیا ہے، حدیث میں اُن کی مزید شرح و تفصیل ملتی ہے۔ کیونکہ حدیثِ نبوی ارشادِ الٰہی کے مطابق قرآن کے مجملات ہی کی تفسیر ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ:

ہم نے تیرے پاس یہ کتاب حقانیت کے ساتھ بھیج دی ہے، تاکہ تو لوگوں کے درمیان تفہیمِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کرسکے۔ (نساء: ۱۰۵)

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ:

اور ہم نے یہ تذکرہ (قرآن) تیرے پاس اس لئے بھیجا ہے تاکہ تُو کلامِ الٰہی کو لوگوں کے لئے کھول کر بیان کردے اور وہ اس میں غور و فکر کرسکیں۔ (نحل: ۴۴)

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ: اور ہم نے یہ کتاب تجھ پر اسی لئے اُتاری ہے تاکہ تو اُن کے لئے اُن مسائل کی وضاحت کردے، جن میں وہ اختلاف کررہے ہیں۔ اور یہ اہلِ ایمان کے لئے ہدایت اور رحمت بھی ہے۔ (نحل: ۶۴)

اس اعتبار سے فرائضِ نبوت میں سے ایک اہم ترین فریضہ کلامِ الٰہی کی مُبہم چیزوں کی تشریح و تفسیر کرنا اور مختلف فیہ مسائل میں "تفہیمِ الٰہی" کے مُطابق فیصلہ کرنا ہے۔ لہٰذا اب آیئے دیکھیں کہ زیرِ بحث مسئلے میں کلامِ نبوّت کلامِ الٰہی کی کس کس طرح اور کن کن حیثیتوں سے شرح و تفصیل کرتا ہے۔

۱۳۔ آدم دُنیا کا پہلا انسان

اُوپر کے صفحات میں جو قرآنی بیانات مذکور ہوچکے ہیں، اُن کے مُطابق سارے انسانوں کو "بنی آدم" اور "ذُریتِ آدم" کہا گیا تھا۔ اب دیکھیے حدیثِ نبوی میں یہی بات اُسلوب بدل کر تاکیدِ مزید کے طور پر کس طرح ذہنوں میں اُتاری جارہی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَفَخْرَهَا بِالْاٰبَاءِ، مُؤْمِنٌ تَقِيٌّ وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ، اَنْتُمْ بَنُوْ آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ: اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلی

غرور اور آبائی فخر و تکبّر ختم کر دیا ہے۔ (لہٰذا اب انسانوں کی دو ہی قسمیں رہ گئی ہیں:) یا تو صاحبِ تقویٰ مومن ہے یا بدکار و بدبخت شخص۔ تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔ (لہٰذا مٹی سے بنی ہوئی ہستی کے لئے فخر و تکبّر زیب نہیں دیتا)۔[۱۱]

اس حدیث سے دو چیزیں ثابت ہوتی ہیں: ایک یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام تمام انسانوں کے باپ یعنی ابوالبشر تھے۔ اور دوسرے یہ کہ آپ کی تخلیق ارتقائی طور پر کسی نچلی نوع سے نہیں بلکہ براہِ راست مٹی سے ہوئی تھی۔ اور یہ قرآن ہی کی تصدیق ہے۔

اسی طرح رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم نے فتحِ مکہ کے موقع پر لوگوں کے سامنے ایک خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ! إِنَّ اللهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَظُّمَهَا بِالْآبَاءِ، النَّاسُ مِنْ آدَمَ، وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔ ثُمَّ تَلَا: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ: اے گروہِ قریش! اللہ نے تم سے زمانۂ جاہلیت کے گھمنڈ اور باپ دادا پر فخر کرنے کی خصلت کو تم سے دُور کر دیا ہے۔ تمام لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے تھا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف گروہوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ (اور اب) اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ معزّز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ خُدا پرست ہو۔ یقیناً اللہ (تم سب کے اعمال کو) جاننے والا اور (ہر ایک کی) خبر رکھنے والا ہے۔[۱۲]

ظاہر ہے کہ مختلف پیرایوں میں قرآن اور حدیث میں ایک ہی حقیقت کا اظہار اس بنا پر

---

[۱۱] ابوداؤد، کتاب الأدب، باب التفاخر بالأحساب، ۵/۳۴۰، مطبوعہ حمص سوریا، جامع ترمذی، ابواب المناقب، حدیث ۴۰۴۹، ۵/۳۹۰، مطبوعہ بیروت، مسند احمد، ۲/۳۶۱، مطبوعہ بیروت۔

[۱۲] حدائق الانوار، مؤلفہ ابنِ دیبع شیبانی، ۲/۶۷۴-۶۷۵، مطبوعہ قطر۔

ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس واقعہ کی بہت بڑی اہمیت ہے۔

۱۴۔ آدم سے نوعِ انسانی کا آغاز

وہ عظیم ترین ہستی حضرت آدمؑ ہی کی تھی جس کی کوکھ سے بنی نوعِ بشر کا ظہور ہُوا۔ اس سے قبل یہ گیتی انسانی وجود سے بالکل خالی تھی۔ دیکھیے اس حقیقت واقعہ کا اظہار حدیثِ نبوی میں کتنے انوکھے انداز میں کیا جا رہا ہے:

مَابَيْنَ خَلْقِ آدَمَ إِلَى قِيَامِ السَّاعَةِ خَلْقٌ أَكْبَرُ مِنَ الدَّجَّالِ : آدم اور قیامت کے درمیان کوئی مخلوق دجال سے زیادہ بڑی نہ ہوگی۔[۱۳]

اس سے معلوم ہُوا کہ آدم سے پہلے کوئی انسانی مخلوق موجود نہ تھی۔ ورنہ ناممکن تھا کہ اس کو نظر انداز کر کے محض آدم کا نام لیا جاتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ خود اپنے بارے میں فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا : اور تیرا رب بھولنے والا نہیں ہے۔ (مریم : ۶۴)

۱۵۔ آدم کے بیٹے

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہر انسان سے "اے ابنِ آدم" کہہ کر مخاطب ہوگا۔ یہ بھی ایک دلیل ہے حضرت آدم کے اولین بشر ہونے کی۔ چنانچہ اس سلسلے میں ارشادِ نبوی ہے کہ اللہ تعالیٰ حشرِ آخرت کے موقع پر اپنے گنہگار بندوں سے اس طرح فرمائے گا:

وَيْلَكَ يَا ابْنَ آدَمَ مَا أَخْدَرَكَ : تیری خرابی ہے اے آدم کے بیٹے! تو کتنا دغاباز نکلا![۱۴]

اس کے علاوہ مختلف احادیث میں ہر انسان کو "ابنِ آدم" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے:

يُؤْذِيْنِي ابْنُ آدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ، وَأَنَا الدَّهْرُ: آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے، وہ اس طرح کہ وہ زمانے کو بُرا بھلا کہتا ہے، حالانکہ مَیں ہی زمانہ ہُوں۔[۱۵]

---

[۱۳] صحیح مسلم، کتاب الفتن، ۱۲۶، جلد ۴ ص ۲۲۶۷، مطبوعہ ریاض۔
[۱۴] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ۲۴، ۸/۱۸۰، مطبوعہ استانبول
[۱۵] بخاری کتاب التفسیر، باب ۴۵۔

كُلُّ ابْنِ آدَمَ خَطَّاءٌ ، وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ : آدم کا ہر بیٹا خطا کار ہے، اور بہتر خطا کار وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہوں۔[۱۶]

تَأْكُلُ النَّارُ مِنِ ابْنِ آدَمَ اِلَّا اَثَرَ السُّجُوْدِ : آگ آدم کے بیٹے کو کھا لیتی ہے، سوائے سجدوں کے نشانات کے۔[۱۷]

كُلُّ سُلَامَى مِنِ ابْنِ آدَمَ صَدَقَةٌ : ابنِ آدم کے ہر جوڑ پر ایک صدقہ ہے۔[۱۸]

اس قسم کی بہت سی حدیثیں ہیں۔ اور ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب وضاحتیں اپنی طرف سے نہیں بلکہ غیبی اطلاع ہی کے ذریعہ کی ہیں، جو خود قرآن مجید ہی کے بیانات کی مزید تشریح و تفصیل ہیں۔

۱۶۔ آدم کی بیٹیاں

جس طرح انسانی مردوں کو "ابنِ آدم" اور "بنی آدم" وغیرہ کہا گیا ہے، اسی طرح کُل طبقۂ نساء کو "بناتِ آدم" یعنی آدم کی بیٹیوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مثلاً ہر ماہ عورت کو جو ماہواری ہوتی ہے اس کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے:

اِنَّ هٰذَا اَمْرٌ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلٰى بَنَاتِ آدَمَ : یہ تو ایک امرِ مقدّر ہے، جو اللہ نے آدم کی بیٹیوں کے لئے لکھ دیا ہے۔[۱۹]

اِنَّمَا اَنْتِ اِمْرَاَةٌ مِنْ بَنَاتِ آدَمَ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْكِ مَا كَتَبَ عَلَيْهِنَّ : تم تو آدم ہی کی بیٹیوں میں سے ایک عورت ہو۔ تمہارے لئے بھی اللہ نے وہی لکھا ہے جو ان سب کے لئے لکھ دیا ہے۔[۲۰]

---

[۱۶] جامع ترمذی، ابواب القیامہ، باب ۴۹۔
[۱۷] مسلم کتاب الایمان ۲۹۹، ۱/۱۶۵، ابنِ ماجہ أبواب الزہد، باب صفۃ النار۔
[۱۸] سنن أبو داؤد، تطوع: باب ۱۲
[۱۹] صحیح مسلم، کتاب الحج ۱۳۶، ۲/۸۸۱
[۲۰] صحیح بخاری، کتاب الحج، باب ۳۳، ۲/۱۵۰

۱۷۔ جنّتی لوگوں کا قد آدم کے برابر

مختلف احادیث کے جائزہ سے نظریۂ ارتقا کی تردید میں عجیب وغریب حقائق سامنے آتے ہیں۔ جن میں سے ایک حیران کن حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قد "ساٹھ ہاتھ" کا تھا۔ چنانچہ بعض صحیح ترین حدیثوں میں یہ بیان اس طرح آیا ہے:

خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ وَطُوْلُهُ سِتُّوْنَ ذِرَاعاً۔ ثُمَّ قَالَ اذْهَبْ فَسَلِّمْ عَلٰى اُولٰئِكَ مِنَ الْمَلٰئِكَةِ فَاسْتَمِعْ مَا يُحَيُّوْنَكَ، تَحِيَّتُكَ وَتَحِيَّةُ ذُرِّيَّتِكَ۔ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ۔ فَقَالُوا السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ۔ فَزَادُوْهُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ۔ فَكُلُّ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَلٰى صُوْرَةِ آدَمَ۔ فَلَمْ يَزَلِ الْخَلْقُ يَنْقُصُ حَتّٰى الْآنَ: اللہ نے آدم کو پیدا کیا تو (اُس وقت) اُن کا قد ساٹھ ہاتھ کا تھا۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ جاؤ اُن فرشتوں کو سلام کرو اور سُنو کہ وہ تم کو کیا جواب دیتے ہیں۔ یہ تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہوگا۔ چنانچہ آدم نے کہا: السلام علیکم۔ اس کے جواب میں فرشتوں نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اس طرح اُنھوں نے "ورحمۃ اللہ" کے الفاظ بڑھائے۔ غرض جو لوگ (حساب کتاب کے بعد) جنّت میں داخل ہوں گے وہ سب (قد و قامت کے لحاظ سے) آدم کی شکل وصورت کے مطابق ہوں گے۔ پھر اس کے بعد سے اب تک تمام انسانوں کے قد چھوٹے ہوتے رہے ہیں۔[۲۱]

یہ حدیث صحیح مسلم میں بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ وارد ہوئی ہے، جس کا ایک فقرہ اس طرح ہے:

فَكُلُّ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَلٰى صُوْرَةِ آدَمَ، وَطُوْلُهُ سِتُّوْنَ ذِرَاعاً:
پس ہر وہ شخص جو جنّت میں داخل ہوگا وہ آدم کی صورت پر ہوگا، اور اُس کا قد ساٹھ ہاتھ کا ہوگا۔[۲۲]

اس موقع پر ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمین کی کُھدائی اور آثارِ قدیمہ (archaeology)

---

[۲۱] صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب ۱، ۱۰۲/۴ -
[۲۲] مسلم، کتاب الجنۃ ۲۸، ۲۱۸۴/۴ -

کی تحقیقات سے اب تک ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے جو قدیم اقوام کی بے انتہا درازقدی کو ثابت کرنے والا ہو۔ چنانچہ خود شارحِ بخاری حافظ ابنِ حجر نے بھی اسی طرح اشارہ کیا ہے کہ اُن کے دور میں قومِ ثمود وغیرہ کے مسکنوں کے جو آثار ملے ہیں، اُن کے جائزہ سے بھی اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ پچھلی اقوام کا قدوقامت موجودہ لوگوں سے بہت زیادہ طویل رہا ہو، جب کہ قومِ ثمود اور آدم کے درمیان جتنی مدت تھی، وہ اس مدت سے بھی کم ہے جو قومِ ثمود اور اُمتِ محمدیہ کے درمیان پائی جاتی ہے۔ موصوف کی اصل عبارت یہ ہے:

وَيُشْكِلُ عَلَى هَذَا مَا وُجِدَ الآن من آثار الأُمَمِ السالفةِ كَدِيارِ ثمود، فان مساكنهم تدُلّ على أن قاماتهم لم تكُن مُفرطةَ الطولِ على حسبِ ما يقتضيه الترتيبُ السابقُ. ولاشكّ أنّ عهدَهم قديمٌ، وأنّ الزمانَ الذى بَينهم وبَين آدمَ دُون الزمان الذى بَينهُم وبَين أوّلِ هٰذِهِ الأُمّة۔ وَلم يَظهرلى إلى الآنَ مَا يُزِيلُ هَذا الاشكال۔[23]

لٰہذا راقمِ سطور کے نزدیک اس اشکال کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا اس قدر درازقد صرف عالمِ بالا ہی میں رہا ہوگا۔ اور زمین پر آتے وقت یا آنے کے بعد آپ کا قد چھوٹا کر دیا گیا ہوگا۔ اگرچہ اس مفہوم کی بھی کچھ روایات (دوسرے اور تیسرے درجے کی) ضرور ملتی ہیں، مگر وہ مبالغہ سے خالی نہیں ہیں۔ اور اس قسم کی ایک روایت کو خود حافظ ابنِ حجر نے بھی ردّ کر دیا ہے، جس کو عبدالرزاق نے اس طرح روایت کیا ہے: "آدم کا جب ھُبوط ہُوا تو آپ کے پَیر زمین پر اور سر آسمان میں تھا۔ تو اللہ نے آپ کا قد کم کر کے ساٹھ ہاتھ کا کر دیا۔" اس حدیث کو نقل کر کے ابنِ حجر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ آپ ابتدا ہی سے بہت زیادہ لمبے تھے، جب کہ حدیثِ صحیح کی رُو سے آپ ابتداءً صرف ساٹھ ہاتھ کے تھے۔[24]

لٰہذا قرینِ قیاس یہ ہے کہ ابتدا میں آپ کا قد جو ساٹھ ہاتھ کا تھا، اس کو دُنیا میں آتے

۲۳۔ فتح الباری، ۳۶۷/۶، مطبوعہ ریاض۔

۲۴۔ ایضاً

وقت کم کرکے معمول کے برابر کردیا گیا ہو۔ اور اس توجیہہ کے لئے خود حدیث شریف ہی کا ایک نقرہ وہ ہے جو صحیح مُسلم کی روایت کے مُطابق اُوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی دُنیا کا ہر وہ شخص جو جنّت کا مُستحق ہوگا' اُس کا قد جنّت میں داخلے کے وقت ساٹھ ہاتھ کا کر دیا جائے گا۔ گویا کہ کسی شخص کے جنّتی ہونے کے لئے اُس کا قد ساٹھ ہاتھ کا ہونا ضروری ہوگا۔ اور گویا کہ یہ ایک نشان یا علامت (symbol) ہوگی جس کے ذریعہ قیامت کے دن جنّتیوں کو پہچانا جاسکے گا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش چونکہ جنّت میں ہوئی تھی (جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے) اس لئے اللہ تعالیٰ کی یہ ایک مصلحت ہوگی کہ تمام جنّتی لوگ ایک ہی قد وقامت کے ہوں، (فَكُلُّ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَلَى صُوْرَةِ آدَمَ) تاکہ کسی بھی جنّتی کو اپنے "تفاوتِ قد" کا احساس یا افسوس نہ ہو۔ اس اعتبار سے یہ گویا کہ جنّتیوں کا "یونیفارم قد" ہوگا۔

خیر یہ تو خُدائے خلّاق کی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں، جن کو وہ خود ہی زیادہ بہتر جان سکتا ہے، مگر جہاں تک اس سلسلے میں ہماری عبرت اور سبق آوری کا تعلق ہے، تو ان بیانات میں ہمارے لئے دو واضح حقائق مذکور ہیں، جو یہ ہیں :

۱۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ حضرت آدم کی تخلیق جب جنّت میں یعنی عالمِ بالا پر ہوئی تھی تو پھر "ارتقا" کا سوال ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ اور اس طرح یہ نام نہاد نظریہ اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

۲۔ اور دوسری حقیقت یہ ہے کہ بعض لوگوں نے جنّت مادی کو "جنّت ارضی" قرار دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضرت آدم کی تخلیق ہمارے عالمِ ارض میں ہوئی تھی نہ عالمِ سماوات میں۔ گویا کہ اس قسم کے لوگوں نے ایک طرح سے قرآن اور نظریۂ ارتقا میں تطبیق کی "راہیں" ہموار کر دی ہیں مگر اس صورت میں سوال یہ ہے کہ اب تک سائنسی تحقیقات کے مُطابق دُنیائے حیات کی وہ کونسی نوع (species) ہے جس نے "ساٹھ فٹ لمبے آدم" کو جنم دیا ہو؟ کیا hominidae خاندان (انسان نما مخلوقات کی ناپید شدہ اقسام) کی کوئی بھی نوع اس قسم کی موجود تھی؟ کیا اُحفوری ریکارڈ (fossil record) سے اس طرح کی کوئی شہادت ملتی ہے؟ چاہے وہ راما پیتھی کس ہو یا

آسٹرالو پیتھی کس! ہوموایریکٹس ہو یا ہوموسیپی ینس!! نینڈرتھل مخلوق ہو یا کرومیگنن نوع[25]!!!

لہٰذا اب دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں: یا تو ان صحیح ترین احادیث (قرآنِ حکیم کے بعد آج دُنیا میں حدیثِ رسول سے زیادہ مستند اور صحیح ترین ذخیرۂ علم موجود نہیں ہے) پر ایمان لاکر اس نام نہاد نظریہ کا ردّ کیجئے، یا پھر ان احادیثِ صحیحہ کا انکار کر کے اپنے ایمان سے ہاتھ دھوئیے۔ آپ کو تو بہر حال ان دونوں میں سے کسی ایک چیز کو منتخب کر لینے کا اختیار ہے۔

پیامِ آدمی

اس موقع پر چند مزید نکات کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ نظریۂ ارتقا کی تردید کے سلسلے میں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ مذکورۂ بالا احادیث کے مطابق حضرت آدم کی تخلیق عالم ملکوت میں ہوئی ہے، جہاں پر فرشتے آپ کو گھیرے ہُوئے تھے۔ گویا کہ وہ کمالاتِ باری کی اس نادرۂ روزگار ہستی بلکہ ایک عجیب وغریب تخلیق کا نظارہ کرنے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اپنی پیدائش کے فوراً بعد حضرت آدمؑ نے ربانی ہدایت کے مطابق فرشتوں کو سلام کیا۔ گویا کہ اپنی تخلیق کے پہلے ہی لمحے میں آپ نہ صرف ایک مکمل شکل اور ایک مکمل ہیئت میں ظاہر ہوئے، بلکہ فوری طور پر "خدائی تربیت" کے زیرِ اثر بھی آ گئے۔ یعنی سلسلۂ احکام جاری ہو گیا۔ چنانچہ اس ابتدائی ساعت اور اولین لمحے میں خدائی ہدایت کے مطابق آپ کے اور فرشتوں کے درمیان سلام وجواب کا جو تبادلہ ہُوا وہ "شریعت" کی پہلی بنیاد اور پہلی اینٹ بن گیا۔ بالفاظِ دیگر یہ اولین ہدایت وتعلیم آپ کی ذُریّت کے لئے "شریعتِ آدم" کے رُوپ میں سب سے پہلا تحفۂ ربانی بھی قرار پائی۔ چنانچہ آج اُمتِ اسلامیہ میں اسی شریعتِ آدم پر عمل ہو رہا ہے، جو پوری دنیائے انسانیت کے لئے امن وسلامتی کا ایک پیغام ہے۔ (سلام کے معنی امن وسلامتی کے ہیں) گویا کہ حضرت آدمؑ امن وسلامتی کے پیغامبر تھے۔ اور آج دنیا کو اسی امن وسلامتی کی ضرورت ہے۔ اور یہ ضرورت آج افراد سے بڑھ کر قوموں کو ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ آج کی قومیں موجودہ "خونی ڈراموں" کو ترک کر کے اس "پیامِ آدمی" پر

---

[25] ان اصطلاحات کی تشریح کے لئے دیکھئے دوسرا باب۔

عمل کریں، جس میں پوری دنیائے انسانیت کی بھلائی ہے۔ اور اس حیثیت سے یہ آج بھی خدا کا ایک پیغام ہے جو آفرینشِ آدم کے بعد دنیا کے سب سے پہلے انسان کو دیا گیا تھا۔ اور آج یہ نوعِ انسانی کے لئے آبِ حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ چونکہ اس پیامِ آدمی کی تجدید آج اسلام کے ذریعہ ہو رہی ہے، اس لئے آج اسلام ہی دُنیائے انسانیت کی نجات کا واحد مذہب بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اور اس حدیث کے ذریعہ یہ حقیقت بھی پوری طرح ظاہر ہو رہی ہے کہ حضرت آدم کو آپ کی تخلیق کے فوراً بعد نطق و گویائی سے بھی متصف کر دیا گیا تھا۔ یہ بھی نظریۂ ارتقا کی ایک بھرپور تردید ہے۔ دیکھئے یہ سارے حقائق اس بے بنیاد نظریہ کا کس طرح ردّ کر رہے ہیں اور کس طرح تخلیقِ خصوصی کا اثبات کر رہے ہیں!

اب رہا یہ مسئلہ کہ حدیثِ شریف کے آخری فقرے "پھر اس کے بعد سے انسانوں کے قد چھوٹے ہوتے رہے ہیں" کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ تو مذکورۂ بالا توجیہات کی روشنی میں اس کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کا قد دُنیا میں آنے کے بعد بھی عام انسانوں سے زیادہ لمبا رہا ہو۔ واللہ اعلم بمرادہ۔

۱۸- میثاقِ ازلی

پچھلے صفحات میں "دسویں دلیل" کے تحت سورۂ اعراف کی ایک آیت (۱۷۲) کی تشریح کی جا چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالمِ ارواح میں تمام انسانوں سے میثاقِ رُبوبیت لیا تھا۔ اس کی شرح و تفصیل مُسند احمد کی یہ حدیث پیش کرتی ہے، جس میں حضرت آدمؑ کو ابوالبشر ہونے کی حیثیت سے اس میثاق پر ایک عینی شاہد اور گواہ بنایا گیا ہے:

عَنْ اُبَيِّ ابْنِ كَعْبٍ فِيْ قَوْلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ (وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ الآية) قَالَ جَمَعَهُمْ فَجَعَلَهُمْ اَزْوَاجًا ثُمَّ صَوَّرَهُمْ فَاسْتَنْطَقَهُمْ فَتَكَلَّمُوْا ثُمَّ اَخَذَ عَلَيْهِمُ الْعَهْدَ وَالْمِيْثَاقَ، وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ، قَالَ فَاِنِّيْ اُشْهِدُ عَلَيْكُمُ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ وَالْاَرَضِيْنَ السَّبْعَ، وَاُشْهِدُ عَلَيْكُمْ اَبَاكُمْ اٰدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَمْ نَعْلَمْ بِهٰذَا، اِعْلَمُوْا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ غَيْرِيْ وَلَا رَبَّ غَيْرِيْ، فَلَا تُشْرِكُوْا بِيْ شَيْئًا اِنِّيْ سَاُرْسِلُ

اِلَیْکُمْ رُسُلِیْ یُذَکِّرُوْنَکُمْ عَهْدِیْ وَمِیْثَاقِیْ، وَاُنْزِلُ عَلَیْکُمْ کُتُبِیْ، قَالُوْا شَهِدْنَا بِاَنَّكَ رَبُّنَا وَاِلٰهُنَا، لَا رَبَّ لَنَا غَیْرُكَ۔

حضرت اُبی بن کعبؓ سے مروی ہے کہ اُنہوں نے آیتِ کریمہ (ترجمہ: اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے اُن کی ذُرّیت کو نکالا اور انہیں خود اُن پر گواہ بنایا) کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ نے بنی آدم کی رُوحوں کو جمع کیا اور اُن کی صورت گری کر کے انہیں نطق و گویائی عطا کی تو وہ بولنے لگیں۔ پھر اللہ نے ان سے عہد و میثاق لیا اور اُن کی ہستیوں پر خود ان کو شاہد بنایا۔ اور فرمایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہُوں؟ پھر اُس نے فرمایا کہ مَیں اس بات پر ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو گواہ بناتا ہُوں، اور اسی طرح تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو بھی گواہ بناتا ہُوں۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم قیامت کے دن یہ کہہ دو کہ ہم اس میثاق سے واقف نہیں تھے۔ تو خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ میرے علاوہ کوئی دوسرا اِلٰہ اور ربّ موجود نہیں ہے۔ لہٰذا تم میرے ساتھ کسی دوسری ہستی کو میری خدائی میں شریک مت کرو۔ اور میں تمہارے پاس اس سلسلے میں اپنے رسولوں کو بھیجوں گا، جو میرے اس عہد اور میثاق کو تمہیں یاد دلاتے رہیں گے۔ اور میں اپنی کتابیں بھی اس سلسلے میں نازل کرتا رہوں گا۔ تب اُن تمام رُوحوں نے کہا کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ تُو ہی ہمارا ربّ اور اِلٰہ ہے، اور تیرے سوا کوئی دوسرا رب موجود نہیں ہے۔[۲۶]

۱۹۔ حُجّتِ خداوندی

ہوسکتا ہے کہ آج منکرینِ خدا یہ کہہ بیٹھیں کہ اس وقت دُنیا میں ہم کو یہ عہد و پیمان یاد نہیں آرہا ہے۔ لہٰذا ہم اس میثاق کے پابند نہیں ہوسکتے اور ہم سے پیمانِ وفا کا مُطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔ تو اس قسم کا انکار اتنا آسان نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس ذہنیت کے توڑ کے لئے پہلے ہی سے کچھ ایسے انتظامات بھی کر رکھے ہیں، جن کے باعث انکار کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ سب سے پہلا انتظام تو اُس نے یہ کیا (جیسا کہ اُوپر والی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے) کہ اپنے چند منتخب بندوں کو

۲۶۔ مُسند احمد بن حنبل، ۵/۱۳۵، مطبوعہ بیروت۔

منصبِ نبوت سے سرفراز کر کے بھیجا، تاکہ وہ نوعِ انسانی کو خدا کا یہ عہد یاد دلاتے رہیں۔ اور دوسرا انتظام یہ کیا کہ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے آسمانی صحیفے بھیجے، جو انہیں انحرافات پر ٹوکتے اور غلطیوں پر متنبہ کرتے رہیں۔ چنانچہ اس اعتبار سے کوئی بھی دور خدائی ہدایت و رہنمائی سے خالی نہیں رہا۔ اور آج بھی خدا کی یہ رہنمائی قرآنِ مجید کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے، جو صُحفِ سماوی کی آخری کڑی ہے۔

مگر عصرِ جدید میں یہ میثاقِ خداوندی ہمارے سامنے ایک نئے انداز میں جلوہ افروز ہو کر اس کلامِ برحق کی صحت و صداقت پر مُہرِ تصدیق ثبت کر رہا ہے۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے خود انسانی فطرت اور اُس کی ساخت و پرداخت میں ایسے دلائل رکھ دئے ہیں جو وجودِ باری اور اُس کی وحدانیت کی شہادت و گواہی پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ آج حیاتیاتی (biological) اور نفسیاتی (psycological) علوم اور ان کی تحقیقات کی روشنی میں جو بھی حقائق و معارف سامنے آرہے ہیں، ان کے ذریعہ مادیت کا مسلسل ردّ اور روحانیت و خدا پرستی کا مسلسل اثبات ہوتا جا رہا ہے۔ تفصیل کے لئے تو ایک دفتر چاہیئے۔ اسی لئے قرآنِ حکیم مادیت کی صحیح نبض شناسی کرتے ہوئے اُس کی اس دُکھتی رگ پر ہاتھ اس طرح رکھتا ہے:

وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ : اور (خدا کے وجود کی نشانیاں) خود تمہاری ہستیوں میں بھی موجود ہیں۔ کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا؟ (ذاریات: ۲۱)

اس مختصر ترین ربانی آیت میں حقائق و معارف کا ایک سمندر سمیٹ دیا گیا ہے، جس میں جدید سے جدید تر تمام سائنسی تحقیقات کو پیش کیا جا سکتا ہے، اور علوم و معارف کے دفتروں کے دفتر اس موضوع پر سیاہ کئے جا سکتے ہیں۔

اسی بنا پر ربانی ارشاد اور اُس کا فطری مطالبہ ہے کہ انسان ایک ایسی برتر ہستی کا وجود تسلیم کرلے جس کی شہادت خود اُس کا جسمانی، طبیعی، حیاتیاتی، ذہنی اور نفسیاتی نظام دے رہا ہے۔ اور یہ مطالبہ "دورِ وحشت" یا دورِ جہالت کی یادگار نہیں بلکہ موجودہ علمی و سائنسی دور کی سب سے

بڑی حقیقت ہے، جس کے انکار میں خود انسان ہی کا نقصان ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۗ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۗ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ :

تو پوری یکسوئی کے ساتھ اس دین کی طرف متوجہ ہو جا۔ یہ اللہ کی تراش ہے، جس پر اُس نے تمام لوگوں کو تراشا ہے۔ لہٰذا اللہ کی اس تراش خراش (خلقت) میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی سیدھا دین ہے، لیکن بہت سے لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ (روم: ۳۰)

یہ آیتِ کریمہ بقول محمد احمد غمراوی اسلام کو نہ صرف دینِ فطرت قرار دیتی ہے، بلکہ خود نفسِ فطرت (خلقت) کو بھی اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ چیز قرار دیتی ہے، جس کے مُطابق اُس نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اور یہ ایک مختصر، مؤکّد اور کامل ترین تعبیر ہے اس بات کی کہ دینِ اسلام انسانی تخلیق سے متعلق اللہ تعالیٰ کے تمام نظامات پر پُوری طرح منطبق ہو سکتا ہے، خواہ وہ جسم سے متعلق ہوں یا نفس سے، عقل سے متعلق ہوں یا قلب سے۔ اور یہ حقیقت تمام افراد، خاندانوں، جماعتوں، قبیلوں اور قوموں پر یکساں طور پر صادق آتی ہے۔

والآیۃ الکریمۃ تجعل الاسلام لیس فقط دین الفطرۃ، ولکن نفس الفطرۃ التی فطر اللہ الناس علیھا۔ وھذا أوجز تعبیر وأوکدہ وأشملہ بتمام انطباق الاسلام علی سنن اللہ التی خلق علیھا الانسان، سواء تعلقت بالبدن أو النفس، وبالعقل أو القلب، فی الفرد والأسرۃ والطائفۃ، أو فی القبائل والأمم والشعوب۔[۲۷]

اس اعتبار سے یہ آیتِ کریمہ نظریۂ ارتقا کا بھرپور ردّ و ابطال کر رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ابتدا سے انتہا تک تمام انسانوں کا یکساں فطرت لے کر پیدا ہونا اور یکساں قسم کے حیاتیاتی و نفسیاتی مظاہر کے ساتھ اس طرح ظہور پذیر ہوتے رہنا اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ ایک برتر اور خلّاق ہستی ان سب کی

۲۷؎ الاسلام فی عصر العلم، محمد احمد غمراوی، ص ۲۲، دار الکتب الحدیثۃ مصر۔

نگرانی اور دیکھ بھال کر رہی ہے، اور سب کو چند طبیعی ضوابط میں جکڑے ہوئے ہے، جن میں سے کوئی بھی فرد انحراف نہیں کر سکتا اور رُبوبیت کی ان "زنجیروں" کو توڑ کر بھاگ نہیں سکتا۔ گویا کہ تمام بنی نوعِ انسان خلاّقیت و رُبوبیت کے سانچوں میں ڈھل ڈھل کر نکل رہے ہیں۔ اور گویا کہ اس کائناتِ مادی میں ایک "طبیعی جبریت" کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ اس اعتبار سے انسانی فطرت کسی بھی قسم کے "ارتقا" سے واقف نہیں ہے۔ اور اس اعتبار سے یہ ایک "درآمد" شدہ نظریہ لگتا ہے۔

غرض اس بحث سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ موجودہ انسان کے لئے خدائی حجت سے بچنے کی اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور وہ قیامت کے دن یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں نے چونکہ دُنیا بھر کے تمام "علوم" پڑھ لئے تھے، سمندروں اور فضاؤں کو چھان مارا تھا، تمام اشیائے عالم کو اچھی طرح چیر پھاڑ کر دیکھ لیا تھا اور دُوربین اور خوردبین کے ذریعہ ایک ایک چیز کا مشاہدہ کر لیا تھا "مگر اے باری تعالیٰ مجھے تیرا وجود کہیں بھی نظر نہیں آیا۔" (حالانکہ وہ بالکل سامنے موجود ہے، مگر آج کے انسان کو اسے دیکھنے اور سمجھنے کی فرصت ہی نہیں ہے)۔

اب دیکھئے حسبِ ذیل حدیث کے ذریعہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کس طرح اپنا یہ میثاقِ ازلی یاد دلاتے ہوئے اپنے بندوں پر حجت تمام کرے گا:

إِنَّ اللّٰهَ يَقُولُ لِأَهْوَنِ أَهْلِ النَّارِ عَذَاباً لَوْ أَنَّ لَكَ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ كُنْتَ تَفْتَدِي بِهِ؟ قَالَ نَعَمْ۔ قَالَ فَقَدْ سَأَلْتُكَ مَا هُوَ أَهْوَنُ مِنْ هٰذَا وَأَنْتَ فِي صُلْبِ آدَمَ، أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي، فَأَبَيْتَ إِلَّا الشِّرْكَ: اللہ ایک ایسے شخص سے جو دوزخ کے عذاب میں سب سے ہلکا ہو گا، فرمائے گا کہ فرض کرو اگر زمین بھر کی ساری چیزیں اس وقت تمہارے پاس موجود ہوتیں، تو کیا تم ان سب کو بطورِ فدیہ دے کر اپنے آپ کو اس عذاب سے چھڑا لیتے؟ وہ کہے گا ہاں کیوں نہیں۔ ارشاد ہو گا کہ میں نے دنیا میں تجھ سے اس سے بھی زیادہ آسان چیز کا مطالبہ کیا تھا جب کہ تو صُلبِ آدم میں تھا کہ "میرے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہرا"، مگر تو نے نہیں مانا اور شرک ہی پر اڑا رہا۔[۲۸]

---

[۲۸] بخاری کتاب الانبیاء، باب ۱، ۱۴۰/۴، مطبوعہ استانبول۔

اس استدلال کا حاصل یہ ہے کہ تمام انسان دُنیا میں آنے سے پہلے "پشتِ آدم" میں موجود تھے۔

۲۰۔ آدم کی تخلیقِ خصوصی

رازدانِ وحیِ الٰہی جناب رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلم بعض مواقع پر حضرت آدم علیہ السلام کی خصوصی تخلیق کا حوالہ اس انداز سے دیتے ہیں کہ اس کے ذریعہ نہ صرف آپ کی تخلیقِ خصوصی کی نوعیت واضح ہوتی ہے، بلکہ قرآنِ مجید میں مذکور اس بیان پر بھی بخوبی روشنی پڑ جاتی ہے کہ حضرت آدم کو مٹی سے کس طرح پیدا کیا گیا تھا؟ دیکھیئے یہ انوکھا اور اچھوتا بیان کس قدر معجزانہ انداز میں مذکور ہے!

اِنِّي عَبْدُ اللهِ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَخَاتَمُ النَّبِيِّينَ، وَإِنَّ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمُنْجَدِلٌ فِي طِينَتِهِ: رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کتابِ تقدیر کے مطابق میں اللہ کا بندہ اور نبیوں کا خاتم ہوں۔ اُس وقت سے جب کہ آدم علیہ السلام ابھی اپنی نم مٹی میں پڑے ہوئے تھے۔ [۲۹]

اِنِّي عِنْدَ اللهِ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَخَاتَمُ النَّبِيِّينَ، وَإِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِي طِينَتِهِ: میں اللہ کے نزدیک لوحِ محفوظ میں نبیوں کا خاتم تھا' جب کہ آدم اپنی گیلی مٹی میں پڑے ہوئے تھے۔ [۳۰]

مَتَى وَجَبَتْ لَكَ النُّبُوَّةُ؟ قَالَ وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوحِ وَالْجَسَدِ: صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا کہ آپ کو نبوّت کب واجب ہوئی؟ آپ نے فرمایا کہ اُس وقت جب کہ حضرت آدم ابھی رُوح اور جسد کے درمیان میں تھے۔ [۳۱]

اس موقع پر دو حقیقتیں ثابت ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ اسرارِ ملکوتیت کے رازدان حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلم، حضرت آدم کی انوکھی پیدائش کا حوالہ اس لئے دے رہے ہیں کہ اس کے ذریعہ اپنی اُمّت کے ذہن و دماغ میں یہ خیال و عقیدہ پوری طرح جاگزیں کر دیں کہ حضرت آدم ہی نوعِ انسانی کے

۲۹۔ مسند احمد بن حنبل، ۴/۱۲۸، مطبوعہ بیروت۔

۳۰۔ کنز العمال، علی المتقی، ۱۲/۵۲، مطبوعہ حیدرآباد، بحوالہ مسند احمد، طبرانی، حاکم، حلیۃ الاولیاء اور شعب الایمان۔

۳۱۔ ترمذی، مناقب، حدیث ۳۶۰۹، ۵/۵۸۵۔

اولین نمائندہ ہیں۔ اور دوسرے "یک پنتھ دو کاج" کے بمصداق حضرت آدم کی اس انوکھی تخلیق کی تھوڑی سی تفصیل بھی بتانی مقصود ہے، جس کا اجمالی بیان قرآن مجید کی متعدد آیات میں کیا گیا ہے۔

چنانچہ اس موقع پر بجائے "تراب" (خشک مٹی) کے "طینۃٌ" کا لفظ لایا گیا ہے، جس کا اطلاق گوندھی ہوئی مٹی کے ایک ڈھیر پر ہوتا ہے۔ گویا کہ حضرت آدم کی تخلیقِ خصوصی میں ایک دور اس حالت کا بھی گزر چکا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن مجید میں صرف لفظ "طین" استعمال ہوا ہے، "طینۃ" نہیں۔ مثلاً:

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ : جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں گوندھی ہوئی مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ (ص : ۷۱)

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ : یقیناً ہم نے انہیں ایک لیسدار مٹی سے پیدا کیا ہے۔ (صافات : ۱۱)

لفظ طین مٹی اور پانی کے آمیزے یا کیچڑ کو کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ قرآن مجید میں ۱۲ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ مگر ہر جگہ بطورِ اسم لایا گیا ہے۔ جب کہ حدیثِ شریف میں یہ لفظ " طینۃ " بطور "اسمِ مَرّہ" آیا ہے۔ اور اس بنا پر اس کے معنی میں ایک خصوصیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس لحاظ سے طین کے معنی مطلق طور پر گوندھی ہوئی مٹی کے ہیں اور طینۃ کے معنی گوندھی ہوئی مٹی کے ایک قطعہ یا ٹکڑے کے ہیں۔ (الطینۃ قطعۃ من الطّین)[۳۲]

اس طرح اس اعجازی بیان کے ذریعہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ کا کالبد اپنی تخلیق سے قبل مٹی کے ایک ٹکڑے یعنی ایک ڈھیر کی شکل میں تھا جو قرآنی تفصیلات کے مطابق سب سے پہلے خشک مٹی کے روپ میں تھا۔ (خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ : آل عمران ۵۹) پھر اس کو گوندھا گیا۔ (وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ : سجدہ ۷) پھر اس کو کچھ عرصے تک سڑا کر پھر ٹھیکری کی طرح سکھایا گیا۔ (مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ : حجر ۲۸)۔

---

[۳۲] لسان العرب، ۱۳/۲۷۰، دار صادر بیروت، نیز ملاحظہ ہو المعجم الوسیط مطبوعہ مصر

آپ نے دیکھا کہ محض ایک ذرا سے لفظی ہیر پھیر کی بنا پر مفہوم میں کس قدر معنویت پیدا ہو گئی ہے! یہ بھی کلامِ رسول کی معجزنمائیوں کا ایک حیران کُن پہلو ہے۔

اب آیئے اس سلسلے کی آخری حدیث کی طرف، جس میں درج ہے: "وآدم بین الروح و الجسد" یعنی آدم ابھی رُوح اور جسم کے درمیان میں تھے۔ اس کا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ آپ کا جسم یعنی مٹی کا ہیکل تو تیار ہو چکا تھا، مگر ابھی اس میں روح نہیں پھونکی گئی تھی۔ یہ سابقہ بیان کی مزید تفصیل و تشریح ہے۔ اس طرح یہ تمام حدیثیں قرآنی بیانات اور ان کی گرہوں کو کھول رہی ہیں اور بتا رہی ہیں کہ حضرت آدمؑ کی تخلیق حقیقتاً کس طرح عمل میں آئی۔

واقعہ یہ ہے کہ مختلف حدیثوں کے مطالعہ سے قرآن اور حدیث کی حکمتوں اور بصیرتوں کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی باریک بینی اور دِقّت آفرینی کا پتہ بھی چلتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی تشریح و تفسیر میں کس قدر دقیقہ سنجی سے کام لیتے ہیں! ظاہر ہے کہ یہ دقت آفرینی کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے!!

۲۱- آدم کی تخلیق، رُبوبیت کا ایک معجزہ

ظہورِ آدم کسی دوسری نوع کے بطن سے نہیں، بلکہ دستِ قدرت کے ذریعہ مافوق الفطرت طریقہ سے عمل میں آیا تھا، اور قرآن و حدیث کی تصریحات کے مطابق یکبارگی اور مکمل "آدمیت" کی شکل میں ہُوا۔ اور جیسا کہ حسبِ ذیل آیتِ قرآنی سے ثابت ہوتا ہے، آپ بغیر ماں باپ کے بطورِ معجزۂ خُداوندی نمودار ہُوئے:

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنَ ۔ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ : (تخلیق کے بارے میں) عیسیٰ کی مثال یقیناً آدم جیسی ہے، جس کو اُس نے مٹی سے بنایا پھر اُس سے کہا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا۔ حق بات تیرے رب کی جانب سے یہی ہے۔ لٰہذا تو شک کرنے والا مت بن۔ (آل عمران: ۵۹ - ۶۰)

اس آیتِ کریمہ پر پچھلے صفحات میں کچھ روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ جب کہ اس موقع پر کچھ مزید

تفصیل پیش کی جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بن باپ کی پیدائش کی وجہ سے عیسائیوں نے آپ کو مرتبۂ اُلوہیت پر فائز کرتے ہوئے خُدا یا ابنِ خُدا کا درجہ دے دیا تھا۔ لہٰذا اس نامعقول عقیدے کا رد کرتے ہوئے بطورِ دلیل ارشاد ہو رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ کا عام قانونِ فطرت کے خلاف پیدا ہونا بالکل ایسا ہی ہے جیسے حضرت آدم کی پیدائش، کہ آپ نہ صرف بن باپ کے بلکہ بغیر ماں کے بھی پیدا کئے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس تشبیہ میں "وجہِ شبہ" یا وجہِ استدلال یہی ہے۔ ورنہ پھر حضرت عیسیٰ کی خارقِ عادت طریقۂ تخلیق کی مثال تخلیقِ آدم کے ذریعہ ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ علامہ بدرالدین زرکشی تشبیہ کے اقسام پر بحث کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :

" ارشادِ باری (ترجمہ : عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے) تو یہ بیان درحقیقت ایک "نامانوس" چیز کی تشبیہ ایک "بالکل نامانوس" چیز کے ذریعہ دینا ہے، جو تشبیہ کی ایک قسم ہے۔ کیونکہ ایک مخالف شخص کے لئے آدم کی پیدائش (غرابت کے اعتبار سے) عیسیٰ کی پیدائش سے زیادہ مؤثر ہوگی۔ اور اس میں جوازِ قیاس کی دلیل بھی موجود ہے۔ یعنی کسی مناسبت کی بنا پر کسی فرع کو اس کی اصل کی طرف لوٹانا۔ کیونکہ یہاں پر ایک مشابہت کی بنا پر عیسیٰ کو آدم کی طرف لوٹایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ حضرت آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے، جن کے ماں باپ نہیں تھے۔ اسی طرح عیسیٰ کو بھی بغیر باپ کے پیدا کیا گیا۔"

وأما قوله تعالىٰ (ان مثل عيسىٰ عند الله كمثل آدم) فهو من تشبيه الغريب بالأغرب۔ لأن خلق آدم من خلق عيسى ليكون أقطع للخصم وأوقع في النفس۔ وفيه دليل على جواز القياس، وهو ردّ فرع الى أصل لشبه ما۔ لأن عيسى رُدّ الى آدم لشبه بينهما۔ والمعنى أن آدم خلق من تراب، ولم يكن له أب ولا أم۔ فكذلك خلق عيسى من غير أب [۳۳]

اور امام ابنِ تیمیہ اس آیتِ کریمہ کی تشریح میں فرماتے ہیں :

[۳۳] البرهان في علوم القرآن، ۳/۴۲۶، دارالمعرفة بيروت۔

"یہ ایک کلام برحق ہے، اور حق تعالیٰ نے اپنی عمومی قدرت کے اظہار کے طور پر نوعِ بشری کو مختلف طریقوں سے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ اس نے آدم کو بغیر مرد اور عورت کے پیدا کیا اور آپ کی زوجۂ محترمہ حوا کو بغیر عورت کے صرف ایک مرد سے پیدا کیا۔ جیساکہ ارشادِ باری ہے (وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا)۔ اور مسیح کو بغیر مرد کے صرف ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور دیگر تمام لوگوں کو (عام قاعدے کے مطابق) مرد اور عورت دونوں سے پیدا کیا۔ اس طرح آدم و حوا کی پیدائش عیسیٰ کی پیدائش سے زیادہ عجیب ہے۔ حوا آدم کی پسلی سے پیدا کی گئیں، جو عیسیٰ کی پیدائش سے زیادہ عجیب ہے۔ اور آدم کی پیدائش تو ان دونوں سے زیادہ عجیب ہے۔" [۳۴]

اس کی مزید تشریح یہ ہے کہ کسی انسان کا ماں باپ سے یا بغیر ماں باپ کے پیدا کئے جانے کی چار ممکنہ شکلیں ہوسکتی ہیں جو یہ ہیں :

۱۔ اُس کو اللہ تعالیٰ نے یا تو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا ہوگا، جو آدم ہیں۔

۲۔ یا ماں باپ کے ذریعہ، جیساکہ ذریتِ آدم کا حال ہے۔

۳۔ تیسری قسم بغیر ماں کے صرف باپ کے ذریعہ، اور یہ حوا کی مثال ہے۔

۴۔ اب رہی چوتھی قسم یعنی بغیر باپ کے صرف ماں کے ذریعہ پیدائش، تو اس کا مظاہرہ تخلیقِ عیسیٰ کے ذریعہ کیا گیا۔ [۳۵]

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر طرح سے اپنی قُدرت کا اظہار کردیا ہے۔ تاکہ کسی بھی شخص کو اُس کی قُدرتِ کاملہ سے انکار کی گنجائش نہ رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تخلیقِ الٰہی اور اُس کی قُدرت و رُبوبیت سے مکمل آگاہی حاصل کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید سائنس باوجود اپنی ہمہ گیریت کے اس سلسلے میں ـــ مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے ـــ کسی بھی قسم کے یقینی اور تسلّی بخش نظریہ تک پہنچنے میں ناکام رہی ہے۔ حتیٰ کہ وہ آغازِ حیات تک کو سمجھنے اور سمجھانے سے بھی قاصر ہے۔ بلکہ

---

۳۴ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح، ۲/۲۹۴، مطابع المجد التجاریہ۔
۳۵ حدائق الانوار، ابن دیبع، ۲/۷۱۱، مطبوعہ قطر۔

ایک ادنیٰ درجے کے تخم مایہ (protoplasm) کے اسرار تک کو سمجھنے کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتی، سوائے چند قیاسات و مفروضات کے۔ اور اس حیثیت سے "زندگی" بجائے خود ایک "سرِّ ربانی" ہے، جس کی کُنہ و حقیقت تک انسان کسی بھی صُورت میں نہیں پہنچ سکتا اور "فعلِ الٰہی" کی صحیح ماہیت کا فہم و ادراک نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس بارے میں خُدا کی قُدرت و رُبوبیت پر ایمان لائے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا :

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ : حق بات تیرے رب کی جانب سے ہے۔ لہٰذا تو شک کرنے والا مت بن۔ (آل عمران : ۶۰)

غرض عیسائیوں کی اکثریت اگرچہ حضرت عیسیٰؑ کو "ابنِ خُدا" یا "تین میں کا ایک" کہتی رہی ہے، مگر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق خود عیسائیوں نے اس سلسلے کی اسلامی اور یہودی روایات کو تسلیم کر لیا ہے کہ جس طرح حضرت آدم بغیر ماں باپ کے مٹی سے پیدا کئے گئے تھے، اسی طرح حضرت عیسیٰ بھی بغیر باپ کے ایک دوشیزہ سے پیدا کئے گئے تھے :

" اس طرح یہ قصّہ کہ آدم کی تخلیق کچی مٹی سے کی گئی، اس کو اس حقیقت کے لئے بطور نمونہ پیش کیا گیا کہ "آدم ثانی" یعنی عیسیٰ بھی اسی طرح ایک کنواری سے پیدا کئے گئے تھے۔"

> The legend that Adam was created out of virgin soil was taken to prefigure the fact that the second Adam (i.e., Jesus) was likewise born of a virgin.[36]

واضح رہے کہ بائبل کے عہد نامۂ جدید (New Testament) میں حضرت عیسیٰؑ کے لئے "آدم ثانی" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، جس طرح کہ آپ کو "ابنِ آدم" بھی کہا گیا ہے۔ تو جہاں تک آپ کے آدم ثانی ہونے کا تعلق ہے، اس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ اس انوکھی پیدائش کی بنا پر آپ کو آدم ثانی کہا گیا ہو۔ اور جہاں تک آپ کے ابنِ آدم ہونے کا سوال ہے تو یہ آپ کی بشریت کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ اس طرح یہ دونوں بیانات عیسائیوں کے خود ساختہ عقائد کے خلاف

36. Encyclopaedia Brittanica, 10/194, 1983.

جاتے ہیں۔ اس طرح ان سے نہ صرف اسلامی عقائد کی تصدیق اور آدم کے ابوالبشر ہونے کی تائید ہوتی ہے، بلکہ اُن کے ذریعہ اُلوہیتِ عیسیٰ اور آپ کے ابنِ خُدا ہونے کے عقیدے پر بھی کاری ضرب پڑتی ہے۔ ان صاف و صریح بیانات کے باوجود بھی عیسائیوں کا آپ کو خُدا یا خُدازادہ یا "تین میں کا تیسرا" کہنا نہ صرف خُدا پر ایک بہتان ہے بلکہ خود بائبل سے بھی ناواقفیت کی ایک دلیل ہے۔

غرض اس بحث سے اسلامی عقیدے کی تائید اور نظریۂ ارتقا کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کے غلط عقائد کی بھی تردید ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ خالقِ ارض و سما بے پایاں قدرت کا مالک ہے اور وہ انواعِ حیات کو جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اُس کی قُدرت و خلاّقیت پر کوئی روک نہیں لگا سکتا۔ چنانچہ یہ حیرت انگیز کُرۂ ارض اور یہ عظیم الشان اجرامِ سماوی اُس کی قُدرت و خلاّقیت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہیں۔ وہ جب کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ کرلیتا ہے تو اُس کے لئے صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ "ہوجا" اور وہ چیز ہوجاتی ہے:

اَوَلَيْسَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰى ۗ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۔ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔ فَسُبْحٰنَ الَّذِىْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَىْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ : وہ (عظیم) ہستی جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ ان جیسی ہستیوں کو پیدا کردے؟ کیوں نہیں، وہ تو بڑا ہی خلاّق اور ہمہ داں ہے۔ اُس کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرلیتا ہے تو صرف اتنا ہی کہتا ہے کہ "ہوجا" اور وہ ہوجاتی ہے۔ لہٰذا وہ بڑی شان والا ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی تکمیل ہے۔ اور اُسی کی طرف تم واپس جارہے ہو۔ (یٰسٓ : ۸۱ - ۸۳)

یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی عبرت و بصیرت کے لئے اگرچہ ایک طبیعی (natural) ضابطہ ضرور مقرر کر رکھا ہے، جس کی خلاف ورزی وہ "عموماً" نہیں کرتا۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ خود بھی اس ضابطہ کا پابند ہے، بلکہ اس ضابطہ کو بنانے کے بعد وہ اب گویا کہ "بے بس" ہوکر رہ گیا ہے۔ لہٰذا اگر وہ چاہے تو اس ضابطہ کو توڑ بھی سکتا ہے۔

بلکہ وہ اپنی قدرت و ربوبیت کے مظاہرہ کے لئے کبھی کبھی اس ضابطہ کو توڑ کر دکھا بھی دیتا ہے۔ حضرت آدم، حضرت حوا اور حضرت عیسیٰ کی انوکھی اور خارقِ فطرت تخلیقات اسی "اظہارِ قدرت" کا ایک نمونہ ہیں۔ اور انبیائے کرام کے ہاتھوں جو "معجزات" سرزد ہوئے ہیں وہ بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ کسی نبی کا کوئی بھی معجزہ اُس کا اپنا فعل نہیں ہوتا، بلکہ درحقیقت وہ "فعلِ الٰہی" ہوتا ہے، جس کی مکمل حقیقت انسان کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ مگر اس سے واقعات کا انکار لازم نہیں آتا۔

حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا مالک اور بادشاہ ہے۔ لہٰذا وہ جس طرح چاہتا ہے اپنی بادشاہت اور ملکیت میں تصرف کر سکتا ہے، کوئی اسے روک ٹوک نہیں سکتا۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ حسبِ ذیل آیات میں اپنی اس بادشاہت اور خودمختاری کا اعلان کس طرح کرتا ہے:

هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ : وہی تو (تمہارا خدا) ہے جو ماں کے پیٹ میں جس طرح چاہتا ہے تمہاری صورت گری کرتا ہے۔ (لہٰذا) اُس کے سوا دوسرا کوئی اِلٰہ موجود نہیں ہے، جو اس قدر زبردست اور حکمت والا ہو۔ (آل عمران:۶)

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَاۗبَّةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰي بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰي رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓي اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ : اللہ نے ہر جاندار کو پانی سے بنایا ہے۔ تو ان میں سے کچھ اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں، کچھ دو پاؤں پر چلتے ہیں، اور کچھ چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ (اس کے علاوہ) اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، (کیونکہ) وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (نور: ۴۵)

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ وَيَخْتَارُ ۭ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ : اور تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جو چاہتا ہے منتخب کرتا ہے۔ ان لوگوں کو (اعتراض کرنے کا) کوئی اختیار نہیں ہے۔ اللہ ان لوگوں کے شرک سے پاک اور برتر ہے۔ (قصص: ۶۸)

۲۲۔ قیامت کی ایک گواہی

یہاں تک تو ایسی احادیث بیان کی گئیں، جن کے ذریعہ حضرت آدم علیہ السلام کا پوری

نوعِ انسانی کا باپ اور اولین انسان ہونا مختلف حیثیتوں سے ثابت ہوتا ہے۔ اور اب اس موقع پر ایک ایسی حدیث بیان کی جاتی ہے جس میں صاف صاف آپ کو تمام لوگوں کا باپ اور ابوالبشر کہا گیا ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن لوگوں کی ایک جماعت اُس دن کی ہولناکیوں سے گھبرا کر سب سے پہلے حضرت آدمؑ کے پاس آپ کو سفارشی بنانے کی غرض سے آئے گی اور آپ کو "ابوالبشر" کے معزز لقب سے مُلقب کرتے ہوئے آپ سے اللہ کے پاس سفارش کرنے کی درخواست کرے گی:

..... یَا آدَمُ اَنْتَ اَبُوالْبَشَرِ خَلَقَكَ اللّٰهُ بِيَدِهٖ ، وَنَفَخَ فِيْكَ مِنْ رُّوْحِهٖ ، وَاَمَرَ الْمَلٰٓئِكَةَ فَسَجَدُوْا لَكَ ، وَاَسْكَنَكَ الْجَنَّةَ ، اَلَا تَشْفَعُ لَنَا اِلٰى رَبِّكَ : اے آدم آپ ابوالبشر ہیں، اللہ نے آپ کو اپنے دستِ مبارک سے پیدا کیا، آپ میں اپنی رُوح پھونکی اور فرشتوں کو آپ کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیا اور آپ کو جنّت میں بسایا۔ تو کیا آپ اپنے رب کے پاس ہماری سفارش نہیں فرمائیں گے؟[۳۷]

ایک دوسری روایت میں "ابوالبشر" کی جگہ "ابوالناس" (لوگوں کے باپ) کے الفاظ بھی آئے ہیں[۳۸] اور ان دونوں کا مطلب و مدّعا ایک ہی ہے۔

یہ حدیث حضرت آدم علیہ السلام کے ابوالبشر ہونے پر ایک قطعی اور مُحکم دلیل ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کے مختلف فضائل و خصوصیات کی بھی جامع نظر آتی ہے۔ چنانچہ آپ کی تخلیقِ خصوصی کے سلسلے میں قرآنِ مجید میں جو مختلف بیانات آئے ان کو اس موقع پر یکجا کر دیا گیا ہے۔

ایک اور لحاظ سے غور کیجئے تو اس راز پر سے پردہ اور زیادہ ہٹ جائے گا کہ قیامت کے دن لوگ دیگر تمام برگزیدہ انسانوں اور جلیل القدر رسولوں کو چھوڑ کر سب سے پہلے حضرت آدمؑ ہی کے پاس کیوں جائیں گے؟ تو ظاہر ہے کہ کسی مُصیبت کے وقت انسان سب سے پہلے اپنے "بزرگوں" ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور حضرت آدم چونکہ حقیقتاً سب بزرگوں کے "بزرگ" ہیں لہٰذا فطری طور پر

---

۳۷ بخاری کتاب الانبیاء : ۴/۱۰۵ ، مسلم کتاب الایمان ۳۲۷ ، ۱/۱۸۴ ۔

۳۸ ابن ماجہ أبواب الزھد ، باب ذکر الشفاعۃ ، ح ۴۳۱۲ ، دارالفکر بیروت ۔

لوگ قیامت کی ہولناک مصیبت سے گھبرا کر سب سے پہلے آپ ہی کی طرف رجوع ہوں گے۔ کیونکہ آپ ہی سب کے اولین باپ اور تمام انسانوں کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ ورنہ بصورتِ دیگر لوگ آپ کو چھوڑ کر اُسی کی طرف لپکتے جو تمام کا جدِّ امجد ہوتا۔ ظاہر ہے کہ آج اگر یہ حقیقت عام انسانوں کی نظر سے کسی وجہ سے مستور ہے، یا اس پر "پردے" ڈال دئے گئے ہیں، تو قیامت کے دن یہ تمام پردے اور دبیز تہیں پوری طرح ہٹا دئے جائیں گے۔ وہ دن جس میں دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی کر دیا جائے گا۔

یَوْمَ تُبْلَی السَّرَائِرُ : جس دن کہ بھید ظاہر کر دئے جائیں گے۔ (طارق : ۹)

۲۳۔ سلسلۂ نسب کا اختتام آدم پر

رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مختلف مواقع پر اپنے آپ کو آدم کی اولاد میں سب سے زیادہ برگزیدہ ہستی قرار دیا ہے۔

اَنَا اَکْرَمُ وَلَدِ آدَمَ عَلٰی رَبِّیْ وَلَا فَخْر : میں اپنے رب کے نزدیک آدم کی اولاد میں سب سے زیادہ معزّز ہوں۔ لیکن مجھے اس پر کوئی فخر نہیں ہے۔[۳۹]

اَنَا سَیِّدُ وَلَدِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا فَخْر : میں قیامت کے دن اولادِ آدم کا سردار ہوں گا۔ مگر مجھے اس پر کوئی فخر نہیں ہے۔[۴۰]

اَنَا سَیِّدُ وَلَدِ آدم، وَاَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْہُ الْاَرْضُ : میں اولادِ آدم کا سردار ہوں۔ اور (قیامت کے موقع پر) میں پہلا شخص ہوں گا جس کے لئے زمین پھٹے گی۔[۴۱]

ان نصوص سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ذاتِ گرامی حضرت آدمؑ ہی کی ہے، جس پر تمام انسانوں کا سلسلۂ نسب ختم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن اور حدیث میں کسی قسم کے غلط واقعے کی خبر نہیں دی جا سکتی۔

---

[۳۹] ترمذی ابواب المناقب، حدیث ۳۶۱۰، ۵/۵۸۵، مطبوعہ بیروت۔

[۴۰] ایضاً، حدیث ۳۶۱۵، ۵/۵۸۷

[۴۱] ابوداؤد کتاب السنۃ، باب ۱۴، ۵/۵۴، مطبوعہ حمص، نیز ابن ماجہ کتاب الزھد، باب ذکر الشفاعۃ، حدیث ۴۳۰۸، ۲/۱۴۴۰، بیروت۔

۲۴- اوّلیتِ آدمؑ پر موسیٰؑ کی گواہی

حضرت آدم علیہ السلام کی ابوالبشریت پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گواہی بھی قابلِ لحاظ ہے۔ جیسا کہ ایک مشہور حدیث کے مطابق عالمِ ارواح میں ان دونوں کے ایک مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ حدیث بخاری، مُسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ، مؤطا امام مالک اور مُسند احمد وغیرہ میں متعدد طرق اور مختلف الفاظ و اسالیب میں مروی ہے۔ اور بقول حافظ ابنِ کثیر یہ ایک متواتر حدیث ہے۔ جو "جنّتِ آدم" کے جنّت الماویٰ ہونے کی بھی ایک بیّن دلیل ہے، اور جس کا انکار کوئی معاند شخص ہی کر سکتا ہے۔

ومن كذّب بهذا الحديث فمعاند، لأنه متواتر عن أبي هريرة رضي الله عنه۔[۴۲]

بہرحال یہ حدیث اختصار کے پیشِ نظر صرف بخاری کے حوالے سے پیش کی جاتی ہے، جس کے الفاظ بہت مختصر ہیں:

اِحْتَجَّ آدَمُ وَمُوْسیٰ فَقَالَ لَهُ مُوْسیٰ: يَا آدَمُ اَنْتَ اَبُوْنَا، خَيَّبْتَنَا وَاَخْرَجْتَنَا مِنَ الْجَنَّةِ، قَالَ لَهُ آدَمُ: يَا مُوْسیٰ اِصْطَفَاكَ اللّٰهُ بِكَلَامِهِ وَخَطَّ لَكَ بِيَدِهِ، اَتَلُوْمُنِيْ عَلٰى اَمْرٍ قَدَّرَ اللّٰهُ عَلَيَّ قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَنِيْ بِاَرْبَعِيْنَ سَنَةً؟ فَحَجَّ آدَمُ مُوْسیٰ ثَلَاثاً: حضرت آدم اور حضرت موسیٰ میں بحث ہوئی تو موسیٰؑ نے کہا کہ اے آدم! آپ ہمارے باپ ہیں، مگر آپ نے (اپنی ایک غلطی کی بنا پر) ہم سب کو ناکام و نامراد کر دیا اور جنّت سے نکلوا دیا۔ حضرت آدم نے فرمایا کہ اے موسیٰ! اللہ نے تم کو اپنے کلام کے لئے منتخب فرمایا اور تمہارے لئے (تورات) اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی۔ تو کیا تم مجھے ایک ایسے معاملے میں ملامت کرتے ہو جس کو اللہ نے میری پیدائش سے چالیس سال پہلے ہی میرے لئے مقدّر کر دیا تھا۔ (اس لئے ظاہر ہے کہ شرعی اعتبار سے یہ ایک تقدیری معاملہ تھا اور تورات میں اس کا بیان مذکور تھا)۔ تو اس طرح حضرت آدم حضرت موسیٰ پر حجت میں غالب آگئے۔[۴۳]

۴۲ھ البداية والنهاية، ابن کثیر، ۸۵/۱، مکتبۃ المعارف بیروت، ۱۴۰۴ھ

۴۳ھ بخاری کتاب القدر، باب تحاج آدم وموسیٰ عند الله، ۲۱۴/۷۔

۲۵۔ آدم سمائے دُنیا میں

معراج کے موقع پر پیمبر آخر زماں صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات آسمانوں پر جہاں مختلف انبیائے کرام مثلاً حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ وغیرہ سے ہوئی ہے، وہیں آپ کی ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے بھی ہوئی ہے، جیسا کہ معراج کی مختلف حدیثوں سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً بخاری میں مذکور ہے:

فَلَمَّا عَلَوْنَا السَّمَاءَ إِذَا رَجُلٌ عَنْ يَمِيْنِهِ أَسْوِدَةٌ وَعَنْ يَسَارِهِ أَسْوِدَةٌ۔ فَإِذَا نَظَرَ قِبَلَ يَمِيْنِهِ ضَحِكَ، وَإِذَا نَظَرَ قِبَلَ شِمَالِهِ بَكَىٰ۔ فَقَالَ مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَابْنِ الصَّالِحِ۔ قُلْتُ مَنْ هٰذَا يَا جِبْرِيْلُ؟ قَالَ هٰذَا آدَمُ، وَهٰذِهِ الْأَسْوِدَةُ عَنْ يَمِيْنِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ نَسَمُ بَنِيْهِ۔ فَأَهْلُ الْيَمِيْنِ مِنْهُمْ أَهْلُ الْجَنَّةِ، وَالْأَسْوِدَةُ الَّتِيْ عَنْ شِمَالِهِ أَهْلُ النَّارِ۔ فَإِذَا نَظَرَ عَنْ يَمِيْنِهِ ضَحِكَ وَإِذَا نَظَرَ قِبَلَ شِمَالِهِ بَكَىٰ: جب ہم آسمان پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں پر ایک شخص موجود ہے اور اُس کی داہنی جانب متفرق لوگوں کی ایک جماعت موجود ہے اور بائیں جانب بھی ایک جماعت موجود ہے۔ جب وہ اپنی داہنی جانب دیکھتا ہے تو ہنستا ہے اور جب اپنی بائیں جانب دیکھتا ہے تو روتا ہے۔ پھر اُس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کہا کہ خوش آمدید اے نبیٔ صالح اور ابنِ صالح! میں نے کہا کہ اے جبریل یہ کون ہیں؟ تو اُنہوں نے فرمایا کہ یہ آدم ہیں۔ اور یہ جماعتیں اُن کی اولاد کی رُوحیں ہیں۔ داہنی جانب والے جنّتی اور بائیں جانب والے دوزخی۔ اس لئے جب وہ داہنی جانب والوں کو دیکھتے ہیں تو خوش ہو کر ہنستے ہیں اور جب بائیں جانب دیکھتے ہیں تو غمگین ہو کر روتے ہیں۔[۴۴]

اس حدیث سے اس حقیقت پر بخوبی روشنی پڑ جاتی ہے کہ حضرت آدم نہ صرف ایک جلیل القدر مقام و مرتبے پر فائز تھے بلکہ آپ ایک نبی اور رسول بھی تھے۔ کیونکہ معراج کے موقع پر رسولِ اکرم صلعم کی ملاقات معزز رسولوں ہی سے ہوئی ہے، اور ان تمام نے آپ کی سعادتِ معراج پر مرحبا

[۴۴] صحیح بخاری کتاب الانبیاء، باب ۵، ۴/۱۰۶-۱۰۷

اور خوش آمدید کہا۔ لہٰذا آدم کی شخصیت کا انکار ایک جلیل القدر پیغمبر کا انکار ہے۔

۲۶- آدم مہذب ترین انسان

اس لحاظ سے آدمؑ کوئی جنگلی آدمی یا "تحت الانسان" (homo erectus) وغیرہ نہیں ہو سکتا بلکہ وہ نہ صرف مکمل طور پر شائستہ اور مہذب انسان تھا، بلکہ اُس کے ماتحت اُس کی اولاد کا ایک مہذّب اور شائستہ قبیلہ بھی آباد تھا۔ جیسا کہ حسبِ ذیل حدیثِ رسول سے ہُویدا ہوتا ہے، جس میں آپ نے اپنے آبائی حسب و نسب کے اعلیٰ و برتر ہونے کی خصوصیت کا اظہار کرتے ہُوئے فرمایا کہ حضرت آدمؑ سے لے کر آپ کے والدِ مکرّم تک آپ کا پورا سلسلۂ نسب نہایت درجہ شریف والدین سے متعلق رہا ہے اور اس میں کسی قسم کی بدچلنی یا بدفعلی کا کوئی دخل ہرگز نہیں رہا ہے۔

خَرَجْتُ مِنْ نِكَاحٍ ، وَلَمْ اَخْرُجْ مِنْ سِفَاحٍ ، مِنْ لَّدُنْ آدَمَ اِلٰى اَنْ وَلَدَنِي اَبِي وَ اُمِّي ، لَمْ يُصِبْنِي مِنْ سِفَاحِ الْجَاهِلِيَّةِ شَيْءٌ : میرا ظہور آدمؑ سے لے کر میرے والدین کے جنم دینے تک، نکاح کے ذریعہ ہُوا ہے، بے نکاحی کے ذریعہ نہیں۔ جاہلیت کی بدکاری مجھے (میرے نسب کو) ذرا بھی چھُو نہ سکی۔[۴۵]

ایک دوسری حدیث میں ہے، جس سے اس بیان کی مزید تشریح ہوتی ہے:

خَرَجْتُ مِنْ نِكَاحٍ وَلَمْ اَخْرُجْ مِنْ سِفَاحٍ ، مِنْ لَدُنْ آدَمَ حَتّٰى انْتَهَيْتُ اِلٰى اَبِي وَ اُمِّي - فَاَنَا خَيْرُكُمْ نَسَباً وَخَيْرُكُمْ اَباً : مَیں آدم سے نکاح کے ذریعہ نکلا ہُوں، بے نکاحی کے ذریعہ نہیں، یہاں تک کہ میں اپنے ماں باپ تک پہنچا۔ تو میں نسب کے لحاظ سے تُم سے بہتر اور باپ کے لحاظ سے بھی تم سے بہتر ہُوں۔[۴۶]

ظاہر ہے کہ اس قسم کی اعلیٰ روایات کی پابندی کسی غیر مہذب اور جنگلی قبیلے میں ہونی ناممکن ہے۔

---

۴۵ کنز العمال، ۳۹/۱۲، مطبوعہ حیدر آباد، بحوالہ ابنِ عدی و بیہقی، نیز دیکھئے دلائل النبوۃ، مؤلفہ ابونعیم اصبہانی، ص ۲۴، مطبوعہ حیدر آباد۔

۴۶ کنز العمال، ۳۸/۱۲، بحوالہ بیہقی۔

لہٰذا اس حقیقت واقعہ کو تسلیم کئے بغیر چارۂ کار نہیں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا ظہور قدسی خدائی منصوبے کے مطابق ایک خصوصی تخلیق کے ذریعہ عمل میں آیا تھا، جو نظریۂ ارتقا کی کامل تردید ہے۔

۲۷۔ عظمتِ آدم

ان احادیث وروایات سے ثابت ہو گیا کہ حضرت آدم نہ صرف ابوالبشر تھے بلکہ اللہ کے برگزیدہ اور نہایت معزز بندے بھی تھے۔ نیز یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ اس قسم کا اعزاز و اکرام صرف جلیل القدر انبیائے کرام ہی کو مل سکتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ حضرت آدم اہلِ زمین کے لئے خدا کے سب سے پہلے اور جلیل القدر پیغمبر بھی تھے۔ چنانچہ حسبِ ذیل حدیثیں بھی حضرت آدم کے اس اعزاز و اکرام پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالتی ہیں، جو بارگاہِ خداوندی میں آپ کی مقبولیت کی ایک اور روشن دلیل ہے۔ اور ان حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حضرت آدم کے ذریعہ جنّتیوں اور دوزخیوں کو الگ الگ کرائے گا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اس فریضہ کو انجام دینے والا شخص کوئی معمولی درجے کا شخص نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس انتخاب کی وجہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے تمام انسانوں میں سب سے زیادہ عظیم ہوگا۔

يَقُوْلُ اللهُ يَا آدَمُ ! فَيَقُوْلُ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ ۔ فَيُنَادِيْ بِصَوْتٍ، اِنَّ اللهَ يَأْمُرُكَ اَنْ تُخْرِجَ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ بَعْثًا اِلَى النَّارِ : قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اے آدم! تو آپ جواباً عرض کریں گے کہ میں حاضر و مستعد ہوں۔ تو وہ آواز کے ساتھ پکارے گا کہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے تم اپنی اولاد میں سے دوزخ کے لئے ایک جماعت کو نکالو۔[۴۷]

یہ ایک مبہم حدیث ہے، جس کی تفصیل بعض دیگر احادیث سے اس طرح ہوتی ہے :

يَقُوْلُ اللهُ يَا آدَمُ ! فَيَقُوْلُ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِيْ يَدَيْكَ ۔ فَيَقُوْلُ اَخْرِجْ بَعْثَ النَّارِ ۔ قَالَ وَمَا بَعْثُ النَّارِ ؟ قَالَ مِنْ كُلِّ اَلْفٍ تِسْعَمِائَةٍ وَتِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ ۔ فَعِنْدَهٗ يَشِيْبُ الصَّغِيْرُ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَارٰى وَمَا هُمْ بِسُكَارٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللهِ شَدِيْدٌ ۔ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ وَاَيُّنَا ذٰلِكَ الْوَاحِدُ ؟

---

۴۷ بخاری کتاب التوحید، باب ۳۲، ۸/۱۹۵ ۔

قَالَ اَبْشِرُوْا فَاِنَّ مِنْكُمْ رَجُلٌ وَمِنْ يَأْجُوْج وَمَاْجُوْج اَلْفٌ : اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حضرت آدم سے کہے گا اے آدم! تو آپ فرمائیں گے (بار الہا!) مَیں حاضر و مُستعد ہُوں اور آپ خیر کُلّی کے مالک ہیں، ارشاد فرمائیے۔ ارشادِ الٰہی ہوگا دوزخ کی جماعت کو نکالو۔ حضرت آدم عرض کریں گے کہ یہ دوزخ کی جماعت کیا ہے؟ ارشاد ہوگا کہ ہر ایک ہزار میں سے نوسو ننانوے۔ تو اس موقع پر (اس فرمانِ الٰہی کی ہیبت سے گویا کہ) بچہ بوڑھا ہو جائے گا اور حمل والی اپنا حمل گرا دے گی، اور تم لوگوں کو مخمور دیکھوگے، حالانکہ وہ مخمور نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ کے عذاب (کا خوف) شدید ہوگا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ (ہزاروں میں کا) ایک شخص کون ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا کہ بشارت ہو کہ تم میں سے ایک شخص ہوگا اور یاجوج ماجوج کے ایک ہزار۔[۴۸]

اَوَّلُ مَنْ يُّدْعٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ آدَمُ، فَتَرَاىٰ ذُرِّيَّتَهُ۔ فَيُقَالُ هٰذَا اَبُوْكُمْ آدَمُ، فَيَقُوْلُ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ، فَيَقُوْلُ اَخْرِجْ بَعْثَ جَهَنَّمَ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ۔ فَيَقُوْلُ يَارَبِّ كَمْ اُخْرِجُ؟ فَيَقُوْلُ اَخْرِجْ مِنْ كُلِّ مِائَةٍ تِسْعَةٌ وَتِسْعُوْنَ۔ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِذَا اُخِذَ مِنَّا مِنْ كُلِّ مِائَةٍ تِسْعَةٌ وَتِسْعُوْنَ فَمَاذَا يَبْقٰى مِنَّا؟ قَالَ اِنَّ اُمَّتِىْ فِى الْاُمَمِ كَالشَّعْرَةِ الْبَيْضَاءِ فِى الثَّوْرِ الْاَسْوَدِ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں سب سے پہلے جس کو بلایا جائے گا وہ آدم ہوں گے، اور آپ کی ذُرّیت سامنے ہوگی، اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ تمہارے باپ آدم ہیں۔ اُس وقت آدم بول اُٹھیں گے کہ پروردگار میں حاضر ہُوں، ارشاد ہو۔ تب اللہ فرمائے گا کہ اے آدم اپنی اولاد میں سے دوزخ کا گروہ نکالو۔ آپ عرض کریں گے کہ پروردگار کتنے لوگوں کو نکالوں؟ ارشاد ہوگا کہ ہر سو میں سے ننانوے کو نکالو۔ یہ سُن کر صحابۂ کرام عرض کریں گے کہ یا رسول اللہ جب ہم میں سے ننانوے لوگ پکڑے جائیں گے تو پھر باقی کیا رہ جائے گا؟ فرمایا کہ میری اُمت دیگر اُمتوں کے مقابلے میں ایسی ہی ہوگی جیسے کالے بیل میں ایک سفید بال ہوتا ہے۔[۴۹]

۴۸۔ بخاری کتاب الانبیاء، ۴/۱۰۹-۱۱۰، مسلم کتاب الایمان ۳۷۹، ۱/۲۰۱، مسند احمد، ۳/۳۲-۳۳-

۴۹۔ بخاری کتاب الرقاق، باب کیف الحشر، ۷/۱۹۶-

۲۸۔ حضرت آدم کی تخلیق جنّت میں

حضرت آدم کی تخلیق ارتقائی طور پر نہ ہونے کی ایک سب سے بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ آپ کی تخلیق زمین پر نہیں بلکہ سات آسمانوں سے اُوپر جنّت الفردوس میں ہوئی تھی جیسا کہ ایک صحیح حدیث سے اس حقیقت پر اس طرح روشنی پڑتی ہے :

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : لَمَّا صَوَّرَ اللّٰهُ آدَمَ فِي الْجَنَّةِ تَرَكَهُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّتْرُكَهُ . فَجَعَلَ اِبْلِيْسُ يُطِيْفُ بِهٖ ، يَنْظُرُ مَا هُوَ . فَلَمَّا رَآهُ اَجْوَفَ عَرَفَ اَنَّهُ خُلِقَ خَلْقًا لَا يَتَمَالَكُ : رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جب اللہ نے جنّت میں آدم کی صُورت گری کی تو اُن کے کالبد کو کُچھ عرصے تک یُونہیں چھوڑے رکھا۔ تب ابلیس اس کے گرد چکر لگانے اور اس کا جائزہ لینے لگا کہ وہ کیا چیز ہے ؟ جب اُس نے دیکھا کہ پُتلا اندر سے کھوکھلا ہے تو سمجھ گیا کہ یہ ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکے گی۔[۱]

ظاہر ہے کہ جب حضرت آدم کی تخلیق ہماری زمین پر ہُوئی ہی نہیں، تو پھر اب ارتقا کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس سلسلے میں تفصیلی دلائل میں نے ایک دوسری کتاب میں پیش کئے ہیں۔ اور اس میں نہایت درجہ محکم دلائل کی روشنی میں یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت آدم کو جس جنّت میں پیدا کیا گیا تھا وہ کوئی " زمینی باغ " نہیں بلکہ وہ جنّت الفردوس ہی تھی، جس کو جنّت الماویٰ بھی کہا جاتا ہے۔

۲۹۔ رسالتِ محمّدی کا اعجاز

یہ تھا حضرت آدم کے سلسلے میں مختلف حدیثوں کا ایک سرسری جائزہ ۔ ورنہ اس سلسلے میں اور بھی بہت سی مُستند حدیثیں موجود ہیں، جن کے ذریعہ حضرت آدم کا نہ صرف اولین بشر اور اللہ کے مقبول ترین بندے ہونا ثابت ہوتا ہے، بلکہ آپ کی سیرت پر متعدد حیثیتوں سے روشنی پڑتی ہے۔ مگر طوالت کے خوف سے انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس موضوع پر ایک علیحدہ کتاب زیر تصنیف ہے۔

---

[۱] مسلم کتاب البر ۱۱۱، ۲۰۱۶/۴، مطبوعہ ریاض، نیز مُسند احمد بن حنبل، ۲۲۹/۳، مطبوعہ دارالفکر بیروت۔

بہرحال مسلمانوں کے بعض نئے فرقے حدیثِ رسول کا چاہے جتنا بھی انکار کریں، مگر وہ یہ الزام ہرگز نہیں لگا سکتے کہ مختلف اور بے شمار احادیث میں حضرت آدم سے متعلق یہ ساری تفصیلات جو مذکور ہیں، وہ بھی کسی "عجمی سازش" کا نیجہ ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ عہدِ رسالت یا قرونِ اولیٰ میں نظریۂ ارتقا سے متعلق ان مباحث کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا جو آج پیدا ہوئے ہیں یا ہوتے جا رہے ہیں۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک گہری حکمتِ عملی اور پوری منصوبہ بندی ہی کے تحت رب العالمین ہی کی طرف سے قرآن اور حدیث میں اس سلسلے کی ساری تفصیلات پہلے ہی دن درج کر دی گئی تھیں، تاکہ وہ بعد کے ادوار میں آنے والے فکری "طوفانوں" کا بخوبی مقابلہ کر سکیں۔ اس طرح نہ صرف قرآن بلکہ حدیثِ شریف کی عظمت بھی دوبالا ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ایک صداقت ہے اس قولِ رسولؐ کی کہ "جب تک تم قرآن اور حدیث کو مضبوطی سے تھامے رہو گے، کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے"۔

امام باقلانی نے اپنی مشہور کتاب اعجاز القرآن میں "وُجوہِ اعجاز" پر بحث کرتے ہوئے غیبی اخبار کو بھی اس فہرست میں شامل کیا ہے، اور اس سلسلے میں قصۂ آدم کو بھی زیرِ بحث لاکر بتایا ہے کہ یہ اور اس قسم کے عظیم واقعات اور اہم ترین احوال جو تخلیقِ آدم، آپ کی بعثت (دورِ ارضی سے آپ کی باقاعدہ بعثت شروع ہوتی ہے) آپ کا جنّت سے خروج اور توبہ وغیرہ، تو یہ سب قرآن میں ایک معجزانہ انداز میں مذکور ہیں۔ چونکہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اُمّی تھے اور متقدّمین کی کتابوں اور ان کے قصوں سے واقف نہیں تھے، لہٰذا ان غیبی اخبار کا قرآن میں اندراج لامحالہ طور پر آپ کا معجزہ ہے۔"[۵۱]

مگر اس موقع پر قرآن مجید کے ساتھ ساتھ مختلف احادیث میں اس قصّے اور اس کی مختلف کڑیوں کی اس طرح تشریح و توضیح کرنا کہ کہیں بھی اس واقعہ میں کوئی تناقض و تضاد نہ پایا جائے، بلکہ مختلف اشارات و کنایات کے ذریعہ اس میں مزید نکھار پیدا ہوتا اور اُس کا حُسن بڑھتا چلا جائے، یقیناً رسالتِ محمّدی کا ایک بہت بڑا اعجاز اور ایک حیرت انگیز علمی صداقت ہے۔ ظاہر ہے کہ رسالتِ محمّدی کے ۲۳ سالہ عرصے میں رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مختلف معاشرتی، تمدّنی، اجتماعی اور سیاسی احوال و کوائف

۵۱؎ ماخوذ از اعجاز القرآن، ابوبکر محمد بن طیب باقلانی، تحقیق احمد صقر، ص ۴۴، دارالمعارف مصر، طبع ثانی۔

بلکہ متعدد اور بے شمار "ہنگاموں" سے بھی گزرنا پڑا۔ گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمیشہ گوناگوں قسم کے مسائل کے انبار میں گھری رہی۔ اور پھر ۲۳ سال کے عرصے میں تو ہر شخص کے افکار وخیالات میں زمین وآسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔ مگر آفریں ہے اس مردِ صادق (فِداہ اَبی و اُمّی) پر کہ اس قدر گوناگوں مسائل میں گھرے رہنے اور اتنی مدت گزر چکنے کے باوجود اس کے کلام میں اختلاف تو کجا ذرا سا انحراف بھی دکھائی نہیں دیتا۔ مجال ہے جو اس میں کہیں بھی کوئی رخنہ یا شگاف نظر آجائے! کیا یہ رسالتِ محمدیؐ کی صداقت کی دلیل نہیں ہے؟ اس سے بڑی دلیل اور معجزہ بھلا اور کیا ہو سکتا ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اُس کے بیانات کسی بھی طرح تزلزل کا شکار نہ ہو سکیں بلکہ ان کی صداقت وحقانیت دن بدن واضح اور روشن سے روشن تر ہوتی چلی جائے!! اسی بنا پر ارشادِ الٰہی ہے کہ ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری دنیا کے لئے روشن چراغ بنا کر بھیجا گیا ہے:

یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنَاکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا۔ وَ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا: اے نبی ہم نے بلاشبہ آپ کو گواہی دینے والا، خوشخبری سُنانے والا اور متنبہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور اللہ کے حکم سے اُس کی طرف بُلانے والا اور روشن چراغ بھی بنایا ہے۔
(احزاب: ۴۵-۴۶)

دیکھئے ان تمام صفاتِ محمدیؐ اور خصوصاً آپ کے "چراغِ روشن" ہونے کا اثبات مذکورۂ بالا حقائق کی روشنی میں کس طرح ہو رہا ہے! واضح رہے کہ اس موقع پر اُن احادیث سے کوئی بحث نہیں ہے جو عملی زندگی سے متعلق ہیں اور جن کو "فقہی مسائل" کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے مسائل میں یقیناً کافی اختلافات موجود ہیں۔ مگر وہ عملی زندگی سے متعلق ہونے کی بنا پر لوگوں کی سہولت کی غرض سے ہیں۔ اور متعدد حکمتوں کی بنا پر شریعت میں یہ اختلاف محمود ہے مذموم نہیں۔ کیونکہ وہ اُصولی چیزوں میں نہیں بلکہ فروعی اُمور ومسائل میں ہے۔ بہرحال اس موقع پر بحث باطل افکار ونظریات کی تردید کے سلسلے میں فلسفیانہ نقطۂ نظر سے ہے۔ مطلب یہ کہ قرآن اور حدیث یہ اور اس قسم کے غلط اور انحرافی افکار ونظریات کا بھرپور مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اور اس نقطۂ نظر سے ان میں کسی قسم کا اختلاف یا تعارض وتضاد موجود نہیں ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا : کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے ؟ اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی جانب سے ہوتا تو وہ اس میں بہت سا اختلاف پاتے ۔ (نساء : ۸۲)

۳۰۔ آدم کی ابوالبشریت پر مفسرین کا اجماع

ان تمام قطعی نصوص اور واضح بیانات سے یہ بات الم نشرح ہوگئی کہ قرآن اور حدیث دونوں ایک ہی آدم سے واقف ہیں، جو دنیائے انسانیت کا سب سے پہلا فرد یعنی ابوالبشر تھا ۔ قرآن اور حدیث اس کی شخصیت پر متفق اللفظ ہیں کہ وہ ایک تاریخی شخصیت کا حامل تھا، کوئی افسانہ یا واہمہ نہیں تھا ۔

غرض قرآن اور حدیث کی رُو سے حضرت آدم نہ صرف اولین بشر تھے بلکہ خُدا کے ایک برگزیدہ بندے اور بہت بڑے مرتبے والے شخص بھی تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مفسّرین و محدّثین کے نزدیک حضرت آدم کی شخصیت مسلّم ہے اور اس میں کسی قسم کا نزاع یا اشتباہ موجود نہیں ہے ۔ گویا کہ پورا اسلامی لٹریچر آپ کی ابوالبشریت پر متفق ہے، سوائے بعض فلسفہ زدہ لوگوں کے ۔ چنانچہ امام رازی سورۂ حجر کی آیتِ کریمہ (وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ : اور یقیناً ہم نے انسان کو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا ہے جو بسے ہوئے گارے کی تھی ۔ آیت ۲۶) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ مفسّرین کا اس پر اجماع ہے کہ اس سے مُراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں ۔ (والمفسرون اجمعوا علی أن المراد منه هو آدم علیه السلام)۔ [۵۲]

۳۱۔ ایک فلسفیانہ نظریہ اور اُس کا ردّ

اصل میں یہ مسئلہ دورِ قدیم ہی سے فلسفہ کی پیداوار رہا ہے ۔ چنانچہ علامہ ابنِ تیمیہ فلاسفۂ قدیم کے نظریات و خرافات کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ وہ کائنات (افلاک) کی قدامت کے قائل تھے، اور کہتے تھے کہ افلاک کی کوئی ابتدا ہی نہیں ہے ۔ اسی طرح وہ انسان کی ابتدا کے بھی قائل نہیں تھے، جس کا آغاز آدم سے ہوا ہے ۔

---

[۵۲] تفسیر کبیر، ۱۹/۱۷۹، طبع جدید ۔

"..... فلا یقولون: ان اللّٰہ ابتدأ خلق السمٰوٰت والأرض. وکان للبشر ابتداء أولھم آدم"۔[۵۳]

وہ مزید تحریر فرماتے ہیں کہ: ان فلاسفہ کی ہمنوائی میں (فلسفہ زدہ لوگ) اور گمراہ صوفیہ نے بھی، جو مدعیانِ تحقیق تھے، مثلاً ابنِ عربی اور ابنِ سبعین نے وہی آوازیں لگانی شروع کر دیں کہ یہ عالم بذاتِ خود واجب و ازلی ہے، اور وہ بغیر کسی خالق و صانع کے بذاتِ خود موجود ہے۔ نیز یہ کہ "وجود" (کُل مظاہرِ عالم کا) واحد ہے وغیرہ۔

وکذلك من سلك مسلكھم من المدعین للتحقیق من ملاحدۃ الصوفیۃ کابن عربي وابن سبعین، حقیقۃ قولھم أن ھذا العالم موجود واجب أزلي، لیس له صانع غیر نفسه۔ وھم یقولون: الوجود واحد، وحقیقۃ قولھم أنه لیس في الوجود خالق خلق موجوداً آخر۔[۵۴]

"ارسطو اور اُس کے متبعین متاخر فلاسفہ کا نظریہ تھا کہ اجسام (مظاہرِ عالم) اپنے تمام ذات وصفات میں قدیم ہیں۔ فلکیات کے متعلق تو وہ یہ کہتے تھے کہ وہ اپنے تمام مواد، شکلوں اور اعراض سمیت قدیم ہیں، سوائے حرکات اور مشخص ہیئتوں کے۔ اور عُنصریات (عناصر سے مرکب اشیاء) بھی اپنے مواد اور اپنے جسمانی و نوعی صورتوں کے ساتھ قدیم ہیں۔ ہاں البتہ ان دونوں میں مشخص صورتیں اور مخصوص اعراض حادث ہیں"۔[۵۵]

موجودہ سائنسی دور میں اس نظریہ کی لغویت صاف ظاہر ہے، جب کہ جدید سائنسی نظریات کے مطابق ثابت ہے کہ تمام اجرامِ سماوی اور کُل مظاہرِ عالم حادث ہیں۔ مگر قرونِ وسطیٰ میں بعض فلسفہ زدہ لوگوں نے حضرت آدم کی تاریخی شخصیت کو مُشتبہ کرنے کی غرض سے طرح طرح کے نظریات گھڑنے اور نئے نئے

---

[۵۳] فتاویٰ ابنِ تیمیہ، ۱۷/۲۹۴، دارالافتا ریاض۔

[۵۴] ایضاً، ۱۷/۲۹۵

[۵۵] المواقف فی علم الکلام، قاضی عبدالرحمان ایجی، ص ۲۴۴، عالم الکتب بیروت۔

شوشے نکالنے شروع کر دئے۔ چنانچہ امام رازی ان باطل نظریات کا رد کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"قطعی دلائل سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایسے حوادث کا وجود ناممکن ہے، جن کی کوئی ابتدا ہی نہ ہو۔ اس لحاظ سے تمام حوادث کے لئے ایک ایسا حادثہ لازمی ہے جو اول کہلاتا ہو۔ اور اس لحاظ سے تمام انسانوں کی ابتدا ایک انسان سے ہونا لازمی ہے۔ اور اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ بغیر ماں باپ کے محض قدرتِ خداوندی سے پیدا ہوا ہو۔ تو ارشادِ باری (وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ .....) میں اسی انسانِ اول کی تخلیق کی طرف اشارہ ہے۔[۵۶]

۴۲۔ ایک شیعہ روایت اور ابنِ عربی کا ایک مکاشفہ

امام رازی نے تحریر کیا ہے کہ کتبِ شیعہ میں ایک روایت ملتی ہے، جو محمد بن علی باقرؒ کی طرف منسوب ہے کہ: "ہمارے باپ آدم سے پہلے دس لاکھ یا اس سے زیادہ آدم گزر چکے ہیں"۔[۵۷]

اسی طرح ابنِ عربی نے اپنے ایک مکاشفہ کے ذریعہ ایک بے سر و پا دعویٰ کیا ہے کہ دُنیا میں ایک لاکھ آدم گزر چکے ہیں۔ موصوف کے اس مکاشفہ کو مصری عالم فرید وجدی نے "فتوحاتِ مکیہ" کے حوالے سے اس طرح نقل کیا ہے:

"میں نے کعبہ کا طواف کیا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک ایسی قوم کے ساتھ طواف کرنے کا شرف عطا کیا جس کو میں پہلے سے نہیں جانتا تھا۔ پھر میں نے اُن میں سے ایک سے پُوچھا کہ تُم کون ہو؟ اُس نے جواب دیا کہ ہم تمہارے اولین اجداد میں سے ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تم پر کتنا زمانہ گزر چکا ہے؟ کہا کہ چالیس ہزار سال سے کچھ زیادہ۔ میں نے پوچھا کہ آدم کے لئے تو یہ زمانہ قریب نہیں ہے۔ (یعنی دورِ آدم کے لحاظ سے یہ مدت بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔) تو اُس نے کہا کہ تُم کس آدم کی بات کر رہے ہو؟ کیا تمہارے سے اس قریب والے کی یا کسی اور کی؟ یہ سُن کر میں فکرمند ہوگیا اور مجھ پر دہشت طاری ہوگئی۔ پھر مجھے رسول اللہ صلعم کی ایک حدیث یاد آگئی، جس میں مروی ہے کہ اللہ نے ہمارے جانے مانے

---

۵۶ تفسیر کبیر، از امام رازی، ۱۹/۱۶۹

۵۷ ایضاً

آدم سے پہلے ایک لاکھ آدم پیدا کئے ہیں ۔ اور جناب جعفر صادق ؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔"[۵۸]

پھر موصوف نے فتوحاتِ مکیہ ہی میں اس مکاشفہ کی تصدیق ایک دوسرے مکاشفے کے ذریعہ بڑے دلچسپ انداز میں اس طرح کی ہے :

"عالمِ ارواح میں ایک مرتبہ میں نے ادریس علیہ السلام سے ملاقات کی اور اُن سے مذکورۂ بالا کشف اور روایت کی صحت کے بارے میں دریافت کیا ۔ کیونکہ ہر وہ کشف جس کی تائید خبرِ صحیح کے ذریعہ نہ ہوتی ہو ، وہ محقّقین کے نزدیک معتبر نہیں ہو سکتی ۔ تو ادریس علیہ السلام نے فرمایا کہ روایت سچی ہے اور تمہارا مشاہدہ و مکاشفہ بھی سچا ہے ۔"[۵۹]

خواب دلیلِ شرعی نہیں بن سکتا

اُوپر جو صحیح اور مُستند حدیثیں نقل کی جا چکی ہیں ، اُن کے مقابلے میں یقیناً یہ کوئی جعلی اور موضوع روایت ہوگی ، جس کا تذکرہ بغیر کسی حوالے کے کیا گیا ہے ۔ اور اس قسم کی متناقض اور بعید از قیاس روایات "صِحاحِ ستّہ" (حدیث کی چھ مستند کتابوں) میں تو کیا ، احادیث کی دوسرے اور تیسرے درجے کی کتابوں میں بھی نظر نہیں آتیں ۔ پھر ایک مکاشفے کی تصدیق کسی دوسرے مکاشفے کے ذریعہ کرنا اور اس کو "خبرِ صحیح" کا نام دینا ایک غلط اُصول ہے ، جس کی دینی و شرعی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں ہے ۔ واقعات اور وہ بھی تاریخی واقعہ کا ثبوت مکاشفوں سے نہیں ہو سکتا ۔ بالفاظِ دیگر مکاشفوں کو بنیاد بنا کر کوئی نئی تاریخِ عالم مرتب نہیں کی جا سکتی ۔ خوابوں اور مکاشفوں سے اس قسم کا استدلال وہی کر سکتا ہے جو خُود بھی خوابوں کی دُنیا میں رہتا ہو ، یا ان کے ذریعہ لوگوں کا مذہبی جذبات کا استحصال کرنا چاہتا ہو ۔

علامہ ابنِ کثیر اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرتے ہُوئے تحریر کرتے ہیں کہ خوابوں کی حیثیت دلیلِ شرعی کی ہرگز نہیں ہو سکتی ۔ چنانچہ موصوف نے ابنِ عساکر کے حوالے سے ایک صاحب (احمد بن کثیر) کا

---

[۵۸] دائرۃ معارف القرن العشرین ، ۱/۱۲۵ - ۱۲۶ ، دار المعرفۃ بیروت ، ۱۹۷۱ء
[۵۹] ایضاً ، ۱/۱۲۶

ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ اُنہوں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور ہابیل (بن آدمؑ) کو دیکھا' (جن کے بارے میں مشہور ہے کہ دمشق کے شمال میں جَبَل قاسیون کے ایک غار میں قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا' اور اس کو "خون کا غار" بھی کہا جاتا ہے' جیسا کہ اہلِ کتاب کہتے ہیں)۔ تو اُنہوں نے ہابیل کو قسم دے کر پوچھا کہ کیا یہ اُن کا خون ہے؟ تو اُنہوں نے اس بات پر قسم کھائی اور کہا اُنہوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی ہے کہ وہ اس جگہ کو قبولیتِ دُعا سے مشرف کرے، تو اللہ نے اس کو قبول فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (بھی) اس کی تصدیق کی اور فرمایا کہ میں اور ابوبکر و عمر ہر جمعرات کو اس کی زیارت کیا کرتے تھے۔ حافظ ابنِ کثیر اس واقعہ کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ اگر یہ خواب احمد بن کثیر سے صحیح بھی ہو تو اس کے بارے میں کوئی شرعی حکم عائد نہیں ہوتا"[۶۰]

غرض قرآن اور حدیث کے قطعی نصوص اور روشن ترین دلائل کے مقابلے میں خوابوں اور مکاشفوں کو کوئی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ اور علمی اعتبار سے اس قسم کی چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

حافظ ابنِ کثیر نے کعب الاحبار اور ابنِ عدی سے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ جنّت میں سوائے حضرت آدم علیہ السلام کے کسی دوسرے کو اس کی کُنیت سے پکارا نہیں جائے گا۔ چنانچہ آپ کی کُنیت دُنیا میں "ابوالبشر" اور جنّت میں "ابو محمد" ہو گی۔[۶۱]

دیکھیئے اس قسم کی روایات کے ذریعہ کس قدر قطعیت کے ساتھ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ قرآن اور حدیث کے تمام منصوصات آدم نام کی ایک اور صرف ایک ہی متعیّن شخصیت سے واقف ہیں اور ایک فردِ واحد ہی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس کے خلاف کہی جانے والی بات قرآن اور حدیث کے صاف و صریح انکار کے برابر ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جدید اثری تحقیقات کے مطابق hominidae خاندان[۶۲] کی ہر نوع کے

---

[۶۰] البدایہ والنہایہ، ۹۴/۱

[۶۱] ایضاً، ۹۷/۱

[۶۲] تفصیل کے لئے دیکھئے دوسرا باب

"اولین نمائندہ" کو بھی اگر بالفرض "ایک ایک آدم" قرار دے دیا جائے، تب بھی ان مفروضہ "آدموں" کی تعداد دس یا بیس سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ ایک لاکھ یا دس لاکھ کی تعداد تو ناممکن اور محال ہے، جو محض ایک تخیل آفرینی ہے۔

۳۳۔ اہلِ سُنّت کا متفقہ عقیدہ

علامہ عبدالقاہر بغدادی (متوفی ۴۲۹ھ) نے اب سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے جس عقیدہ کو اہلِ سُنّت والجماعت کا متفقہ عقیدہ قرار دیا تھا، وہ آج بھی بلاریب ناقابلِ تردید اور ناقابلِ تزلزل ہے۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں: "اہلِ سُنّت کہتے ہیں کہ دُنیا میں انبیاء بہت سے گزرے ہیں، جن میں سے ۳۱۳ رسول تھے، اور اولین رسول نیز تمام انسانوں کے باپ آدم علیہ السلام اور آخر رسول حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور یہ عقیدہ مجوسیوں کے اس دعوے کے خلاف ہے کہ ان کے نزدیک ابوالبشر کیومرت تھا، جس کا لقب گلشاہ تھا، جس طرح کہ آخری نبی اُن کے نزدیک زردشت تھا۔"

وقالوا: إنّ الانبیاء کثیر، والرسل منھم ثلاثمائة وثلاثة عشر۔ وأول الرسل أبوجمیع البشر وھوآدم علیہ السلام، وآخرھم محمد صلی اللہ علیہ وسلم، علی خلاف قول المجوس فی دعواھم أبوجمیع البشر کیومرت الملقب بکلشاہ۔ وخلاف قولھم: ان آخر الرسل زرادشت۔[۶۳]

موصوف نے یہ اور اس قسم کے دیگر عقائد کو ارکانِ دین میں شامل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی مخالفت کرنے والوں کو جمہور اہل سنّت والجماعت گمراہ قرار دیتے ہیں۔[۶۴]

ابوالبشر کے بارے میں عبدالقاہر نے اُوپر مجوسیوں کے جس اختلاف کا ذکر کیا ہے، اُس کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہُوئے علامہ ابنِ اثیر اپنی تاریخ میں تحریر کرتے ہیں:

"اکثر اہلِ فارس کا دعویٰ ہے کہ کیومرث ہی آدم ہے۔ اور بعض کا دعویٰ ہے کہ وہ آدم کا

---

[۶۳] الفرق بین الفِرق، عبدالقاہر بغدادی، ص ۳۴۲، دارالمعرفۃ بیروت۔

[۶۴] ایضاً، ص ۳۲۳

بیٹا تھا، جو حوا کے بطن سے تھا۔ مگر بعض کے نزدیک کیومرث جو آدم تھا وہ حام بن یافث بن نوح تھا، جو طبرستان کی پہاڑیوں سے نمودار ہوا اور فارس پر قابض ہو گیا۔۔۔۔ اور اُس نے اپنا نام آدم رکھ لیا۔۔۔۔ وہ فارسیوں کا جدِ امجد تھا۔" [65]

علامہ سعد الدین تفتازانی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت آدم نبی اول تھے، اور آپ کی نبوت قرآن مجید، حدیث اور اجماع سے قطعی طور پر ثابت ہے۔ اور اس بنا پر آپ کی نبوت کا انکار بعض لوگوں کے مطابق کفر ہے۔ [66]

۴۔ صُحفِ سماوی اور مؤرخین کا اتفاق

تمام آسمانی صحیفے اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت آدم ہی دُنیا کے سب سے پہلے انسان تھے۔ اس لحاظ سے صرف قرآن اور حدیث ہی نہیں، بلکہ تورات اور انجیل (جن کا مجموعہ آج بائبل کے نام سے موسوم ہے) بھی اس حقیقت واقعہ پر متفق ہیں۔ نیز اس کے علاوہ مؤرخین اور ماہرین انساب کا بھی یہی بیان ہے کہ کُل انسانوں کا نسب حضرت آدم پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور اس لحاظ سے پوری انسانی تاریخ اور اُس کا لٹریچر ابوالبشر حضرت آدم کے علاوہ کسی دوسرے "انسانِ اول" سے واقف نہیں ہیں۔ چنانچہ مشہور مؤرخ علامہ ابنِ خلدون اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

"یہ بات باتفاق علمائے نسب ثابت ہو چکی ہے کہ ابوالبشر (آدمیوں کے باپ) آدم علیہ السلام ہیں۔ اور انہیں کے اولاد کی نسل سے نوح علیہ السلام تک تعمیرِ عالم اور زمین آباد ہوتی رہی، اور ضرورت اور تقاضائے وقت کے لحاظ سے انبیاء مثلاً شیثؑ، ادریسؑ اور ملوک ہوتے رہے۔ جب ان لوگوں میں بُت پرستی، شرک، کُفر اور الحاد حد سے بڑھ گیا تو نوح علیہ السلام کی دُعا رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّاراً (نوح: ۲۶) (ترجمہ: اے پروردگار زمین پر کسی کافر کے گھر کو نہ چھوڑ) سے عالمگیر طوفان آیا اور سوائے اہلِ کشتی کے کوئی

---

۶۵ الکامل فی التاریخ، ۱/۴۵-۴۶، دار صادر بیروت، ۱۹۸۲ء۔
۶۶ شرح عقائد نسفیہ، ص ۱۳۵، مطبوعہ کراچی۔

متنفّس اس جانکاہ عذاب سے جان بر نہ ہوسکا۔ چونکہ کشتی والوں نے نہ تو اپنے بعد کوئی اولاد چھوڑی نہ اُن کے توالد وتناسل کا سلسلہ چلا۔ نتیجۃً تمام اہلِ عالم نوح کی نسل سے ہیں، اور جناب موصوف تمام عالم کے ابوالبشر ثانی ہیں۔ ان کا نسب توریت اور ماہرینِ انساب کے اتفاق سے نوح ابنِ لامک (یا لمک) ابنِ متوشلخ ابنِ خنوخ (یا ابنِ اخنوخ) ابنِ یرو (یا بیرو) ابنِ مہلائیل (یا ماہلائیل) ابنِ قائن (یا قینن) ابنِ انوش ابنِ شیث ابنِ آدم علیہ الصلاۃ والسلام ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان اسماء میں اختلاف اس وجہ سے ہُوا ہے کہ اہلِ عرب نے اسمائے مذکورہ کو اہلِ توریت سے لیا ہے۔ اور یہ امر ظاہر ہے کہ اہلِ توریت کے مخارجِ حروف اور اہلِ عرب کے مخارجِ حروف میں بہت بڑا فرق ہے۔" [۶۷]

۳۵۔ تورات کی گواہی

جیسا کہ عرض کیا جا چکا صحفِ سماوی حضرت آدم کی ابوالبشریت پر متفق اللفظ ہیں۔ چنانچہ تورات یا موجودہ بائبل کے عہد نامۂ عتیق Old Testament کے مطابق اللہ نے زمین، آسمان، چاند، سُورج، ستارے، ہوا، پانی، پرندے، دریائی وصحرائی جانور، مویشی اور کیڑے مکوڑے وغیرہ سب کچھ پیدا کرنے کے بعد انسان یعنی آدم کو پیدا کیا۔

"اور خُدا نے انسان کو اپنی صُورت پر پیدا کیا۔" [۶۸]

غرض کتابِ پیدائش کے شروع کے چند ابواب میں حضرت آدم کا تذکرہ (آپ کے نام کی صراحت کے ساتھ) اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ ہی دُنیائے بشریت کے اولین نمائندے ہیں۔ اور آدم کو مٹی سے پیدا کرنے کا بیان بھی قرآن اور بائبل میں مشترک ہے۔ مگر اس سلسلے میں جو دقیق اور نازک تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں وہ بائبل میں مفقود ہیں۔

عیسائی اسکالروں کے بیان کے مطابق: "آدم کا تذکرہ عہد نامۂ قدیم میں پانچ سو سے زیادہ بار آیا ہے۔ اور ان مواقع پر جس طرح یہ لفظ نوعِ انسانی کے معنی میں آیا ہے، اسی طرح وہ

---

[۶۷] تاریخ ابنِ خلدون قبل از اسلام، حصہ اول، ص ۳۱، مطبوعہ کراچی۔

[۶۸] کتاب پیدائش، ۱ : ۲۷

ایک متعین و مخصوص نام (اسمِ خاص) کے طور پر بھی آیا ہے "۔

In the OT the word Adam is used more than 500 times in the sense of mankind as well as in the sense of a proper name.[69]

۳۶ ۔ اناجیل کی شہادت

عہد نامۂ جدید New Testament میں بھی آدم کا تذکرہ متعدد جگہوں پر آیا ہے ۔ اور بعض مواقع پر آدم کو " پہلا انسان " قرار دیا گیا ہے :

"چنانچہ لکھا ہے کہ پہلا آدمی یعنی آدم زندہ نفس بنا ......" [۷۰]

"کیونکہ پہلے آدم بنایا گیا اور اُس کے بعد حوا "۔ [۷۱]

اسی طرح عہد نامۂ جدید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے "ابنِ آدم" اور "دوسرا آدم" کے طور پر دو اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں ۔ ان دونوں کے مفہوم و مدعا پر تھوڑی سی روشنی پچھلے صفحات میں ڈالی جا چکی ہے اور بتایا جا چکا ہے کہ جس طرح آپ کے ابنِ آدم ہونے کے اعتبار سے آپ کی اُلوہیت کی نفی ہوتی ہے ، اسی طرح دوسرا آدم یا پچھلا آدم ہونے کے اعتبار سے حضرت آدم کی ابوالبشریت کا اثبات ہوتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ آپ کو یہ لقب آپ کی انوکھی پیدائش کی وجہ سے ملا ہوگا ۔ بہر حال دیکھئے عہد نامۂ جدید میں یہ بیان کس طرح آیا ہے :

"چنانچہ لکھا بھی ہے کہ پہلا آدمی یعنی آدم زندہ نفس بنا ۔ پچھلا آدم زندگی بخشنے والی رُوح بنا "۔ [۷۲]

---

69. The wycliffe Bible Encyclopaedia, V.1, P.24, Moody Press Chicago, 1982.

[۷۰] ۱ ۔ کرنتھیون ۱۵ : ۴۵

[۷۱] ۱ ۔ تمیتھیس ۲ : ۱۳-۱۴

[۷۲] ۱ ۔ کرنتھیون ۱۵ : ۴۵

اب رہی "ابنِ آدم" کی اصطلاح، تو اس کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

"مگر ابنِ آدم کے لئے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں"۔ [۷۳]

"اُس نے جواب میں کہا کہ اچھے بیج کا بونے والا ابنِ آدم ہے"۔ [۷۴]

"بلکہ اُسے عدالت کرنے کا بھی اختیار بخشا، اس لئے کہ وہ آدم زاد ہے"۔ [۷۵]

۲۷۔ انجیل برنباس کا قولِ فیصل

اور انجیل برنباس میں حضرت آدم کو اولین انسان قرار دیتے ہُوئے اس کی حقیقت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

"تحقیق جب کہ آدم پہلے انسان نے شیطان سے دھوکا کھا کر وہ کھانا کھالیا جس سے اللہ نے اُس کو فردوس میں منع کیا تھا"۔ [۷۶]

Adam the first man having eaten, by fraud of Satan, the food forbidden of God in paradise.[77]

۲۸۔ تصوّرِ آدم قدیم قبائل میں

یہ صُحفِ سماوی کی تعلیم ہی کا نتیجہ تھا کہ آدم و حوا کے تصوّر سے دُنیا کا بیشتر لٹریچر متاثر نظر آتا ہے۔ اور قدیم ترین قبائل، حتیٰ کہ غاروں میں رہنے والے بھی اس عقیدہ و تصوّر سے مانوس دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ "مکتوباتِ بحرِمیّت" Dead sea scrolls سے جن کا انکشاف ۱۹۴۷ء میں (چند غاروں میں) ہُوا، ظاہر ہوتا ہے کہ قمران Qumran نامی ایک باطنی یا غناسطی gnostic فرقہ پہلی صدی عیسوی تک پایا جاتا تھا۔ یہ ایک قدیم مسیحی فرقہ تھا، جس کا مسکن وہ

---

[۷۳] متی ۸: ۲۰ (کتاب مقدس یعنی پُرانا اور نیا عہد نامہ، برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی، لاہور، ۱۹۲۲ء)

[۷۴] متی ۱۳: ۳۷

[۷۵] یوحنا ۵: ۲۷

[۷۶] فصل ۲۳: ۳، مطبوعہ حمیدیہ پریس لاہور، ۱۹۱۶ء

77. The Gospel of Barnabas, P.26, Oxford, 1907, Reprinted in Karachi, 1980.

غار تھے جو بحرِ میّت کے قریب واقع تھے۔ ان مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فرقہ یہودی عقائد وتعلیمات سے متاثر تھا۔ اگرچہ اس فرقے میں آزاد خیالی اور جنسی اعتبار سے بے راہ روی پائی جاتی تھی، مگر وہ آدم وحوا اور ابلیس وقابیل وغیرہ کے تصوّرات سے واقف تھا۔ اور ان تصورات کی بنیاد پر اُس نے اپنا ایک الگ فلسفۂ حیات (باطنیت) گڑھ لیا تھا:

"چند باطنی افراد بے قید چال چلن کے عادی تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ایسے "موتی" ہیں جو ظاہری کیچڑ سے ناپاک نہیں ہوسکتے۔ مثال کے طور پر کارپوریٹس Corpocrates اپنے ماننے والوں کو گُناہ پر اُبھارتا تھا۔ اور اس کا بیٹا epihanes اس بات کی تعلیم دیتا تھا کہ آزاد جنسی تعلق خُدائی قانون کے مُطابق ہے۔ قابیل کے پیرو قابیل اور عہد نامۂ قدیم میں مذکور دوسرے بدمعاشوں کی عزّت افزائی کرتے تھے، اور اوفائٹس (دوسری صدی عیسوی کا ایک باطنی فرقہ[۷۷]) سانپ کی تعظیم اس بنا پر کرتے تھے کہ سانپ نے آدم وحوا پر "علم" آشکارا کیا تھا۔"[۷۸]

چنانچہ ان بگڑے ہوئے افکار وخیالات میں بھی بعض "حقائق" کی جھلک نظر آتی ہے۔

۳۹۔ ایک اَدبی ولِسانی ثبُوت

حضرت آدم کی اوّلیت اس حیثیت سے بھی مسلّم ہے کہ کسی بھی انسان یا بشری نمائندے کو آدم کی طرف منسوب کرتے ہوئے "آدم زاد" یا "آدمی" کہا جاتا ہے۔ اور لفظ آدمی عربی کے علاوہ فارسی اور اُردو لٹریچر میں بھی ایک معروف طریقۂ استعمال ہے، جو اوّلیتِ آدم کا ایک اور لٹریری ثبوت ہے۔ چنانچہ بعض احادیث میں لفظ "آدمی" انسان کے معنی میں استعمال ہُوا ہے مثلاً:

مَنْ غَرَسَ غَرْساً، لَمْ يَأْكُلْ مِنْهُ آدَمِيٌّ وَلَا خَلْقٌ مِنْ خَلْقِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ إِلَّا كَانَ لَهُ صَدَقَةٌ: جس نے کوئی پودا لگایا، تو اُس کا پھل جو بھی آدمی یا اللہ کی کوئی مخلوق کھائے گی، وہ اُس کے لئے صدقۂ (جاریہ) ہوگا۔[۷۹]

۷۷۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (خورد) ۷/۵۵۰

78. The History of Christianity (A Lion Hand Book), P.98, 1982.

۷۹۔ مُسند احمد بن حنبل، ۶/۴۴۴

مَامَلَا آدَمِیٌّ وِعَاءً شَرّاً مِنْ بَطْنٍ ۔ بِحَسْبِ ابْنِ آدَمَ آکْلَاتٌ یُقِمْنَ صُلْبَهٗ : کسی آدمی نے پیٹ سے زیادہ کوئی دوسرا بُرا برتن نہیں بھرا۔ ابنِ آدم کے لئے تو چند لقمے کافی ہیں، جو اُس کی پیٹھ کو سیدھا رکھ سکیں۔[۸۰]

۴۰ - آدم عالمی لٹریچر میں

بات یہاں پر صرف عربی و فارسی ادب ہی کے اعتبار سے نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مغربی ادب اور دنیا کی بہت سی اور بڑی بڑی زبانیں بھی "آدم" سے آشنا نظر آتی ہیں اور ٹھیک اُسی معنی میں اُس کا استعمال کرتی ہیں، جس معنی میں وہ عربی زبان میں مستعمل نظر آتا ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ سب آسمانی کتابوں کی تعلیم ہی کا نتیجہ ہوگا کہ آدم وحوا کے تصوّر سے دُنیا کے لٹریچر کا ایک خاصا حصہ متاثر نظر آتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی تصریح کے مطابق " انگریزی ادب اور دیگر زبانوں میں آدم وحوا Adam and Eve کے الفاظ انجیل اور تورات کی وساطت سے پہنچے ہیں "[۸۱]

اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی صراحت کے مطابق عبرانی زبان میں بھی لفظِ آدم انسان کے مترادف اور اُس کا ہم معنی قرار دیا گیا ہے :

> Adam (adham) one of the several Hebrew words meaning "man", is generally used in a collective sense to designate the human species.[82]

اسی طرح آکسفورڈ السٹریٹڈ ڈکشنری میں بھی عبرانی روایات کے حوالے سے آدم کو پہلا انسان قرار دیتے ہوئے اس لفظ کا ایک مشتق Adamite بھی (بطور نسبت) مذکور ہے، جس کے حسب ذیل معانی بیان کئے گئے ہیں :

child of Adam ——— آدم زاد

human being ——— انسان، آدمی

۸۰؎ جامع ترمذی، ابواب الزہد، حدیث ۲۳۸۰، جلد ۴، ص ۵۹۰

۸۱؎ اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ۲۲/۱، پہلا ایڈیشن، لاہور، ۱۹۶۴ء

۸۲؎ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (خورد) ۴۷/۱، ۱۹۸۳ء

ننگا آدمی۸۳ ——— unclothed man

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مطابق عبرانی کے علاوہ فینقی اور سبائی زبانوں میں بھی لفظ آدم بمعنی آدمی اور جنس بشر آیا ہے۔ اور آرامی میں (عبرانی کلمۂ مذکر) بمعنی آدم Adam اور بشر man ہے۔۸۴

اس کے علاوہ "آدم" سے مراد کسی فن کا موجد، قبیلہ یا قوم کا بڑا سردار اور مورثِ اعلیٰ بھی ہوتا ہے۔ جیسے "ولی دکھنی اردو شاعری کا باوا آدم ہے"۔۸۵

آدم وحوا کا ڈرامہ

اسی طرح انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں کے ڈرامائی ادب میں جو روایاتی قصّے کہانیاں مذکور ہیں اور جن کو ڈراموں کے ذریعہ اکثر وبیشتر اسٹیج بھی کیا جاتا ہے، تاکہ ان کی یاد قومی اور مذہبی واقعات کی حیثیت سے تازہ ہوتی رہے، ان میں ایک آدم وحوا کا ڈرامہ بھی ہے۔ چنانچہ انگریزی میں (قرونِ وسطیٰ میں) ڈرامائی ادب اور ڈرامے ابتدا ہی سے دینی جذبات وعواطف کے ترجمان رہے ہیں، جن کے ذریعہ تورات وانجیل کے واقعات کو اسٹیج کیا جاتا رہا ہے۔ اور یہ ڈرامے زیادہ تر یونانی اور رومی حکایات وروایات پر مبنی نظر آتے ہیں۔۸۶

ڈاکٹر عدنان محمد اس سلسلے میں مزید تحریر کرتے ہیں کہ آدم کا قصہ بہت سی قوموں کے ادب میں ایک حکایت، یا ایک ڈرامے یا ایک شعری قصیدے کی حیثیت سے رائج ہے۔ اور ان کتبِ ادب میں مذکور قصۂ آدم پر بحث وگفتگو کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں۔ بعض ڈراموں میں یہ قصہ تخلیق سے لے کر خروجِ جنت تک مکمل طور پر مذکور ہے۔ اور بعض میں مختصراً صرف آدم وحوا کی تخلیق اور ابلیس کے سجدہ

---

۸۳ دی آکسفورڈ السٹریٹڈ ڈکشنری، ۱۹۸۲ء

۸۴ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، ۱/۲۲

۸۵ ایضاً

۸۶ مطالعات فی الأدب المقارن، ڈاکٹر عدنان محمد وزان، ص ۱۰۳، جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ، ۱۴۰۳ھ
بحوالہ: Allardyce Nicoll, British Drama, PP.2-13.

کرنے سے انکار ہی کا ذکر ہے۔ چنانچہ جرمن ادب میں آدم کا قصہ جو خروجِ جنت سے متعلق ہے، چار ہزار اشعار کی شکل میں آدم کی کہانی Adam's legend کے نام سے موسوم ہے، جس میں آدم کا جنت سے نکلنا، اور اپنے گناہ کی معافی طلب کرتے ہوئے توبہ کرنا، اور اللہ کا معاف کر دینا، اس طور پر کہ اُس نے آدم کو زیتون کی ایک شاخ بطورِ تحفہ دی، جو اس بات کی علامت تھی کہ آپ کی ذُریت میں مسیح علیہ السلام کو مبعوث کیا جائے گا۔[۸۷]

نیز موصوف بیان کرتے ہیں کہ قصۂ آدم سے متعلق انگریزی میں متعدد ڈرامے موجود ہیں، جن میں سے ایک "تخلیقِ آدم و حوا" the creation of Adam and Eve کے نام سے اور دوسرا "ھبوطِ انسان" the fall of man کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ دونوں قرونِ وسطیٰ میں دینی ڈراموں کے ضمن میں ظاہر ہوئے تھے۔ چنانچہ پہلا ڈرامہ یہ تصوّر پیش کرتا ہے کہ زمین و آسمانوں کی تخلیق چھ دنوں میں کس طرح عمل میں آئی، اور زمین انسان اور اُس کی خلافت کے لئے کس طرح بنائی گئی! پھر اس میں اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ انسان کی تخلیق مٹی سے کرنے سے مقصود اللہ کی عبادت ہے۔ نیز یہ کہ انسان کی تخلیق مٹی سے کرنا اللہ کے لئے زمین و آسمانوں کی تخلیق سے زیادہ آسان ہے......[۸۸]

اب رہا دوسرا ڈرامہ تو یہ ملائکہ کا آدم کو سجدہ کرنے سے متعلق ہے کہ ابلیس نے کس طرح تکبر کرتے ہوئے مٹی سے بنی ہوئی ایک مخلوق کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، جو غضبِ الٰہی کا باعث بنا اور اس بنا پر وہ رحمتِ خداوندی سے محروم ہوا۔ اس حکم نے ابلیس کی عداوت کو بھڑکا دیا اور وہ آدم کی ذُریت کو بہکانے کے درپے ہوا......[۸۹]

---

[۸۷] مطالعات فی الادب المقارن، ص ۱۰۶، بحوالہ: Henry and Mary Garland, The Oxford Companion to German Literature, P.6.

[۸۸] ایضاً بحوالہ: A. C. Cawley, everyman and Medieval Miracle plays, "the Creation of Adam and Eve", P.13.

[۸۹] ایضاً ص ۱۰۷

ظاہر ہے کہ عالمی لٹریچر میں آدم و حوا کے اس قصّہ کی اس قدر پذیرائی اور اُس کی یہ شہرت و مقبولیت بِلا وجہ یا اُسطوری و خرافاتی حیثیت سے نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ ایک حقیقت واقعہ ہے، جس کے پیچھے وحی الٰہی کی قوت و طاقت کارفرما نظر آتی ہے، اور جس کی وجہ سے یہ تصوّر تمام انسانی طبقات کے دل و دماغ پر پوری طرح چھایا ہُوا سا لگتا ہے۔ گویا کہ نوعِ انسانی کے انگ انگ میں تصورِ آدم رچ بس گیا ہے۔

الحمدللہ اس موقع پر چالیس دلائل پورے ہو چکے ہیں۔ اور ان دلائل و براہین سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے اولین بشر ہونے کا انکار اسلام کے ایک بنیادی عقیدے، ہی کا انکار نہیں، بلکہ تمام کتبِ سماویہ اور کُل تاریخی، لسانی اور ادبی مُسلّمات کا بھی انکار ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان صاف و صریح حقائق کی روشنی میں حضرت آدم کی شخصیت ہم کو بہت سی تاریخی شخصیتوں سے بھی بڑھ کر قطعی و یقینی نظر آتی ہے۔ اور اس اعتبار سے آدم کا انکار بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی دہلی یا کراچی یا قاہرہ اور لندن وغیرہ کے وجود سے انکار کر دے۔

بائبل اور قرآن کا ایک فرق

اس موقع پر ضمناً ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اسلام نے آدم کے مرتبے کو بہت بڑھایا ہے، جیسا کہ پچھلے بیانات سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ آپ نہ صرف اللہ کے ایک معزز بندے تھے، بلکہ ایک جلیل القدر نبی اور دُنیا کے سب سے پہلے رسول بھی تھے اور جنّت سے آپ کا اخراج محض آپ کی ایک "اجتہادی غلطی" کی بنا پر تھا، اور فوری توبہ کی وجہ سے آپ کو پوری طرح معاف کر دیا گیا۔ پھر آپ کو آپ کی اولاد کے لئے زمین پر پہلا رسول بنایا گیا۔ اور اس طرح آپ کے ذریعہ نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری ہُوا۔ مگر اس کے برعکس تورات (موجودہ بائبل) نے آدم کے مرتبے کو بہت گھٹا کر پیش کیا ہے، جو آدم کی توہین ہے۔ ذرا آپ قرآن اور بائبل کے بیانات کا تقابل کر کے دیکھئے تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی۔
چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ کہ بائبل میں آدم کو دُنیا کی تمام چیزوں کا علم عطا کرنے اور فرشتوں کے

ذریعہ آپ کو سجدہ کرانے کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے، جس سے مرتبۂ آدم ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہ بیان قرآن مجید میں آیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس مذکور ہے کہ آدم کو زمین پر کھیتی کرنے کے لئے پیدا کیا گیا تھا[۹۰]۔ تخلیقِ آدم کا یہ مقصد کس قدر حقیر ہے! اسی طرح بائبل میں آپ کی نبوت و رسالت اور آپ کے اعزاز و اکرام کا بھی سرے سے کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس چند غلط اور محرّف شدہ اُمور بھی مذکور ہیں، جن میں سے ایک جنّت میں آدم و حوا کے ننگے رہنے کا تذکرہ ہے[۹۱] جو قرآن کے خلاف ہے۔ اور دوسرے شیطان کے بجائے سانپ کا ذکر آیا ہے[۹۲]۔ اور تیسرے یہ کہ خدائے تعالیٰ کو اس قصّے میں ایک انسان کے روپ میں دکھایا گیا ہے، جو بالکل ایک انسان ہی کی طرح باغ میں پھرتا ہے[۹۳]۔ اور اسے آدم کے احوال کا بذاتِ خود کوئی علم نہیں ہے[۹۴]۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ آدم جیسی خود اپنی ہی پیدا کردہ مخلوق سے خوف یا حسد بھی محسوس کرتا ہے۔ دیکھئے یہ بیان کس طرح آیا ہے:

"اور خُداوند خُدا نے کہا، دیکھو، کہ انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اور اب ایسا نہ ہو کہ اپنا ہاتھ بڑھائے۔ اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے۔ اور کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لئے خداوند خُدا نے اُس کو باغِ عدن سے باہر کر دیا تاکہ زمین کی جس سے وہ لیا گیا تھا کھیتی کرے۔ چنانچہ اُس نے آدم کو نکال دیا۔ اور باغِ عدن کی پورب کی طرف کروبیوں کو چمکتی تلوار کے ساتھ جو چاروں طرف پھرتی تھی مقرر کیا کہ درختِ حیات کی نگہبانی کریں۔"[۹۵]

سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا یہ ایک قادرِ مطلق ہستی کا تذکرہ ہے یا مُشرکوں کے کسی "دیوتا" کا! ظاہر ہے کہ اس قسم کے بیانات جعلی اور محرّف شدہ ہیں، جو خُدائے قدّوس پر ایک بہتان معلوم

۹۰؎ کتاب پیدائش ۲ : ۶

۹۱؎ ایضاً ۲ : ۲۵

۹۲؎ ایضاً ۳ : ۱ ـ ۴

۹۳؎ ایضاً ۳ : ۸

۹۴؎ ایضاً ۳ : ۹ ـ ۱۱

۹۵؎ ایضاً ۳ : ۲۲ ـ ۲۴

ہوتے ہیں۔ اور تورات میں اس قسم کی بہت سی بے بنیاد باتیں مذکور ہیں۔

غرض تورات نے حضرت آدم علیہ السلام کی شخصیت کو جس قدر بگاڑ کر پیش کیا ہے، اس سے عیسائیوں نے خوب فائدہ اُٹھایا اور یہ عقیدہ گڑھ لیا کہ آدم نے اپنے اس "گناہ" کی بدولت پوری نوعِ انسانی کو "گنہگار" بنا دیا ہے۔ اور یہ ایک "گناہِ اصلی" original sin کی حیثیت سے تمام انسانوں کی فطرت میں سرایت کر چکا ہے۔ پھر انہوں نے نہایت درجہ چالاکی کے ساتھ ایک دوسرا عقیدہ ایجاد کیا کہ انسانوں کو اپنے اس "موروثی" گناہ سے بچنے کے لئے حضرت عیسیٰ پر ایمان لانا ضروری ہوگا۔ کیونکہ عیسیٰ نے صلیب پر چڑھ کر تمام انسانوں کے گناہ دھولئے ہیں۔ اس کو ان کی اصطلاح میں "عقیدۂ فدیہ" کہا جاتا ہے۔

عیسائیت کی تردید

عیسائیوں کے ان خود ساختہ عقائد کی بنیاد اس باطل تصوّر پر ہے کہ حضرت آدم نے نہ تو توبہ کی اور نہ ان کا گناہ ہی معاف ہُوا۔ کیونکہ تورات آدم کی توبہ اور اُس کی قبولیت کے ذکر سے بھی خالی ہے۔ اور اس اعتبار سے بھی اُس کا یہ ایک بہت بڑا نقص ہے، جس کے باعث عیسائیوں کو اپنی مرضی کے مطابق ان واقعات کی تشریح کرنے اور نوعِ انسانی کو گمراہ کرنے کا موقع مل گیا۔ حالانکہ تورات "گناہِ آدم" کے "گناہِ اصلی" ہونے کے ذکر سے خالی ہے۔ تورات وانجیل کے اسی قسم کے نقائص کی تصحیح اور آسمانی کتابوں کی تکمیل کی غرض سے قرآنِ مجید نازل کیا گیا ہے، جس میں ہر چیز کا واضح اور دوٹوک بیان موجود ہے۔ اور پھر احادیثِ رسول کے ذریعہ اس کی مزید تشریح وتفسیر مختلف اسالیب میں اس طرح کی گئی ہے کہ نوعِ انسانی کو کہیں بھی بھٹکنے اور گمراہ ہونے کا موقع ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ اسی بنا پر اُمتِ اسلامیہ کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ گمراہی سے بچنے کے لئے قرآن اور حدیث کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہیں۔

بہرحال تورات کے ان بیانات کے برعکس اُوپر مذکور انگریزی اور جرمن ادب کے ڈراموں کے ملاحظہ سے حیرت ہوتی ہے کہ فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنے، ابلیس کے سجدہ سے انکار اور سب سے

بڑھ کر آدم کی توبہ اور اُس کی قبولیت وغیرہ کے تذکرے کہاں سے آگئے جو قرآن اور اسلامی روایات کے عین مطابق ہیں؟ معلوم نہیں کہ مغربی اقوام میں یہ تصوّرات کب اور کن ذرائع سے پہنچے؟ اگر ڈاکٹر عدنان محمد اس مسئلے پر بھی کچھ روشنی ڈالتے تو بہتر تھا۔ مگر یہ تو صاف ظاہر ہے کہ یہ سب اسلامی تعلیمات ہی کا اثر ہو سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی توبہ اور اُس کی قبولیت کے اعتراف کے بعد عیسائیت کی جڑ بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آدم کی ایک اجتہادی غلطی کو تمام انسانوں کے لئے گناہِ اصلی قرار دینا مبالغہ آرائی کی انتہا ہے۔ اس قصے میں اس قسم کا کوئی تصوّر یا ایسی کوئی بنیاد حقیقتاً موجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ محض ایک تخیّل اور باطل قیاس و مفروضہ ہے جو دیگر واضح ربّانی ہدایات وارشادات کے بالکل خلاف ہے۔ مگر تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

آدم و حوا کی حیات پر مختلف مغربی زبانوں میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے ایک اہم کتاب لاطینی زبان میں "حیاتِ آدم و حوا" Life of Adam and Eve کے نام سے ہے۔ اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے اس کے حوالے سے اس حقیقت کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

"جو مذہبی پیغام اس داستان میں ملتا ہے، اس میں آدم و حوا کے جنّت سے نکال دیئے جانے کے بعد ان دونوں کی ندامت و توبہ کا پہلو بھی شامل ہے۔ اور ان کی موت کے بیان میں گناہِ اصلی کے تصوّر کا کوئی سراغ نہیں ملتا، جو کہ بعد کے عیسائی عقائد کے لئے بہت اہم تصوّر تھا۔"

The religious message in the story involves the repentance of Adam and Eve after their expulsion from paradise, and the description of their deaths does not show any traces of the idea of original sin, which was important in later Christian theology.[96]

اس بحث سے یہ حقیقت بخوبی ثابت ہو گئی کہ عیسائی عقائد کی بنیاد شرعی دلائل یا بائبل کے "نصوص" پر مبنی نہیں، بلکہ وہ عقلی قیاسات و مفروضات کی بنیاد پر قائم ہیں، جو

---

۹۶ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ۹۳۶/۲، ۱۹۸۳ء

عقلِ صحیح اور فکرِ صحیح کا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں رکھتے۔ نیز اس بحث سے یہ بھی بخوبی ثابت ہوگیا کہ اسلام اپنے دعوے کے مطابق ہر دور میں اپنے متبعین کی صحیح صحیح ہدایت و رہنمائی کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ جس طرح کہ یہ حقیقت بھی عیاں ہوگئی کہ بائبل اور عیسائیت موجودہ دور میں انسان کی صحیح رہنمائی کرنے سے قاصر ہیں۔ مگر اس کے باوجود عیسائیوں کا یہ دعویٰ بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ قرآن بائبل سے ماخوذ ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ !

کتابِ ہدایت اور ربّانی دلائل

یہ تھی نظریۂ ارتقا کی کہانی اور تخلیقِ انسان کی داستان اور اس سلسلے کے خدائی آیات ونشانات، یا فطرت وشریعت کے حقائق ومعارف اور ان دونوں کی تطبیق وہمنوائی۔ نیز عیسائیوں کی غلط بیانیوں کا ایک جائزہ، جس میں ایک چشمِ بینا کے لئے کافی اسباق وبصائر موجود ہیں۔ ایک مسلمان کے لئے تو قرآن اور حدیث ہی اصل ماخذ اور آخری سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے لئے قرآن اور حدیث سے بڑھ کر اور کوئی دلیل نہیں ہوسکتی۔ ظاہر ہے کہ قرآنِ حکیم کی شہادت سے بڑھ کر ادیانِ عالم اور دُنیا کے پورے لٹریچر میں، کوئی دوسری شہادت جو صحیح و برحق اور محفوظ ترین ہو، موجود نہیں ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان کے لئے اول وآخر سب سے بڑی اور قطعی شہادت خدائے علیم وخبیر ہی کی ہوسکتی ہے، جس کی نظروں سے ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اور عالمِ مادہ کا کوئی ذرہ تک اُس کی نظروں سے اُوجھل نہیں ہوسکتا۔

اس لحاظ سے چونکہ خدائے لم یزل تمام مظاہرِ عالم اور کُل انواعِ حیات کا خالق، ناظم، مُدبّر اور نگرانِ اعلیٰ ہے، لہٰذا وہی ہر چیز کا صحیح علم رکھنے والا اور علّام الغیوب ہے۔ اور اس لحاظ سے اُسی کی شہادت سب سے زیادہ صحیح اور معتبر ہے۔ اور اس کے مقابلے میں وہ تمام قیاسات و مفروضات جو اس صحیح اور معتبر شہادتِ علمی سے متصادم ہوں، وہ خام اور نامعتبر ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں خود ارشادِ الٰہی ہے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ

الرَّحِیْمُ : وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہ عالَم غیب اور عالَم شہادت کی تمام باتوں سے واقف ہے، اور وہ بڑا مہربان اور نہایت شفقت والا ہے۔ (حشر : ۲۲)

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ : لیکن اللہ اس کلام پر شاہد ہے جو تم پر اُتارا گیا ہے، یہ کلام اُس نے اپنے علم (ازلی) ہی کی بنیاد پر اُتارا ہے۔ (نساء : ۱۶۶)

ظاہر ہے کہ اس علمِ ازلی کا پرتو ہونے ہی کی بنا پر قرآنِ مجید کتاب ہدایت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور اسی بنا پر ارشادِ الٰہی ہے :

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا : یہ قرآن یقیناً وہ راہ دِکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے، اور اُن لوگوں کو خوشخبری سناتا ہے جو ایمان والے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں، کہ ان کے لئے بڑا اجر ہے۔ (بنی اسرائیل : ۹)

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ : (اے محمدؐ) ہم نے تجھ پر کھلی کھلی آیتیں نازل کر دی ہیں، جن کا انکار بدکردار لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ (بقرہ : ۹۹)

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ : یہ اللہ کی آیات ہیں، جو ہم آپ کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ تو یہ لوگ اللہ اور اُس کی آیات کے بعد آخر کس چیز پر ایمان لائیں گے؟ (جاثیہ : ۶)

اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ چودہ سو سال سے آج تک قرآنِ عظیم کا کوئی بھی دعویٰ موجودہ ہمہ گیر علمی ترقیوں کے باوجود غلط ثابت نہیں ہو سکا اور عصرِ جدید، باوجود اپنی کوششِ بسیار کے اُس کے کسی بھی بیان کو اب تک جھٹلا نہیں سکا، جبکہ چودہ سو سال کے عرصے میں افکار و نظریات کی دُنیا ہی بدل گئی اور مختلف فلسفوں کا تیا پانچا ہو کر رہ گیا۔ لہٰذا یہ بھی اس بات کا یقینی اور ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ یہ کلامِ عظیم اُسی عظیم اور پُر جلال ہستی کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، جو مظاہرِ عالم کے تمام احوال و کوائف اور اُن کے رگ و ریشے سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے۔ ورنہ اس قدر لازوال سچائیوں کا مظاہرہ ناممکن ہے۔

حاصل یہ کہ ارشاداتِ الٰہی جو قرآنی بیانات کے روپ میں ہیں، کبھی غلط نہیں ہوسکتے، اور اُس کے نصوص و کُلّیات کو کبھی زوال نہیں آسکتا۔ لہٰذا اس قسم کا شبہ کیا جانا کہ ہوسکتا ہے کہ مستقبل کی تحقیقات قرآنِ حکیم کے کسی بیان کو غلط قرار دے دیں، ایک قسم کا واہمہ ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوسکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب اُصولی اعتبار سے اور اُس کے "نصوصِ اربعہ" (جن کو اُصولِ فقہ کی زبان میں عبارۃ النص، اشارۃ النص، دلالۃ النص اور اقتضاء النص کہا جاتا ہے) کی روشنی میں جب کسی آیتِ قرآنی کا مفہوم قطعی طور پر ثابت ہوجائے، تو پھر اُس کے غلط ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس قسم کے کسی بھی امکان کو تسلیم کرنا گویا کہ قرآنِ مجید کی قطعیت میں شبہ کرنا ہے۔ گویا کہ ہم خدائے علیم و خبیر کے علم میں شک و شبہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ علام الغیوب اس قسم کے رُجحانات کی بیخ کنی کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اُس کے علمِ قطعی کو دُنیا کی کوئی چیز چیلنج نہیں کرسکتی اور اُس کے ارشاداتِ عالیہ کبھی تزلزل کا شکار نہیں ہوسکتے:

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ: الف، لام، را۔ یہ ایسی کتاب ہے، جس کی آیتیں (علمی اعتبار سے) مضبوط و مستحکم کی گئی ہیں۔ پھر ان کی تفصیل ایک حکمت والی اور باخبر ہستی کی جانب سے کی گئی ہے۔ (هود: ۱)

بلکہ یہ کلامِ برحق وہ ہے جس کے ذریعہ کائنات کی گرہیں کھلتی ہیں اور ارض و سماوات کے اسرارِ سربستہ وا ہوتے ہیں۔ اور ان کے ملاحظہ سے اہلِ ایمان کا ایمان تازہ ہوتا رہتا ہے، جب کہ تحقیقاتِ جدیدہ ــ صحیح اُصولوں کی رُو سے، نہ کہ محض نظریات و مفروضات کے طور پر ــ اُس کے ابدی و سرمدی بیانات اور اُس کے روشن ترین حقائق کی تصدیق و تائید کرتی ہیں:

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ: اللہ نے زمین اور آسمانوں کو حقانیت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اور اس باب میں اہلِ ایمان کے لئے ایک بڑی نشانی موجود ہے۔ (عنکبوت: ۴۴)

چنانچہ اس لحاظ سے آج ہمارے سامنے ایسے بے شمار علمی و سائنسی حقائق و معارف موجود

ہیں، جو کلامِ الٰہی کی تصدیق و تائید کر کے ہمارے ایمان کو تازہ کر رہے ہیں۔ اور اس اعتبار سے خود علمِ الٰہی بھی "علمِ صحیح" کا مصدّق و مؤید ہے، نہ کہ اُس کا حریف یا اُس سے مُتصادم۔ اس کے برعکس نظریات و مفروضات کا معاملہ دوسرا ہے، جن کو کسی بھی طرح "علمِ صحیح" کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اور اس اعتبار سے نظریۂ ارتقا ایک علمی یا سائنٹفک حقیقت ہونے کے بجائے محض ایک مفروضہ ہے، جو مذہب کی ضد میں گھڑا گیا ہے۔ اور اسی بنا پر تمام مظاہرِ فطرت اور اُن کے حیرت انگیز نظامات پیہم و مسلسل اس خود ساختہ نظریہ کو جھٹلاتے چلے جا رہے ہیں۔ کیونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔

بہرحال قرآنِ حکیم وہ کلامِ الٰہی ہے، جس میں ارض و سماوات اور ان کے نظامات سے متعلق تمام بنیادی حقائق یا "اسرارِ رُبوبیت" پوری حکمت و بصیرت اور خُدائی منصوبہ بندی کے ساتھ مندرج ہیں۔ اور علمِ انسانی اپنی تحقیقات کے ذریعہ علمِ ربّانی کی تصدیق و تائید کرتے ہوئے ہمیشہ اپنی نیازمندیوں کا ثبوت دیتا رہے گا:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ: (اے محمدؐ) ہم نے آپ پر وہ کتاب اُتاری ہے جو ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والی ہے۔ اور وہ (ان ابدی حقائق کی بدولت) فرمانبرداروں کے لئے ہدایت، رحمت اور خوشخبری ہے۔ (نحل: ۸۹)

وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ: اور ارض و سما کا کوئی راز (سربستہ) ایسا نہیں ہے جو (اس) کتابِ روشن میں موجود نہ ہو۔ (نمل: ۷۵)

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: ہم نے تمہارے پاس ایک ایسی کتاب بھیج دی ہے، جس میں تمہارا تذکرہ موجود ہے۔ (انبیاء: ۱۰)

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ: ہم عنقریب منکرینِ حق کو اپنے نشانات و دلائل دکھا دیں گے، ان کے گرد و نواح میں بھی اور خود اُن کی اپنی ہستیوں میں بھی، تا آنکہ اُن پر واضح ہو جائے۔

کہ یہ (کلام) برحق ہے۔ کیا یہ بات اُن (کی تسلّی و تشفی) کے لئے کافی نہیں ہے کہ تیرا رب (اس عالمِ آب و گِل کی) ہر چیز سے واقف ہے؟ (حٰم سجدہ : ۵۳)

ان تمام آیات کی شرح حدیثِ شریف کا یہ مختصر مگر اعجازی فقرہ بخوبی کر دیتا ہے: وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ : اور قرآن کے عجائب کبھی ختم نہ ہو سکیں گے۔ (ترمذی)

اور قرآن مجید تو بہت پہلے ہی کہہ چکا ہے کہ زمانۂ مستقبل میں حضرت آدم علیہ السلام کی شخصیت کی حقیقت نوعِ انسانی کے سامنے ایک ربانی صداقت کے روپ میں ضرور آ کر رہے گی، جس کے باعث یہ واقعہ پوری دُنیائے انسانیت کے لئے ایک سبق بننے کی صلاحیت رکھنے والا ہوگا:

اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَہٗ بَعْدَ حِیْنٍ : یہ تو سارے جہاں کے لئے ایک درس ہے۔ اور تم اس خبر (کی صداقت) کچھ عرصے بعد ضرور جان لوگے۔ (ص: ۸۷-۸۸)

اسی بنا پر رب العالمین کا مطالبہ ہے کہ نوعِ انسانی اس دینِ فطرت پر ایمان لے آئے اور خُدائے خلّاق کی رُبوبیت و اُلوہیت کو تسلیم کرلے، جس کی تخلیق و آفرینش میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اپنے مقرر کردہ نظامہائے فطرت کو یکساں طور پر دُہرائے چلا جا رہا ہے، اور اپنی خلّاقیت کا زبردست مظاہرہ کر رہا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ : تو پوری یکسوئی کے ساتھ اس دین کی طرف متوجہ ہو جا۔ یہ اللہ کی تراش ہے، جس پر اُس نے تمام لوگوں کو تراشا ہے۔ لہٰذا اللہ کی تراش خراش میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی سیدھا دین ہے۔ (روم: ۳۰)

محمد شہاب الدین ندوی

اتوار ۸/۶/۱۴۰۷ھ
۸/۲/۱۹۸۷ء

کتابیات

(فہرستِ حوالہ جات)

۱۔ عربی کتب

۱۔ قرآن مجید

۲۔ تفسیر ابنِ جریر، علامہ ابنِ جریر طبری، دار المعرفۃ بیروت، ۱۴۰۰ھ

۳۔ تفسیر ابنِ کثیر، علامہ ابنِ کثیر، مطبوعہ عیسی البابی الحلبی و شرکاہ، مصر

۴۔ تفسیر درِ منثور، علامہ جلال الدین سیوطی، دار المعرفۃ بیروت

۵۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، ابنِ جوزی، مطبوعہ دمشق، ۱۳۸۴ھ

۶۔ تفسیر کبیر، امام فخر الدین رازی، جدید ایڈیشن، مطبوعہ تہران، طبع ثانی

۷۔ تفسیر کشاف، علامہ جار اللہ زمخشری، مطبوعہ تہران

۸۔ تفسیر بیضاوی، عبداللہ بن عمر بیضاوی، مطبوعہ دیوبند

۹۔ تفسیر روح المعانی، شہاب الدین محمود آلوسی، بیروت

۱۰۔ تفسیر المنار، شیخ رشید رضا، مطبوعہ بیروت

۱۱۔ معجم الفاظ القرآن الکریم، مجمع اللغۃ العربیۃ، مصر، ۱۳۹۰ھ

۱۲۔ المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، محمد فؤاد عبد الباقی، استانبول، ۱۹۸۴ء

۱۳۔ احکام القرآن، علامہ ابوبکر جصاص رازی، بیروت، ۱۳۳۵ھ

۱۴۔ المفردات فی غریب القرآن، راغب اصفہانی، دار المعرفۃ بیروت

۱۵۔ البرہان فی علوم القرآن، بدر الدین زرکشی، دار المعرفۃ بیروت

۱۶۔ الاتقان فی علوم القرآن، علامہ سیوطی، قاہرہ، ۱۳۹۸ھ

۱۷۔ الفوائد المشوق الی علوم القرآن، علامہ ابنِ قیمؒ، بیروت

۱۸۔ اعجاز القرآن، ابوبکر باقلانی، تحقیق احمد صقر، دار المعارف مصر

۱۹۔ الأمثال القرآنیۃ، عبدالرحمان حبنکہ المیدانی، بیروت، ۱۹۸۰ء

۲۰۔ مباحث فی علوم القرآن، مناع القطان، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت، ۱۴۰۰ھ

۲۱۔ صحیح بخاری، امام محمد بن اسماعیل بخاری، استانبول، ۱۹۷۹ء

۲۲۔ صحیح مسلم، امام مسلم بن حجاج نیشاپوری، ریاض، ۱۴۰۰ھ

۲۳۔ سنن ابوداؤد، امام سلیمان بن اشعث ابوداؤد السجستانی، حمص (سوریا) ۱۹۷۳ء

۲۴۔ سنن ترمذی، امام ابوعیسیٰ ترمذی، داراحیاء التراث العربی

۲۵۔ سنن ابن ماجہ، حافظ ابوعبداللہ محمد بن یزید قزوینی، دارالفکر بیروت

۲۶۔ مسند احمد، امام احمد بن حنبل، بیروت، ۱۳۹۸ھ

۲۷۔ شمائل ترمذی، امام ابوعیسیٰ ترمذی، مطبع مجیدی، کانپور

۲۸۔ فتح الباری، حافظ ابن حجر عسقلانی، مطبوعہ ریاض

۲۹۔ تہذیب الاسماء واللغات، محی الدین نووی، دارالکتب العلمیۃ بیروت

۳۰۔ موطا امام مالک، مطبوعہ مکہ مکرمہ

۳۱۔ کنزالعمال، علی المتقی، دائرۃ المعارف حیدرآباد

۳۲۔ دلائل النبوۃ، حافظ ابونعیم اصفہانی، حیدرآباد، ۱۳۹۷ھ

۳۳۔ حدائق الانوار، ابن دیبع شیبانی، مطبوعہ قطر، ۱۴۰۳ھ

۳۴۔ (معجم) طبرانی (بحوالہ کنزالعمال)

۳۵۔ (مستدرک) حاکم (بحوالہ کنزالعمال)

۳۶۔ شعب الایمان، بیہقی (بحوالہ کنزالعمّال)

۳۷۔ حلیۃ الاولیاء، حافظ ابونعیم (بحوالہ کنزالعمال)

۳۸۔ ابن عدی (بحوالہ کنزالعمال)

۳۹۔ مسند فردوس، دیلمی (بحوالہ درمنثور)

۴۰۔ مسند بزاز، ابوبکر احمد بزاز بصری (بحوالہ درمنثور)

۴۱۔ مسند ابنِ ابی حاتم، ابو محمد عبدالرحمان (بحوالہ در منثور)

۴۲۔ لسان العرب، ابنِ منظور افریقی مصری، دار صادر بیروت

۴۳۔ القاموس المحیط، مجد الدین فیروز آبادی، بیروت، ۱۳۹۸ھ

۴۴۔ الصحاح، اسماعیل بن حماد الجوہری، تحقیق احمد عبدالغفور عطار، قاہرہ، ۱۴۰۲ھ

۴۵۔ المعجم الوسیط، مجمع اللغۃ العربیۃ، مصر

۴۶۔ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح، علامہ ابنِ تیمیہ، مطابع المجد التجاریۃ۔

۴۷۔ موافقۃ صحیح المنقول لصریح المعقول " "، جدید ایڈیشن، ۱۹۸۵ء

۴۸۔ فتاویٰ ابنِ تیمیہ، علامہ ابنِ تیمیہ، دارالافتاء ریاض، ۱۳۹۸ھ

۴۹۔ اعلام الموقعین، علامہ ابنِ قیم، مصر، ۱۳۸۹ھ

۵۰۔ المعارف، ابنِ قتیبہ، مطبوعہ کراچی، ۱۳۹۶ھ

۵۱۔ آکام المرجان فی احکام الجانّ، علامہ بدرالدین شبلی، کراچی

۵۲۔ قصص الانبیاء، عبدالوہاب نجّار، مصر

۵۳۔ شرح عقائد نسفیہ، علامہ سعدالدین تفتازانی، کراچی

۵۴۔ الفَرق بین الفِرق، عبدالقاہر بغدادی، دارالمعرفہ بیروت

۵۵۔ المواقف فی علم الکلام، قاضی عبدالرحمان ایجی، عالم الکتب بیروت

۵۶۔ البدایہ والنہایہ، علامہ ابنِ کثیر، مکتبۃ المعارف بیروت، ۱۴۰۴ھ

۵۷۔ الکامل فی التاریخ، علامہ ابنِ اثیر، دار صادر بیروت، ۱۴۰۲ھ

۵۸۔ تاریخ دمشق، ابنِ عساکر (بحوالہ تہذیب الاسماء، نووی)

۵۹۔ دائرۃ معارف القرن العشرین، علامہ فرید وجدی، بیروت، ۱۹۷۱ء

۶۰۔ العروۃ الوثقیٰ، شیخ محمد عبدہ، مصر، ۱۹۲۸ء

۶۱۔ بروتوکولات صہیون، احمد عبدالغفور عطار، مکہ مکرمہ، ۱۹۷۶ء

۶۲۔ التطور والثبات فی حیاۃ البشریۃ، محمد قطب

۶۳۔ مصرع الدار دینیۃ، محمد علی یوسف، جدہ، ۱۴۰۳ھ

۶۴- الاسلام و نظریۃ داروِن ، احمد باشمیل

۶۵- مطالعات فی الادب المقارن، ڈاکٹر عدنان محمد وزان، جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ، ۱۴۰۳ھ

۶۶- الاسلام فی عصر العلم، محمد احمد غمراوی، دار الکتب الحدیثۃ، مصر

۶۷- فتوحات مکیہ (بحوالہ دائرۃ معارف القرن العشرین)

۲- اُردو کتب

۶۸- ترجمان القرآن، مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ دفتر ترجمان دہلی، ۱۳۵۰ھ

۶۹- دائرۂ معارفِ اسلامیہ (اُردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۶۴ء

۷۰- الکلام، علامہ شبلی نعمانی، شبلی بک ڈپو لکھنؤ، ۱۳۴۰ھ

۷۱- مقالاتِ شبلی، حصہ ہفتم، ۱۹۵۳ء

۷۲- مقالاتِ سلیمان، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ۱۹۷۱ء

۷۳- الندوہ، ماہنامہ (بحوالہ مقالاتِ شبلی و سلیمان)

۷۴- اسلامی علوم و فنون ہندستان میں، مولانا سید عبدالحی، ۱۹۶۹ء

۷۵- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، علامہ اقبال، ترجمہ از سید نذیر نیازی، طبع جدید، دہلی، ۱۹۸۶ء

۷۶- فکرِ اقبال، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، علی گڑھ، ۱۹۷۷ء

۷۷- تاریخ ابنِ خلدون قبل از اسلام، حصۂ اول، مطبوعہ کراچی

۷۸- کتاب مقدس (بائبل) برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی، لاہور، ۱۹۲۲ء

۷۹- انجیل برنباس، مطبوعہ حمیدیہ پریس لاہور، ۱۹۱۶ء

۸۰- قرآن اور علم جدید، ڈاکٹر محمد رفیع الدین، طبع چہارم، لاہور، ۱۹۸۱ء

۸۱- مقدر انسانی، لے کامت دونوائے، ترجمہ از عبدالمجید قریشی، کراچی، ۱۹۵۹ء

۸۲- اسلام اور نظریۂ ارتقا، احمد باشمیل، ترجمہ از ساجد الرحمان صدیقی، لاہور، ۱۹۷۸ء

۸۳- انسانی ارتقا، ایم آر ساہنی، ترجمہ از ڈاکٹر احسان اللہ خاں، دہلی، ۱۹۷۷ء

۸۴- حیاتِ جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء

۸۵- مقالاتِ سرسید، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء

۸۶۔ موجِ کوثر، شیخ محمد اکرام، لاہور، ۱۹۷۹ء

۸۷۔ معاشرے پر سائنس کے اثرات، از برٹرینڈ رسل، مترجمہ بشیر احمد چشتی، لاہور، ۱۹۶۵ء

۸۸۔ لغات القرآن، غلام احمد پرویز، ادارہ طلوعِ اسلام لاہور، ۱۹۶۰ء

۸۹۔ معارف القرآن، ״ ״، مطبوعہ دہلی

۹۰۔ تذکرہ، عنایت اللہ خاں مشرقی، مطبع وکیل امرتسر، ۱۹۲۴ء

۹۱۔ اسلام کی نشأۃ ثانیہ قرآن کی نظر میں، محمد شہاب الدین ندوی، مجلسِ نشریاتِ اسلام کراچی، ۱۹۸۳ء

۹۲۔ ندائے فرقان (سہ ماہی رسالہ) شمارہ ۲، مرتبہ محمد شہاب الدین ندوی، مطبوعہ فرقانیہ اکیڈمی بنگلور، ۱۹۷۵ء

۳۔ انگریزی کتب

93. ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA, 15th Edition, 1983.

94. Duncan, Ronald (Ed.), ENCYCLOPAEDIA OF IGNORANCE, Pergamon Press, Oxford, 1978.

95. Coley, Noel G. & Hall, Vance M.D., (Eds), DARWIN TO EINSTEIN, Primary Sources on Science & Belief, Essex, U.K., 1980.

96. Asimov, Isaac, ASIMOV'S GUIDE TO SCIENCE, Vol.2, The Biological Sciences, Pelican Books, Middlesex, England, 1978.

97. Mitchell, James (Gen.Ed.), THE ILLUSTRATED REFERENCE BOOK OF THE HUMAN BODY, Winward, London, 1982.

98. Toynbee, Arnold, MANKIND AND MOTHER EARTH, Oxford University Press, New York, 1976.

99. Dutta, A.C., BOTANY FOR DEGREE STUDENTS, Oxford University Press, 1979.

100. Russel, Bertrand, THE IMPACT OF SCIENCE ON SOCIETY, Unwin Paperbacks, London, 1976.

101. Bucaille, Maurice, THE BIBLE, THE QURAN AND SCIENCE, Karachi, 1979.

102. THE EARTH, The Mind Alive Encyclopaedia, Marshal Cavendish Limited, London, 1984.

103. MACMILLAN DICTIONARY OF THE HISTORY OF SCIENCE, London, 1985.

104. THE OXFORD ILLUSTRATED DICTIONARY, Second Edition, Clarendon Press, Oxford, 1982.

105. MACMILLAN ENCYCLOPAEDIA, 1981.

106. THE WYCLIFFE BIBLE ENCYCLOPAEDIA, Moody Press, Cnicago, 1982.

107. THE GOSPEL OF BARNABAS, Oxford, 1907, Reprinted in Karachi, 1980.

108. THE HISTORY OF CHRISTIANITY, A Lion Handbook, Bristol, U.K., 1982.

109. Darwin, Charles, THE ORIGIN OF SPECIES, Penguin Books, U.K., 1978.

110. Chardin, THE PHENOMENON OF MAN.

111. THE AMERICAN BIOLOGY TEACHER, March 1973.

112. Du Nouy, Lecomte, HUMAN DESTINY.

113. THE PROTOCOLS OF LEARNED ZION.

114. Nicoll, Allardyce, BRITISH DRAMA, London, 1978.

115. Garland, Henry and Mary, THE OXFORD COMPANION TO GERMAN LITERATURE.

116. Cawley, A.C., EVERYMAN AND MEDIEVAL MIRACLE PLAYS, "The Creation of Adam and Eve", London, 1974.

اشاریہ

مرتبہ : عبداللہ زبیر

(۱) شخصیات

(۲) موضوعات

عصر جدید کے مادہ پرستانہ چیلنج کے جواب میں

مولانا محمد شہاب الدین ندوی

کی چند

محققانہ تصانیف

٭ جدید ذہن و دماغ کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کا جواب ٭ اسلام کی ابدیت اور عالمگیری کے سائنٹفک دلائل ٭ واضح اور تسلی بخش حقائق ٭ مسکت و دل نشیں استدلال ٭ اور عالم انسانی کیلئے ایک لمحہ فکریہ

۱۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ قرآن کی نظر میں
۲۔ قرآن مجید اور دنیائے حیات (جدید سائنس کی روشنی میں چند حقائق)
۳۔ قرآن، سائنس اور مسلمان
۴۔ اسلام اور جدید سائنس
۵۔ عورت اور اسلام
۶۔ تخلیق آدم اور نظریۂ ارتقا
۷۔ تین طلاق کا ثبوت
۸۔ اسلامی شریعت علم اور عقل کی میزان میں
۹۔ قرآن کا پیغام اور اس کے علمی اسرار و عجائب
۱۰۔ جہیز (ایک غیر اسلامی تصور جو فساد تمدن کا باعث ہے)
۱۱۔ اسلام کا قانون طلاق (قرآن و حدیث کی روشنی میں)
۱۲۔ اسلام میں علم کا مقام و مرتبہ
۱۳۔ تعدد ازدواج پر ایک نظر
۱۴۔ نکاح کتنا آسان اور کتنا مشکل (اسلامی شریعت کی روشنی میں ایک جائزہ)
۱۵۔ جدید علم کلام
۱۶۔ آسان عربی (اول ۔ دوم)

ناشر
فضل ربی ندوی
فون ۶۲۱۸۱۷

مجلس نشریات اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد ۱ کراچی ۲۶۰۰

جلد سوم
شمارہ اوّل

آیات

سہ اشاعتی علیگڈھ

جمادی الثانی ـــــــ رمضان ۱۴۱۲ھ
جنوری ـــــــ اپریل ۱۹۹۲ء



مرکز الدراسات العلمیہ
CENTRE FOR STUDIES ON SCIENCE

مشتملات

استدراک

تخلیق آدم اور نظریۂ ارتقاء

مدیر آیات کے تبصرہ پر ایک نظر

آیات جلد ۲ شمارہ ۲ میں مولانا محمد شہاب الدین ندوی کی کتاب "تخلیق آدم اور نظریۂ ارتقاء" پر جو تبصرہ شائع ہوا تھا اس کے جواب میں مولانا محترم نے کچھ وضاحتیں ارسال کی ہیں۔ ہم ان کو اسی طرح قارئین کے افادے کے لئے تبصرہ نگار کی جوابی بحث کے ساتھ شائع کر رہے ہیں تاکہ طرفین کا مدعا واضح ہو سکے۔

مجلہ 'آیات' جلد ۲ شمارہ ۲ (مئی۔اگست ۱۹۹۱ء) میں راقم سطور کی کتاب "تخلیق آدم اور نظریہ ارتقاء" پر ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی نے سرسری اور نا تمام تبصرہ کرتے ہوئے اس پر جو تنقید کی ہے وہ بعض غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر حقیقت حال کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے۔ تاکہ اس تنقید سے کتاب کی قدر و قیمت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا تدارک ہو سکے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے اور یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ محترم تبصرہ نگار نے کتاب کا مطالعہ نہایت درجہ سرسری انداز میں کیا ہے اور تبصرہ بھی بالکل رواروی میں کر دیا ہے۔ ایک ایسی علمی کتاب جو سالہا سال کی تحقیق و تدقیق کے بعد منظر عام پر آئی ہے اور اردو زبان میں تو اتنی جامع کتاب پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہے، اس کے داخلی محاسن اور اس کے مرتبہ کے بارے میں تبصرہ نگار کے پاس دو بول بھی نہیں ہیں۔ پورا تبصرہ نہ صرف روکھا پھیکا ہے بلکہ اسے محض ناقدانہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

نظریۂ ارتقاء کے خلاف راقم سطور نے متعدد اہل علم اور علمائے سائنس کی جانب سے کئی دلائل پیش کئے ہیں۔ مگر تبصرہ نگار کو صرف ایک ہی دلیل نظر آئی، جو اس نام نہاد نظریہ کی تردید کے لئے۔ ان کے خیال میں کافی نہیں ہے۔ لہذا مابعد کی انواع کا ماقبل کی انواع سے جنم لینے کے نظریہ کا رد نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک عجیب و غریب رویہ ہے جو ناقابل فہم ہے۔

اور پھر محترم تبصرہ نگار نے مصنف پر یہ غلط الزام بھی عائد کر دیا ہے کہ "آدم کی تخلیق خصوصی" پر کتاب میں انہیں کوئی دلیل نہیں مل سکی۔ یعنی آدم کے براہ راست مٹی سے پیدا کرنے کے بارے میں نہ تو کتاب ہذا میں کوئی تفصیل مذکور ہے اور نہ ایسا کوئی ثبوت انہیں مل سکا ہے۔ جیسا کہ وہ تحریر کرتے ہیں:

"مولانا کے نزدیک خچر چونکہ ترقی کرتے کرتے ابھی گھوڑا نہیں بن سکا، اس لئے بندر ترقی کرتے کرتے انسان نہیں بن سکتا۔ اس مثال کی روشنی میں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر گھوڑی کے بطن سے خچر کی پیدائش ممکن ہے تو بندریا کے بطن سے تحت الانسان اور تحت الانسان کے بطن سے انسان کی پیدائش کیوں ممکن نہیں؟ اس خیال کی تردید "آدم کی تخلیق خصوصی" میں مل سکتی تھی جو تبصرہ نگار کو تلاش کے باوجود نہیں ملی۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جس باب کو سب سے زیادہ مدلل ہونا چاہیئے تھا اس پر ہی سب سے کم توجہ دی گئی ہے۔ "اِنِّی خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ" پر چند سطروں میں تبصرہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ "اس موقع پر براہ راست مٹی سے پیدا کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی بھی مفہوم صحیح نہیں ہوسکتا" پھر کہہ دیا گیا ہے کہ "اس کی مزید تفصیل اگلے باب میں آئے گی"۔ (ص ۱۸۹)۔ لیکن اگلے باب میں سارا زور آدم کی ابوالبشریت پر صرف کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن، حدیث اور بعض کتب مقدسہ سے چالیس دلیلیں حضرت آدم کے ابوالبشر ہونے پر جمع کی گئی ہیں۔ مگر کیا حضرت آدم کو ابوالبشر ثابت کردینے سے اس بات کا ابطال ہوجاتا ہے کہ خود حضرت آدم تحت الانسان سے وجود میں آئے تھے؟ تبصرہ نگار کے نزدیک حضرت آدم کو ابوالبشر تسلیم کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت آدم براہ راست مٹی سے وجود میں لائے گئے تھے۔ البتہ حفوری انسان نما حیوانوں کے پائے جانے سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ان میں سے کسی کی اولاد تھے۔ آخرالذکر پہلو پر مولانا کی گفتگو بہت خوب اور مفصل و مدلل ہے۔ لیکن اس پہلو پر بحث بہت کمزور ہے کہ حضرت آدم براہ راست مٹی سے بنے تھے۔ کم از کم زیر تبصرہ کتاب سے ایسا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا کہ حضرت آدم کی تخلیق براہ راست مٹی سے ہوئی تھی۔ تاہم کتاب میں اس کا دعویٰ ضرور کیا گیا ہے۔"

تو اس سلسلے میں پہلی بات یہ کہ جہاں تک خچر کے ترقی کرکے گھوڑا بننے کا سوال ہے تو یہ بات راقم سطور نے کتاب مذکور میں برٹرانڈرسل کے ایک اعتراض کے جواب میں بطور ایک مثال کہی تھی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ خچر ایک دوغلی نسل کا جانور ہے جو گدھی اور گھوڑے کے ملاپ سے پیدا ہوا ہے۔ لہٰذا اسے فطری انواع کے مقابلے میں پیش کرنا ایک لغو بات ہے۔ اور پھر یہ بات اس وقت صحیح ہوتی جب کہ خچر ترقی کرتے کرتے گھوڑا بن جاتا۔ یا گدھا از خود ترقی کرتے کرتے خچر ہوجاتا۔ لہٰذا یہ بات قیاس مع الفارق کی قبیل سے ہے۔ ظاہر ہے گدھا اب تک صرف گدھا ہی ہے از خود خچر نہیں بن سکا۔ اسی طرح خچر از خود گھوڑا نہیں بن سکا اور نہ ہی گھوڑا خود ترقی کرتے کرتے کچھ اور بن سکا۔ بلکہ زندگی کی سب سے سادہ ترین شے یعنی امیبا بھی اب تک صرف امیبا ہی ہے۔ لہٰذا یہ ایک غیر معقول بات ہی نہیں بلکہ ایک افسانہ ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کی غرض سے راقم سطور نے اپنی کتاب میں خچر اور گھوڑے کی مثالیں پیش کی تھی۔ اس اعتبار سے خچر کو گدھے کی "ارتقائی شکل" قرار دینا ایک مغالطہ ہے۔ اور پھر "گھوڑی کے بطن سے خچر کی پیدائش" کی بات بھی ایک خلاف واقعہ چیز ہے۔ خچر گھوڑی کے بطن سے نہیں بلکہ گدھی کے بطن سے جنم لیتا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ محترم تبصرہ نگار نے یہ اعتراض بے سوچے سمجھے محض بے خیالی کے عالم میں کردیا ہوگا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ یہ ایک "ترقی معکوس" ہوگی۔

بہر حال اگر کسی نے براہ راست نظام فطرت میں اس قسم کی فطری تبدیلی کا مشاہدہ کیا ہو تو اسے پیش کیا جائے، جسے پیش کرنے سے پوری دنیائے سائنس اب تک عاجز ہے، جیسا کہ متعدد سائنسدانوں نے اس کا اعتراف

اعتراف کیا ہے۔ ہاں البتہ بعض احفوری رکازات یا ڈھانچوں کو دیکھ کر صرف ایک قیاس کیا گیا ہے کہ یہ موجودہ انسان کے "اجداد" ہوں گے۔ مگر اس سلسلہ میں اتنے معمے موجود ہیں کہ اس موضوع پر کوئی حتمی و یقینی بات کہنا نہایت درجہ مشکل ہے۔ جیسا کہ کتاب کے دوسرے باب میں بالتفصیل اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے ان احفوری آثار و باقیات کے سلسلے میں جدید ترین تحقیقات اور ان کے بارے میں خود علمائے سائنس کی رائیں پیش کی گئی ہیں۔ اور پھر اسلامی نقطۂ نظر سے ان نظریات پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا سب سے زیادہ اہم باب یہی ہے جو راقم کی خاص الخاص تحقیق ہے اور یہ دنیائے علم کے لئے ایک بالکل نئی چیز ہے۔ مگر تبصرہ نگار نے اس پر سوائے ایک دو الفاظ کے کوئی تبصرہ کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ گویا کہ ان کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ میرے خیال میں اس طرح تبصرہ نگار نے کتاب کے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے۔

اب آیئے محترم تبصرہ نگار کے اس الزام کی طرف کہ "آدم کی تخلیق خصوصی" پر راقم سطور نے کوئی شرعی دلیل یا ثبوت فراہم نہیں کیا ہے۔ تو یہ الزام بھی بالکل غلط ہے۔ کیونکہ میں نے متعدد مقامات پر اس پر روشنی ڈالی ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ کتاب پر سرسری نظر ڈالنے اور اس کا بالاستیعاب مطالعہ نہ کرنے کی وجہ سے تبصرہ نگار کی نگاہ اس پر نہ پڑ سکی۔ ہاں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ راقم سطور نے اس سلسلے میں بہت زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بلکہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت جا بجا مختصر طور پر کر دی ہے۔ کیونکہ میں "سیرت آدم" پر متعدد حیثیتوں سے ایک ضخیم کتاب مرتب کر رہا ہوں، جس میں اس سلسلے کے بہت سے مباحث مفصل طور پر آنے والے ہیں۔ ویسے بھی زیادہ تفصیلات کے باعث کتاب کا حجم بہت زیادہ ہو جانے کا اندیشہ تھا جو پہلے ہی سے کافی ضخیم ہو گئی ہے۔

بہرحال کتاب ہٰذا کے صفحہ ۱۸۹ میں جو بحث ہے وہ بھی اس سلسلے میں بہت کافی ہے کیونکہ قرآن حکیم کا "اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ" (میں مٹی سے ایک آدمی ضرور بنانے والا ہوں) کہنا ایک "نص صریح" ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بیان براہ راست مٹی سے پیدا کرنے پر دلالت کر رہا ہے، نہ کہ کسی دوسرے جانور یا تحت الانسان سے تولد ہونے پر۔ جو ہستی کسی دوسری نوع یا جانور سے برآمد ہو اسے مٹی سے پیدا کرنا نہیں کہا جاتا۔ اگر کتاب میں اس کے علاوہ اور کوئی دوسری تفصیل موجود بھی نہ ہوتی تب بھی یہی ایک حقیقت نظریۂ ارتقاء کی تردید کے لئے کافی ہوتی۔ ظاہر ہے کہ جب خود خالق کائنات اور ربّ العالمین یہ خبر دے رہا ہے کہ اس نے مٹی سے ایک بشر پیدا کیا ہے تو پھر اس میں شک و شبہ کرنے یا اس حقیقت کو جھٹلانے کا موقع ہی کہاں رہتا ہے؟ کیا رب العالمین کے کلام سے زیادہ سچا اور مبنی بر واقعہ کلام کسی اور کا ہو سکتا ہے؟ مگر بعض ارتقا پسندوں کا اس آیت کریمہ کی لغو تاویل میں یہ کہنا کہ مٹی سے پیدا کرنے کے اس بیان سے نظریۂ ارتقاء کی تردید نہیں ہوتی کیونکہ اس میں انسان کی اصل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، نہ صرف کلام الٰہی کو جھٹلانا ہے بلکہ اس بات کا ادعا بھی ہے کہ معاذ اللہ اس تعبیر کے لئے اللہ تعالیٰ کو صحیح الفاظ بھی نہیں مل سکے۔ بلکہ یہ بات مدعی سست اور گواہ چست کی قبیل سے ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ رب العالمین کا کلام اپنی جگہ پر ایک اٹل حقیقت کا حامل ہے۔ اور اس کائناتِ مادی میں اب تک ایسی کوئی شہادت یا "علمی ثبوت" برآمد نہیں ہوا ہے جو اس حقیقتِ عظمیٰ کو جھٹلانے والا ہو۔

کتاب کے چھٹے باب میں حضرت آدم علیہ السلام کے ابوالبشر ہونے پر جو دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ خود بعض علمائے اسلام کے ملاحظہ کے لئے ہیں جو نظریۂ ارتقاء سے مرعوب ہو کر حضرت آدمؑ کے ابوالبشر ہونے کے بارے میں تذبذب میں مبتلا ہیں۔ اس لئے اس باب میں زیادہ تر شرعی دلائل بیان کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ ویسے بھی کتاب کے مقدمہ میں تصریح کردی گئی ہے کہ کتاب کا دوسرا حصہ شرعی دلائل ہی پر مشتمل ہوگا۔ کیونکہ اس کتاب کا مقصد اس موضوع پر میری زیر ترتیب ایک اور کتاب (قرآن مجید اور نظریۂ ارتقاء) پیش کرنے سے پہلے محض آدم کی شرعی حیثیت پر بحث کرنا تھا۔ لہذا میں نے کتاب ہٰذا کے حصہ اوّل میں سائنسی نقطۂ نظر سے بحث کر کے اسے غیر واقعاتی قرار دینے کے بعد حصۂ دوم میں شرعی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۰ اور ۱۹۵۔ لیکن اس کے باوجود بھی میں نے جگہ جگہ حضرت آدمؑ کے براہ راست مٹی سے پیدا ہونے یا آپ کی خارق عادت تخلیق پر قرآن اور حدیث کے متعدد "نصوص" یعنی واضح اور صریح بیانات پیش کئے ہیں۔ چنانچہ حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں:

۱۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی دلیل ہی سورۂ حجر کی ان آیات پر مشتمل ہے جن میں حضرت آدم علیہ السلام کو "کھنکھناتی مٹی" سے پیدا کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے (۱۹۶) اور اس کی تائید متعدد حدیثوں سے ہوتی ہے، جن میں سے بعض اگلے دلائل میں مذکور ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بیان کسی بھی تحت الانسان سے برآمد ہونے کی نفی ہے۔ نیز یہ کہ یہ امیبا پر بھی صادق نہیں آسکتا (جیسا کہ ایک دور از کار تاویل کی گئی ہے)۔ نیز یہ کہ بفرض محال امیبا فرض کرنے کی صورت میں "جنس" کا مسئلہ بھی حل نہیں ہوتا۔ کیونکہ تمام یک خلوی جاندار "بے جنس" ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں پوری دنیائے سائنس حیرت زدہ ہے۔

۲۔ دلیل ۱۷ میں نظریۂ ارتقاء کی تردید میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق خصوصی کا حال بیان کیا گیا ہے کہ آپ کا ظہور ایک خصوصی ماحول میں کس طرح ہوا؟ چنانچہ صفحہ ۲۱۳ - ۲۱۶ میں اس کی تفصیل مذکور ہے کہ آپ کی تخلیق عالم بالا پر ہوئی تھی (پھر اس کے بعد زمین پر آپ کا ھبوط ہوا)۔ لہذا ارتقا یعنی کسی دوسری نوع کے بطن سے جنم لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور پھر آپ کی تخلیق خصوصی کا ایک اور ثبوت یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنے ظہور کے فوراً بعد فرشتوں کو بحکم خداوندی سلام کہا اور فرشتوں نے اس کا جواب دیا۔ جیسا کہ کتاب میں مذکور بخاری و مسلم کی حدیثوں سے اس موضوع پر روشنی پڑتی ہے۔ اور پھر نظریۂ ارتقا کی تردید کی ایک اور واضح دلیل یہ بھی ہے کہ آپ کی تخلیق کے موقع پر آپ کا قد ساٹھ ہاتھ کا تھا۔ پھر راقم سطور نے حافظ ابن حجرؒ کی ایک تحریر کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ کے زمین پر ہبوط (اترنے) کے وقت آپ کا قد کم کر دیا ہوگا۔ ورنہ آرکیالوجی کی تحقیق کی رو سے زمین سے اب تک ایسا کوئی انسانی ڈھانچہ برآمد نہیں ہو سکا ہے جس کا قد ساٹھ ہاتھ کا ہو۔ ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد ابتدائی طور پر اس قدر لمبے قد والے ہوتے تو اب تک ایسا کوئی ڈھانچہ ضرور برآمد ہوتا۔ لہذا یہ ایک قوی دلیل ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہمارے کرۂ ارض پر نہیں ہوئی۔ اور جب یہاں نہیں ہوئی تو پھر ارتقا کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب ان بیانات کے منطقی نتائج ہیں۔

۳۔ بیسویں دلیل کے طور پر ایسی کئی حدیثیں پیش کی گئی ہیں جن کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی تخلیق سے پہلے "مٹی کے ایک ڈھیر" کی شکل میں تھے۔ اور پھر اس سلسلے میں قرآنی لفظ

"طین"، اور حدیثی لفظ "طینة" کے درمیان جو نازک لغوی فرق ہے اس کی تشریح کرتے ہوئے قرآن حکیم کے مختلف الفاظ کے درمیان تطبیق دی گئی ہے۔ جو آدم کو براہ راست مٹی سے پیدا کئے جانے کی تفصیل ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۲۲-۲۲۴۔ مگر محترم تبصرہ نگار نے اس پوری تفصیل کو نظر انداز کرتے ہوئے نہایت درجہ عامیانہ انداز میں ایک بے حقیقت دعویٰ کر دیا۔ کاش کہ وہ کتاب کا مطالعہ پوری توجہ سے کر لیتے!

۴۔ اکیسویں دلیل کے طور پر تخلیق آدم کی مزید تفصیل مذکور ہے، جہاں پر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خارقِ عادت پیدائش کی مماثلت حضرت آدم علیہ السلام سے دکھاتے ہوتے مٹی سے کس طرح پیدا کیا؟ اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ ورنہ حضرت عیسیٰؑ کی خارقِ عادت پیدائش کے لئے حضرت آدم علیہ السلام کو بطور مثال پیش کرنا ممکن نہ ہوتا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے صفحہ ۲۲۴-۲۲۹۔

اس موقع پر یہ بھی واضح رہے کہ جو ارتقا پسند قرآن کی بعض دیگر آیات کی دور از کار تاویل کرتے ہیں وہ اس آیت کریمہ کی ایسی کوئی من مانی تاویل نہیں کر سکتے۔ جو ان کی تمام خواہشات کے خلاف ایک فیصلہ کن "نص" ہے۔ قرآن کے اس قطعی اور واضح بیان سے حضرت آدم علیہ السلام کے کسی بھی دوسری نوع یا تحت الانسان سے برآمد ہونے کی قطعاً نفی ہو رہی ہے۔ لہذا قرآن اور نظریۂ ارتقا میں تطبیق "جمع بین النقیضین" کی قبیل سے ہے جو محال ہے۔

غرض حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق خصوصی اور آپ کے براہ راست مٹی سے پیدا کئے جانے کے بارے میں یہ ایک "نص قطعی" ہے، جس کا انکار کوئی معاند ہی کر سکتا ہے، جو کسی بھی حقیقت کو ماننے کے لئے تیار نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر قرآن کے قطعی نصوص کو بھی نہ مانا جائے تو پھر پورا قرآن تشکیک کی زد میں آجائے گا۔ اور اس کے کسی بھی بیان سے استدلال کرنا ممکن نہ ہو سکے گا۔

۵۔ بائیسویں دلیل کے مطابق بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، ان کے جسم میں روح پھونکی، فرشتوں سے ان کے لئے سجدہ کرایا اور انھیں جنت میں بسایا۔ دیکھئے صفحہ ۲۳۰۔ حدیث صحیح کی یہ ساری تفصیلات قرآنی بیانات ہی کی تشریح و تفسیر ہے، جو تخلیقِ خصوصی کی دلیل اور نظریۂ ارتقا کے خلاف ہے۔ اگر بالفرض دیگر تمام بیانات میں کسی نہ کسی وجہ سے اخفاء رہا ہو تو پھر اس واضح بیان سے [illegible] چار کی بات بالکل واضح ہے اور جس میں کسی بھی قسم کی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے) ہر قسم کی غلط فہمیاں دور ہو جانی چاہئیں۔

۶۔ دلیل ۲۸ کی رو سے صحیح مسلم کی ایک حدیث کے مطابق صاف صاف مذکور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق جنت میں ہوئی، نہ کہ ہماری زمین پر۔ دیکھئے صفحہ ۲۳۷۔ لہذا اب ارتقا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیز ان کے علاوہ صفحہ ۹۵ تا ۹۸ میں بھی تخلیق خصوصی کی ایک واضح اور بیّن دلیل پیش کی گئی ہے۔ اسی طرح ایک اور دلیل ص ۱۱۳-۱۱۴ میں بھی پیش کی گئی ہے، جو بیک وقت عقلی بھی ہے اور شرعی بھی۔

کیا اتنے سارے حقائق کافی نہیں ہیں؟ مگر تعجب ہے کہ تبصرہ نگار نے ان سب کو نظر انداز کر کے ایک بے حقیقت دعویٰ کر دیا کہ اتنی ساری تفصیلات کے باوجود لازم نہیں آتا کہ حضرت آدم علیہ السلام براہ راست

مٹی سے وجود میں لائے گئے تھے۔ یا للعجب! تو اب سوال یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کی ان ساری تفصیلات کے بعد آخر پھر کون سے دلائل پیش کئے جائیں؟ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ ؟ ایک مسلمان کے لئے قرآن و حدیث سے بڑھ کر قابل حجت چیز اور کون سی ہو سکتی ہے؟

حاصل یہ کہ راقم سطور نے آدمؑ کی خارقِ عادت تخلیق پر جو کچھ بھی لکھا ہے وہ بہت مدلّل ہے اور اس میں کہیں بھی جھول نہیں ہے۔ شروع کے دو ابواب میں سائنسی نقطۂ نظر سے جو مفصّل بحث کی گئی ہے اس سے یہ بات پوری طرح روشنی میں آگئی ہے کہ نظامِ فطرت میں ایسی کوئی "حقیقت" اب تک دریافت نہیں ہو سکی ہے جو اس نام نہاد نظریہ کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہو۔ پھر بقیہ ابواب میں تخلیق آدم کی شرعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نہ صرف ابوالبشر تھے بلکہ آپ کی تخلیق بھی خصوصی طور پر عمل میں آئی تھی۔ اور یہ دلائل خاص طور پر ان لوگوں کے ردّ میں ہیں جو حضرت آدمؑ کو انسان اول ماننے کے لئے کسی بھی طرح تیار نہیں بلکہ انھیں نوع انسانی کا محض ایک تمثیلی نمائندہ قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک "انسان" کا اطلاق "تحت الانسان" پر بھی ہونا ممکن ہے۔ چنانچہ اس کی تردید راقم سطور نے خاص طور سے "آدم کون ہے؟" کے عنوان کے تحت کی ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۹۹-۱۰۶۔ لہٰذا اب اس موقع پر دو ہی باتیں ممکن ہو سکتی ہیں: یا تو مدیر آیات نے کتاب کا صحیح مطالعہ کئے بغیر اس پر تبصرہ کر دیا ہے، یا پھر وہ قرآن و حدیث کی مذکورہ بالا تمام صراحتوں کو ناکافی یا ناقابل اعتماد تصور کرتے ہیں۔ تو پہلی صورت میں "آیات" کا معیار مجروح ہوتا ہے اور اس کے بلند بانگ دعووں پر حرف آتا ہے اور دوسری صورت میں قرآن اور حدیث کی صراحتوں کے مقابلے میں مادہ پرستانہ نظریات کو بڑھاوا دینے کا رجحان سامنے آتا ہے، اور اس سے بھی آیات کی شان گھٹتی ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ان دونوں میں سے پہلی شق ہی زیادہ صحیح ہوگی واللہ اعلم۔

اب اس کے بعد آیئے جنات کے موضوع پر، جن کے بارے میں محترم تبصرہ نگار نے راقم سطور کی تحقیق پر بے اعتباری ظاہر کرتے ہوئے بعض شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے۔ جیسا کہ وہ تحریر کرتے ہیں:

"مولانا محترم نے دوسرے باب میں جنات کا ذکر حضرت آدم کے پیش رو کی حیثیت سے کیا ہے۔ یہ عقیدہ عین قرآن کی عبارۃ النص سے ثابت ہے۔ لیکن خود جنات کے بارے میں مولانا کا یہ تصور کہ وہ گوشت پوست رکھنے والی مخلوق تھی جس کی رگوں میں خون دوڑتا تھا، وہ ہتھیار بھی چلانا جانتی تھی اور اس کی انگلیوں کی بناوٹ انسانوں جیسی رہی ہوگی وغیرہ۔ خود لفظ جن کے لغوی معنی کے بھی خلاف ہے اور بہت سی احادیث بھی اس تصور کے خلاف جاتی ہیں۔ مولانا نے اس تصور کو حقائق ثابتہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور تائید میں قرآن اور حدیث پیش کرنے کے بجائے عوامی تصورات کا سہارا لیا ہے۔ یہ تصورات اس حد تک جاتے ہیں کہ نہ صرف جن بلکہ ان سے پہلے جنّ اور ان سے پہلے بنّ اس زمین پر مسلط تھے۔ آخر میں مولانا نے اس تصور کو اسلام سے بھی جوڑ دیا ہے۔ فرماتے ہیں "ظاہر ہے کہ اسلام خود ہی نہ صرف آدم سے پہلے ایک دوسری نوع کا وجود تسلیم کرتا ہے بلکہ صراحتاً یہ بھی کہتا ہے کہ اس ماقبل آدم مخلوق (جنّ) سے پہلے بھی کوئی دوسری قسم کی مخلوق ضرور موجود تھی، جس کا درجہ جنوں سے کم تر تھا۔" (صفحہ ۶۹) سوال یہ ہے کہ کیا ہر وہ بات جو ایک مسلمان عالم کہے عین اسلام ہے؟ مولانا کو

معلوم ہونا چاہئے کہ علمائے اسلام نے جنات وغیرہ کے سلسلے میں یہ باتیں صرف ان عقائد کا ذکر کرنے کے لئے کہی ہیں جو معاصر وماقبل عرب معاشرے میں پائے جاتے تھے۔ نہ تو یہ لازماً ان کے اپنے عقائد ہیں اور نہ ہی یہ قرآن اور حدیث سے استنباط کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ ان تصورات کو اسلامی کہنا کوئی جواز نہیں رکھتا" (ص ۱۵۸-۱۵۹)۔

تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ ناچیز نے قرآن اور حدیث کے تقریباً تمام نصوص کو پیش نظر رکھتے ہوئے جنوں کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔ اس میں قرآن اور حدیث کے حقائق کے ساتھ ساتھ علمائے اسلام کی ان راؤں کو بھی ملحوظ رکھا ہے جو قرآن اور حدیث کے حقائق اور ان کے اشارات وکنایات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اور یہ سالہا سال کے مطالعہ اور غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ اس میں عوامی تصورات کے بجائے قرآن اور حدیث کے ٹھوس حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لہذا اس موقع پر اس کتاب سے بعض باتوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا اور بنیادی اصول یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ کسی چیز کے اثبات کے لئے اس کا محض "عبارۃ النص" ہی سے ثابت ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ قرآن کے اشارات سے بھی بے شمار حقائق ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً فقہی نقطۂ نظر سے جس طرح عبارۃ النص سے کوئی بات ثابت کی جاتی ہے اسی طرح اشارۃ النص، دلالۃ النص اور اقتضاء النص سے بھی کوئی بات یا حکم ثابت کیا جاتا ہے[1]۔ نیز اس کے علاوہ بعض "قرائن" سے بھی حجت ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً دھویں کا وجود آگ کے وجود پر دلالت کرنے والا ہوگا۔ اگرچہ آگ ہم کو دکھائی نہیں دے رہی ہے لیکن ہم محض دھواں دیکھ کر یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں گے کہ وہاں پر آگ ضرور موجود ہوگی کیوں؟ اس لئے کہ ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ آگ کے بغیر دھواں نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح اگر کسی مرے ہوئے شخص کے بدن پر زخم موجود ہو یا خون بہہ رہا ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ اسے کسی دھاردار ہتھیار سے قتل کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ آپ سے آپ مرا ہوتا تو اس قسم کا کوئی زخم موجود نہ ہوتا۔ اس قسم کے قرینوں سے منطقی طور پر جو نتائج نکالے جاتے ہیں وہ اصل حقیقت کی طرف اشارہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں مذکور ہے کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف پر تہمت لگائی تو اسی کے گھر کے ایک فرد نے عزیز مصر کو یہ مشورہ دیا کہ دیکھو اگر یوسف کی قمیص سامنے سے پھٹی ہو تو یوسف جھوٹا اور تیری بیوی سچی ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تہمت سے بچنے کے لئے خود اسی نے قمیص پھاڑلی ہو۔ لیکن اگر قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہو تو اس صورت میں یوسف سچا اور تیری بیوی جھوٹی ہوگی۔ کیونکہ پیچھے سے قمیص تب ہی پھٹ سکتی ہے جب کہ کوئی دوسرا اس کے ساتھ زبردستی کرے۔ اس طرح کے قرینوں سے عدالتوں میں بھی فیصلہ کیا جاتا ہے اور یہ بات بہت معقول معلوم ہوتی ہے۔

غرض قرآن اور حدیث میں بعض ایسے اشارات وکنایات مذکور ہیں جو بعض حقائق کی طرف رہنمائی کرنے والے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قصۂ آدم میں بھی دو ایسے الفاظ موجود ہیں جو اس قصے کے پس منظر کی طرف دلالت کناں ہیں اور وہ ہیں: فساد فی الارض اور سَفکِ دماء، یعنی خون بہانا (بقرہ: ۳۰)۔

اور اس کی تفسیر میں صرف تفسیری روایات ہی نہیں بلکہ بعض صحیح حدیثیں بھی موجود ہیں، جن کی

---

[1] تفصیل کے لئے اصولِ فقہ کی کوئی بھی کتاب دیکھی جاسکتی ہے۔

روسے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے زمین میں جنات آباد تھے اور انھوں نے خون بہایا۔ چنانچہ امام حاکمؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے آیت کریمہ "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ" کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ زمین میں آدم کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے "جانّ" کی اولاد جنّ رہتی تھی۔ تو اس نے زمین میں فساد برپا کیا اور خون بہایا۔ اسی بنا پر جب اللہ نے فرمایا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے عرض کیا کہ کیا تو اس میں ایسی مخلوق کو پیدا کرے گا جو فساد برپا کرتی اور خون بہاتی ہو؟ ان کی مراد جانّ کی اولاد جنوّں سے تھی[۲]

اس حدیث کی تخریج کرتے ہوئے امام حاکمؒ نے تصریح کی ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔ اور حافظ ذہبیؒ نے بھی اس کی تائید کی ہے[۳] اور راقم سطور نے کتاب میں اسی حدیث سے ملتی جلتی روایات تفسیری اقوال کی شکل میں پیش کی ہیں۔

یہ ایک نص قطعی ہے زمین پر آدم علیہ السلام سے پہلے جنات کے نہ صرف موجود ہونے پر، بلکہ اس بات پر بھی کہ جنات بھی انسانوں ہی کی طرح جسمانی عناصر اور گوشت پوست کا مجموعہ تھے اور ان کی رگوں میں بھی خون دوڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ بغیر گوشت پوست کے خون کا تصور محال ہے۔ اور خون بہانا اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ ہتھیار چلانا بھی جانتے تھے۔ ظاہر ہے کہ بغیر کسی دھار دار آلے کے خون نہیں نکل سکتا۔ اور ہتھیار چلانا اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ ہتھیار بنانا بھی جانتے تھے۔ پھر ہتھیار بنانے اور چلانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے انگلیوں کی بناوٹ بھی انسان جیسی ہی رہی ہو۔ اور اس کام کے لئے چونکہ ذہانت کی بھی ضرورت پڑتی ہے لہذا ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی ذہین مخلوق تھی۔ دیکھئے یہ تمام حقائق بغیر کسی تاویل کے محض چند اشارات یا قرینوں سے بطور قیاس و استنباط ثابت ہو رہے ہیں۔

اب ان حقائق کے مقابلے میں یہ شبہ چنداں اہمیت نہیں رکھتا کہ یہ سب کچھ لفظ جن کے لغوی معنی کے خلاف ہے۔ اس موقع پر سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان آیا قرآن اور حدیث کے حقائق اور ان کے "نصوص" پر اعتبار کرے یا محض لغت کی دلالت پر؟ اور پھر جنات کا ہر شخص کو نظر نہ آنا ایسا کوئی مسلّمہ نہیں ہے کہ اس سے کسی حقیقت ثابتہ پر حرف آجائے۔ تبصرہ نگار اس موقع پر قرآن اور حدیث کے حقائق کے مقابلے میں محض لغت کا سہارا لے رہے ہیں جو خود ان کے اپنے اصول کے بھی خلاف ہے۔ اگر جنّ کے لغوی معنوں میں پوشیدگی کا مفہوم پایا جاتا ہو تو اس سے آخر یہ بات کیسے لازم آگئی کہ وہ اسلامی عقیدہ کے بھی مطابق ہے؟ کیا قرآن اللہ حدیث میں کہیں بھی یہ کہا گیا ہے کہ جنّ آنکھوں کو نظر نہیں آتے؟ ہاں البتہ شیطان اور اس کی ذریت کے بارے میں یہ بات ضرور کہی گئی ہے کہ وہ انسانوں کو اس طرح دیکھتے ہیں جس طرح کہ انسان انھیں نہیں دیکھتے (اعراف: ۲۷)۔

قرآن اور حدیث کے نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ جنّ شیاطین سے الگ ایک نوع ہیں، اگرچہ ان دونوں کی اصل "نار" ہے۔ مگر جنّ کئی اعتبارات سے انسانوں سے مشابہ ہیں۔ وہ بھی انسانوں ہی کی طرح نہ صرف غیر مرئی

---

[۲] مستدرک حاکم: ۲/۲۶۱، مطبوعہ دارالمعرفہ بیروت

[۳] التلخیص للذہبی، برحاشیہ مستدرک: ۲/۲۶۱

کی پہچان رکھتے ہیں بلکہ ان کے بھی دل و دماغ اور آنکھ و کان وغیرہ ہیں (اعراف : ۱۷۹)۔ ان کے یہاں بھی سلسلۂ رسالت جاری ہے (انعام : ۱۳۰)۔ وہ بھی انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے ہیں (اس موضوع پر ایک حدیث آگے آرہی ہے). ان میں بھی مومن و کافر ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ بھی جنت و دوزخ کے مستحق ہیں۔ (اس پر قرآن و حدیث دونوں ناطق ہیں). چنانچہ اس موقع پر صرف ایک ایسی قرآنی آیت پیش کی جاتی ہے جس کی رُو سے نہ صرف جنّوں کے جنتی بھی ہونے کا ثبوت ملتا ہے بلکہ بطور اشارہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی رگوں میں بھی خون دوڑتا ہے، اور باہم مناکحت اور سلسلۂ توالد و تناسل بھی جاری ہے. چنانچہ سورۂ رحمان میں جنتی حوروں کے تذکرہ کے بعد حسب ذیل آیت کریمہ دو جگہ مکرّر لائی گئی ہے:

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ انھیں ان سے پہلے کسی انسان یا جن نے چھوا نہ ہوگا۔

اس موقع پر لفظ 'طمث' استعمال کیا گیا ہے، جس کے کئی معنی آتے ہیں:

(۱) حیض کا خون (۲) عورت کے ساتھ مباشرت کرنا (۳) حائضہ ہونا، امرأۃٌ طامث : حائضہ۔[۴]

فراء نے کہا ہے کہ طمث کے معنی اقتضاض کے ہیں، یعنی خون آلود مباشرت۔[۵]

سعید بن جبیرؒ اور عکرمہؒ سے منقول ہے کہ اس موقع پر طمث کے معنی مباشرت کے ہیں۔[۶]

حافظ ابن حجرؒ نے تصریح کی ہے کہ اس آیت سے جنات کی مناکحت (شادی بیاہ) پر استدلال کیا گیا ہے۔[۷]

یعنی جس طرح انسان مباشرت کرتے ہیں اسی طرح جنات بھی مباشرت کرتے ہیں۔[۸]

اور امام قرطبیؒ نے تحریر کیا ہے کہ اس آیت میں دلیل ہے اس بات کی کہ جنات بھی انسانوں ہی کی طرح مباشرت کرتے ہیں، جنت میں داخل ہوتے ہیں اور ان کو وہاں پر جنتی حوریں بھی ملتی ہیں۔[۹]

اب دیکھئے اس آیت کریمہ سے بطور اشارہ و استنباط کتنے حقائق ثابت ہوتے ہیں:

۱۔ جنات بھی انسانوں ہی کی طرح مباشرت کرتے ہیں۔
۲۔ جنات میں سلسلۂ نکاح و تناسل جاری ہے۔
۳۔ جنات میں بھی خون ہوتا ہے، کیونکہ ان کی عورتیں حائضہ ہوسکتی ہیں۔
۴۔ جنات جنتی بھی ہوتے ہیں۔
۵۔ جنات کو بھی حوریں ملتی ہیں۔
۶۔ اور ایک بہت بڑی حقیقت یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ جنوں اور انسانوں کی شکل و صورت میں کچھ نہ کچھ

[۴] مفردات القرآن از امام راغب، ص ۳۱۷، بیروت، نیز تفسیر قرطبی ۱۷/ ۱۸۱

[۵] لسان العرب ۲/ ۱۶۶ بیروت، نیز تفسیر قرطبی ۱۷/ ۱۸۱

[۶] تفسیر درمنثور از علامہ جلال الدین سیوطی ۶/ ۱۴۸، بیروت.

[۷] فتح الباری ۶/ ۳۴۵، مطبوعہ دار الافتاء ریاض

[۸] تفسیر کشاف ۴/ ۴۹، مطبوعہ طہران

[۹] تفسیر قرطبی ۱۷/ ۱۸۱

مشابہت ضرور پائی جاتی ہے (اگرچہ ان کے نوعی اختلافات کتنے ہی کیوں نہ ہوں)۔ کیونکہ دونوں کو مشترکہ طور پر "حوریں" عطا کئے جانے کا تذکرہ موجود ہے۔ واللہ اعلم۔

تو اس موقع پر سوال یہ ہے کہ کیا تبصرہ نگار ان تمام حقائق کو "غیر اسلامی" قرار دے کر رد کر دیں گے؟ عوامی تصورات اور قرآنی حقائق و استنباطات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ انسان جو بات اپنی سمائی میں نہ آئے اس کا بہت جلد انکار کر بیٹھتا ہے۔ قرآن کا سطحی مطالعہ کرنے والوں کو ظاہر ہے کہ اس قسم کے حقائق عجوبوں سے کم نہیں ہوتے! بہرحال قرآن حکیم حقائق و معارف سے بھرپور ایک حیرت انگیز کتاب ہے جو اس کائنات کے تمام اسرار جاننے والی ہستی کی جانب سے نازل شدہ ہے۔ اور اس میں جنات کے بارے میں اور بھی کئی ایسے حقائق مذکور ہیں جن پر شاید عام لوگ مشکل ہی سے یقین کریں۔ کیونکہ وہ اشاراتی زبان میں مذکور ہیں۔ اور ان میں موجودہ دور کے تعلق سے بڑی حکمت عملی پائی جاتی ہے۔ مگر کسی کی بے اعتباری و بے یقینی سے حقائق نہیں بدلتے۔

بعض صحیح حدیثوں کی رو سے جنات کی بنیادی طور پر تین قسمیں پائی جاتی ہیں جو یہ ہیں: (۱) ایک قسم وہ ہے جن کے پر ہوتے ہیں اور وہ ہوا میں اڑتی ہے۔ (۲) دوسری قسم سانپوں اور کتوں کی شکل کی ہوتی ہے۔ (۳) اور تیسری قسم وہ ہے جو ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف کوچ کرتی اور سفر کرتی رہتی ہے۔[۱۰]

امام حاکمؒ نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔ اور امام ذہبیؒ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔[۱۱]

بعض روایات میں آتا ہے کہ ایک قسم وہ ہے جس پر حساب کتاب ہوگا۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کو ابن ابی الدنیا سے نقل کرتے ہوئے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث حضرت ابو درداءؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔[۱۲]

امام قرطبیؒ نے ایک اور روایت نقل کی ہے جس کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ تیسری قسم: "بنی آدم کی طرح ہے جو جزا و سزا کی مستحق ہے"۔[۱۳]

جنات کی ایک قسم وہ تھی جس کا تذکرہ ابلیس کے تذکرہ کے ساتھ قصۂ آدم کے ضمن میں ملتا ہے اور اس سلسلے کے قرآنی اجمالات کی تشریح و تفسیر حدیثوں میں مذکور ہے۔ اور غالباً یہ قسم (یا ان کی کوئی ضمنی نوع) نیست و نابود ہو چکی ہے۔ جیسا کہ بعض روایات سے اس کا اشارہ ملتا ہے۔ ان کی دوسری قسم وہ ہے جو ہر دور میں پائی جا سکتی ہے، سانپوں کی شکل میں بھی اور غیر سانپوں کی شکل میں بھی۔ جیسا کہ متعدد صحیح ترین احادیث سے اس موضوع پر روشنی پڑتی ہے۔ اور خود قرآن بھی اس حقیقت پر دلیل ناطق ہے کہ دور رسالت میں جنوں کی ایک جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا اور وہ اس پر ایمان لے آئے (احقاف: ۲۹-۳۱)۔

---

[۱۰] مستدرک حاکم ۲/۴۵۶، مجمع الزوائد از نورالدین ہیثمیؒ ۸/۱۳۶ صحیح ابن حبان ۹/۱۰، کتاب الاسماء والصفات بیہقیؒ ۲/۱۳۰۔

[۱۱] مستدرک مع التلخیص للذہبی ۲/۴۵۶۔

[۱۲] فتح الباری ۶/۳۴۵۔

[۱۳] تفسیر قرطبی ۱/۳۱۸۔

چنانچہ قرآن میں ایک پوری سورت کا نام ہی "جنّ" ہے جس میں یہ تذکرہ بھی بالتفصیل موجود ہے۔ مگر ان کا انسانی آنکھوں کو نظر نہ آنا ضروری نہیں ہے۔ اور جنّوں کی تیسری قسم وہ ہے جو متعدد اجرام سماوی میں موجود ہے اور ان کا موجودہ خلائی دور سے بھی بہت گہرا تعلق ہے۔ اور یہ حقیقت سورۂ رحمان میں موجود و مذکور حقائق سے واضح ہوتی ہے، جس میں جنّوں اور انسانوں کو ۳۱ مرتبہ یکساں طور پر اس طرح مخاطب کیا گیا ہے گویا کہ یہ دونوں انواع سامنے موجود ہیں۔ اور اسی سورت کی آیت ۳۳ سے بطور اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ جنّات اجرام سماوی میں بھی رہتے ہیں اور غالباً ان سب کو تغلیباً "جن" کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ اس موضوع پر قدرے تفصیلی بحث میں نے اپنی کتاب "اسلام اور جدید سائنس" کے چوتھے باب "اجرام سماوی کا جغرافیہ" میں کی ہے، جو ۱۹۸۷ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اور اس مضمون میں جنات سے متعلق بعض دیگر حقائق بھی مذکور ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حدیث صحیح کی رو سے جنّات کی بنیادی طور پر جو تین قسمیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے ایک ہوا میں اڑنے والی اور دوسری ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے والی ہے۔ اس باب میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اڑنے والی نوع کا تعلق غالباً آسمانی خبریں لانے اور انھیں کاہنوں تک پہنچانے والی قسم سے ہوگا (جن: ۹)۔ اور یہ نافرمان جن ہوں گے جنھیں بعض دیگر مقامات پر شیاطین سے تعبیر کیا گیا ہے (حجر: ۱۸، صافات: ۱۰) گویا کہ ان دونوں میں ساز باز ہے[۱۴]۔

اور دور آدم میں پائی جانے والی نوع کا تعلق غالباً تیسری قسم سے ہوگا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ "آسمانی جنوں" ہی کی کوئی قسم ہو۔ واللہ اعلم۔ اس موضوع پر مزید غور و خوض کی ضرورت ہے۔ مگر کسی بھی حدیث میں یہ مذکور نہیں ہے کہ وہ انسانوں کو نظر نہیں آ سکتے۔ بلکہ جب وہ گوشت پوست کا مجموعہ ہیں، ہاتھ پاؤں رکھتے ہیں اور ان کی رگوں میں خون دوڑتا ہے تو پھر ان کا نظر آنا ممکن ہے۔ لہٰذا تبصرہ نگار نے یہ جو دعویٰ کر دیا ہے کہ "اور بہت سی احادیث بھی اس تصور کے خلاف جاتی ہیں" اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ کاش وہ بہت سی نہ سہی صرف دو چار ہی حدیثیں پیش کرتے! جب کہ بات واقعہ کے اعتبار سے اس کے برعکس ہے۔ یعنی متعدد حدیثوں سے جنوں کا آنکھوں کو نظر آنے کا ثبوت ملتا ہے، نہ کہ نہ نظر آنے کا۔ چنانچہ حدیث نبوی کی رو سے جنات کی ایک قسم سانپوں کی شکل میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور متعدد حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ سانپوں کی قسم کے جنات نہ صرف دور رسالت میں مدینہ منورہ میں پائے گئے ہیں بلکہ بعض صحابہ نے انھیں مارا بھی ہے۔ مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے جنوں کو جو گھروں میں بس گئے تھے مارنے سے منع کیا ہے۔ اس قسم کے جنوں کو "عوامر" کہا گیا ہے[۱۵]۔

تبصرہ نگار نے مصنف کو نصیحت کرنے کے انداز میں تحریر کیا ہے کہ اس نے گویا کہ اسلامی روایات اور عوامی نظریات کو خلط ملط کر دیا ہے۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ خود انھیں ان دونوں میں تمیز کرنے کا کوئی صحیح شعور نہیں ہے۔ راقم سطور نے اس سلسلے میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ٹھوس دلائل کی روشنی میں لکھا ہے نہ کہ اڑتی ہوئی

---

[۱۴] دیکھئے تفسیر قرطبی ۱۹/۲

[۱۵] بخاری کتاب بدء الخلق، ۴/۹۷ مطبوعہ استانبول، صحیح مسلم ۲/۱۷۵۲-۱۷۵۷، نیز دیکھئے فتح الباری ۶/۳۵۱

باتیں۔ بہر حال جنوں کا آنکھوں کو نظر نہ آنا کسی دلیل قطعی کی بنا پر نہیں بلکہ ایک عوامی نظریہ ہے۔ اور جس عوامی نظریہ کے قائل ہونے کا الزام تبصرہ نگار مصنف کو دے رہے ہیں اس میں وہ خود ہی بری طرح گرفتار ہیں۔
ہوسکتا ہے کہ بعض جن کسی وجہ سے عام آدمی کو نظر نہ آتے ہوں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کا تعلق "ہوائی جنوں" سے ہو۔ اور شاید وہ رقیق اجسام سے متصف ہوں۔ مگر یہ صرف ایک قیاس ہے کوئی قطعی ویقینی بات نہیں۔ مگر اسے ہر قسم کے جنات پر لاگو کرنا ایک دعویٰ بلا دلیل ہے۔ اس موضوع پر علماء کی بعض قیاس آرائیوں کے لئے دیکھئے فتح الباری۔[16]

چنانچہ ایک بحث میں حافظ ابن حجرؒ نے ایک شبہ کا جواب دیتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ جنات کی اصل آگ ہونے کے باوجود وہ حقیقتاً آگ کا مجموعہ نہیں ہوسکتے۔ جس طرح کہ خود انسان کی اصل مٹی ہونے کے باوجود وہ حقیقتاً مٹی نہیں ہے۔ اور پھر تحریر کیا ہے کہ حدیث صحیح کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک شیطان کو پکڑ لیا تھا تو اس کے لعاب کی ٹھنڈک آپ کے ہاتھ پر محسوس ہوئی۔[17]

بہر حال تبصرہ نگار کو معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن اور حدیث میں جو حقائق مذکور ہیں ان کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ جنات اپنا ایک ٹھوس وجود رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے میں قرآن میں چار جگہ جنوں کا تذکرہ آیا ہے کہ ان کے لشکر میں جن بھی شامل تھے (نمل: ۱۷) اور وہ ان کے لئے بڑے بڑے کام کیا کرتے تھے (سبا: ۱۲-۱۳) نیز یہ کہ وہ ان کے قیدی تھے (سبا: ۱۴) اور صحیح بخاری کی ایک حدیث کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایک دیو قامت جن (عفریت) کو پکڑ لیا تھا جو آپ کی نماز خراب کرنا چاہتا تھا۔[18]

ایک اور مرتبہ جنوں کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (ایک بیابان میں رات کے وقت) حاضر ہوا اور آپ سے قرآن سنا۔ دوسرے دن آپ نے صحابہ کرام کو وہ جگہ دکھائی اور ان کے نشانات نیز ان کی آگ کے نشانات بھی دکھائے۔ جنوں نے آپ سے زادراہ مانگا تو آپ نے فرمایا کہ تمھارے ہاتھ لگنے والی ہر وہ ہڈی جس پر اللہ کا نام لیا جائے وہ وافر مقدار میں گوشت بن جائے گی (تاکہ تم اسے کھا سکو) اور اسی طرح ہر مینگنی تمھارے جانوروں کے لئے چارہ ہوگی۔[19]

اس حدیث صحیح سے ثابت ہوتا ہے کہ جنوں کے ساتھ ان کے جانور بھی ہوتے ہیں اور وہ کھاتے پیتے بھی ہیں، جیسا کہ امام قرطبیؒ نے اس سے استدلال کیا ہے۔[20] اب ظاہر ہے کہ کھانے کے لئے نہ صرف ہاتھ اور منہ کی ضرورت پڑتی ہے بلکہ اس کے لئے ایک پورا نظام ہضم Digestive System بھی ضروری ہوتا ہے۔ گویا کہ ان کا پیٹ بھی ہوتا ہے اور آنتیں بھی، اور نظام ہضم کے دیگر اعضاء بھی ہوتے ہیں اور بول و براز کا نظام بھی۔

[16] فتح الباری از حافظ ابن حجر عسقلانی ۶/ ۳۴۳-۳۴۶، مطبوعہ ریاض
[17] ایضاً ۶/ ۳۴۵
[18] بخاری کتاب الانبیاء ۴/ ۱۳۶
[19] صحیح مسلم کتاب الصلاۃ ۱/ ۳۳۲، مطبوعہ ریاض۔
[20] دیکھئے تفسیر قرطبی

پھر اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم ان دو چیزوں سے استنجا مت کرو۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں تمھارے بھائیوں کا کھانا ہیں (حوالۂ مذکور)۔

اس موقع پر لفظ "اخوانکم" استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جنّ بھی مومن و مسلم ہوتے ہیں اور وہ بھی سزا و جزا کے مستحق ہیں۔ تبصرہ نگار کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ تمام حقائق صحیح ترین احادیث سے ثابت ہیں، نہ کہ ماقبل اسلام کے عرب معاشرے میں پائے جانے والے افسانے اور خرافات۔ اور اس قسم کے حقائق کا انکار وہی کر سکتا ہے جسے احادیث و آثار سے براہ راست کوئی واقفیت نہ ہو اور وہ صحیح اسلامی روایات اور افسانوں میں فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو۔

واضح رہے راقم سطور نے اپنی کتاب میں زمین پر جنّوں سے پہلے جنّ اور بنّ کے موجود ہونے کا جو نظریہ پیش کیا تھا وہ کوئی عوامی تصور نہیں بلکہ بہت سے مفسرین کا قول ہے۔ جیسا کہ مفسر ابن کثیر کے الفاظ ہیں: "قال کثیر من علماء التفسیر" لہذا مفسرین کے قول کو ایک "عوامی تصور" قرار دے کر اس کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ عوامی تصور تو یہ تھا کہ ہر قسم کے بھوت پریت کو بھی جنّ اور جنّ بدل دیا جاتا تھا (دیکھئے صفحہ ۶۹)۔ اس طرح عوامی تصور اور مفسرین کے نظریہ میں واضح اور بیّن فرق موجود ہے۔ اور مفسرین کے اس نظریہ کی موجودہ دور میں بڑی اہمیت ہے۔ مگر تبصرہ نگار نے ان دونوں میں فرق کئے بغیر ایک غلط اور بے حقیقت دعویٰ کر دیا ہے۔ اس تفصیل سے امید ہے کہ تبصرہ نگار کی غلط فہمی دور ہو گئی ہو گی۔

اس بحث کا خلاصہ یہ کہ مصنفِ کتاب نے مفسرین کے اقوال اور عوامی نظریات و تصورات کے درمیان فرق کیا ہے۔ بنصِ قرآن ثابت ہے کہ جنّات کی تخلیق حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے عمل میں آئی۔ اور بنصِ حدیث ثابت ہے کہ دورِ آدم سے پہلے زمین پر جنات آباد تھے جنھوں نے خون بہایا اور فساد برپا کیا۔ لہذا بطور قیاس ثابت ہوا کہ وہ گوشت پوست والی مخلوق تھی۔ ورنہ یہ بات قیاس میں آنے والی نہیں ہے کہ کسی مخلوق میں خون تو موجود ہو مگر وہ گوشت پوست سے خالی ہو۔ جیسا کہ یہ حقیقت سورۂ رحمان والی آیت سے بھی ثابت ہے۔ نیز بنصِ حدیث یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جنّ ایک کھانے پینے والی مخلوق ہے۔ یہ سب باتیں جنات کے بارے میں قرآن و حدیث کے نصوص سے ثابت ہیں۔ ہاں البتہ "جنّ" اور "بنّ" کے بارے میں یقینی بات تو کہنی مشکل ہے مگر اس سلسلے میں مروی روایات سے ایک گمان غالب حاصل ہوتا ہے کہ غالباً اس قسم کی کسی مخلوق کا وجود رہا ہو گا۔ مگر یہ کوئی "عوامی تصور" نہیں ہے۔ اور جن لوگوں کو اس قسم کا کوئی دعویٰ ہو تو انھیں چاہئے کہ وہ عربی ادب و لٹریچر سے اس کا ثبوت پیش کریں۔

یہ اصول بالکل صحیح ہے کہ "ہر وہ بات جو ایک مسلمان عالم کہے عین اسلام نہیں ہے" مگر اس کے ساتھ یہ اصول بھی صحیح ہے کہ ہر وہ بات جو ایک مسلمان عالم کہے وہ خلاف اسلام بھی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس سلسلے میں قرآن اور حدیث کے بیانات اور ان کے اصول و مبادی ہی کی روشنی میں کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جہاں تک اصولیات و مبادیات کا تعلق ہے وہ قرآن و حدیث میں بنیادی حقائق کے روپ میں موجود ہیں۔ اور جہاں تک ضمنی امور کا تعلق ہے وہ علمائے اسلام کی تشریحات و استنباطات سے حاصل ہوتے ہیں۔

قرآن اور حدیث ہی ہمارے لئے اصل سرچشمہ ہیں اور علمائے اسلام کی حیثیت ضمنی ہے۔ مگر علمائے اسلام کے ان تمام استنباطات کو جو قرآن اور حدیث سے براہ راست ماخوذ ہیں، معاصر و ماقبل عرب معاشرے میں پائے جانے والے عقائد وتصورات کا عکس کہتے ہوئے انھیں غیر اسلامی قرار دینا ایک بہت بڑی جسارت ہی نہیں بلکہ ایک خطرناک قسم کی تشکیک پیدا کرنا ہے۔ کیونکہ اس سے احادیث و آثار پر بے اعتباری کا دروازہ کھلتا ہے۔

بہر حال اس بحث سے یہ حقیقت پوری طرح روشنی میں آگئی کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے زمین پر جنات کا وجود کوئی عوامی تصور یا افسانہ نہیں بلکہ ایک اسلامی تصور ہے جو قرآنی اشارے اور حدیث نبوی کی صراحت کی رو سے پوری طرح ثابت ہے اور صحابہ و تابعین سے مروی روایات اور مفسرین کے اقوال سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ پچھلے صفحات میں مستدرک حاکم کی جو حدیث پیش کی گئی ہے اس میں اور دیگر روایات میں مذکور ہے کہ جب جنوں نے زمین میں فساد برپا کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکوبی کے لئے فرشتوں کی فوجیں بھیجیں، جنھوں نے ان کو مار مار کر سمندری جزیروں میں پہنچا دیا۔[۲۱]

اور جدید تحقیقات کی رو سے نینڈرتھل اور کرومیگنن نسل اُحفوری ریکارڈ سے اچانک غائب ہو چکی ہے، جو دنیائے سائنس کے لئے ایک معمہ ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۹۱ تا ۹۴۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ نینڈرتھل یا کرومیگنن نسل ہی جن ہو اور اس سے ماقبل کی انواع جن اور بن رہی ہوں واللہ اعلم۔ بہر حال اس سلسلے میں مزید تحقیقات کا انتظار کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب قیاسات ہیں اور کسی قطعی دلیل کے بغیر نہ تو ان قیاسات کو یقین کامل کا درجہ دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی انھیں یکسر رد کیا جا سکتا ہے۔

مگر اس بحث سے اتنا تو صاف ہو گیا کہ اسلامی عقائد ہی نہیں، جو منصوص طور پر ثابت ہو رہے ہوں، بلکہ اس کے اشارات وکنایات کی بھی بہت بڑی قدر و قیمت ہے، جو تحقیقاتِ جدیدہ کی روشنی میں نکھر نکھر کر سامنے آ رہی ہے۔ مگر ان حقائق کو مستنبط کرنے کے لئے بڑی دماغ سوزی، بیدار مغزی اور پتہ ماری کی ضرورت ہے۔ ورنہ عوام تو عوام خود سطحی نظر رکھنے والے "اہل علم" تک انھیں خرافات کا ایک طومار ہی قرار دیں گے۔ واللہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم۔

آخر میں عرض ہے کہ چونکہ موجودہ "احفوری آثار" اور خلائی دور سے جنات کا بھی گہرا تعلق ہے اور مستقبل میں قرآن عظیم کے بہت سے اسرار و حقائق منظر عام پر آنے والے ہیں، اس لئے قرآن میں اس مخلوق کے بارے میں بجائے صراحت کے گول مول قسم کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اور اس اختصار کے دو مقاصد ہیں: اول یہ کہ اگر اس مخلوق کے تعلق سے ہر بات صراحتاً بیان کر دی جاتی تو اب سے چودہ سو سال پہلے کے لوگوں کو ان پر یقین کرنا آسان نہ ہوتا، بلکہ ممکن تھا کہ وہ انھیں جھٹلا بیٹھتے۔ لہٰذا انھیں "متشابہات" کا رنگ دے دیا گیا (ملاحظہ ہو کتاب ہذا، ص ۷۷-۷۹)۔

اور دوسرا مقصد یہ کہ خدائے علیم و خبیر کی نظر میں سائنسی علوم و فنون کی ترقی کے بعد ایک ایسا بھی دور آنے والا تھا جس میں ان گول مول الفاظ یا اشارات وکنایات کا حقیقی مفہوم واضح ہوتا اور اس سے قرآن عظیم

---

[۲۱] مستدرک حاکم: ۲/ ۲۶۱، مطبوعہ بیروت

کی صداقت وحقانیت ظاہر ہوتی۔ کیونکہ یہ کلام برتر ایک ایسی ہمہ داں وہمہ بین ہستی کی جانب سے نازل شدہ ہے جو اس عالم رنگ وبو کی ایک ایک چیز اور اس کے ایک ایک نقش ونگار کی خبر رکھتا ہے اور کائنات کے ذرہ ذرہ سے بخوبی واقف ہے۔ اسی لئے ارشاد ہے:

وَاِنَّکَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ اور تم یہ قرآن ایک حکمت والے اور ہمہ داں ہستی کی جانب سے پارہے ہو (نمل: ۶)۔

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِىْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہہ دو کہ اس کتاب کو اُس (ہمہ داں) ہستی نے اتارا ہے جو ارض وسماوات کے (تمام) بھیدوں کو جانتا ہے (فرقان: ۶)۔

اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِىْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ کیا اللہ سینۂ کائنات میں (ودیعت شدہ بھیدوں) کا سب سے بڑا واقف کار نہیں ہے؟ (عنکبوت: ۱۰)۔

اس موقع پر اتنی ہی وضاحت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ انشاءاللہ اس موضوع پر ایک مفصل کتاب بہت جلد پیش کی جائے گی، جو قرآن اور حدیث کے بہت سے اسرار ومعارف کی نقاب کشائی کرنے والی ہوگی۔ اور اس میں جنّوں سے متعلق تمام قرآنی آیات کو جمع کرکے احادیث وآثار کی روشنی میں ان کی تشریح وتفسیر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(محمد شہاب الدین ندوی)